جلد ۴ — عدد ۱، ۲

فروری ۱۹۴۱ء

۷۸۶

منافقین نمبر

ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کے افکار، عقائد اور پیغام کا علمبردار

مرتبہ

سیّد محمد شاہ ایم۔ اے

و

غلام سرور فگار

ظفر منزل، تاجپورہ لاہور

سالانہ قیمت

م سے دو روپے بارہ آنے

رڈ ساڑھے پانچ روپے

فہرست مضامین

جلد ۴	جنوری و فروری ۱۹۴۱ء	عدد ۱ و ۲

سید محمد شاہ ایم۔ اے پرنٹر پبلشر کے اہتمام سے دین محمدی الیکٹرک پریس لاہور میں طبع

ہو کر دفتر رسالہ "پیغام حق" ظفر منزل تاج پورہ لاہور سے شائع ہوا +

سخنہائے گفتنی

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن اقبالؒ

اس مہینے کا پیغام حق مولوی صدالدین اصلاحی کے مضمون "حقیقتِ نفاق" پر مشتمل ہے، یہ طویل مضمون رسالہ ترجمان القرآن میں بالاقساط شائع ہوتا رہا ہے، دورِ حاضر کے مسلمانوں کی مذہبی اقتصادی معاشرتی اور سیاسی قلابازیوں کے پیشِ نظر اس مضمون کو جتنی اہمیت دی جائے کم ہے یہی وجہ ہے کہ اسے یکجائی طور پر "پیغام حق" کی ایک ہی اشاعت میں شائع کیا جاتا ہے۔ تاکہ ہر مسلمان اس آئینہ میں اپنا منہ دیکھ سکے اور اپنے خط و خال کی بے ربطی سے اس کا اندازہ کر لے کہ اُس کا شمار منافقین کے کس زمرہ میں ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم سید ابوالاعلیٰ مودودی کے بے حد ممنون ہیں جنہوں نے اس کی اشاعت کی اجازت مرحمت فرما کر عام مسلمانوں کو اس سے مستفید ہونے کا موقعہ دیا۔

اس مضمون میں منافقین کی ستر اقسام گنائی گئی ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسلام کی محارب اور بدخواہ قوتوں کو مسلمانوں کے مقابل امداد دینا یا امداد کا وعدہ کرنا چنانچہ اقبالؒ نے اپنے زندۂ جاوید شہکار "جاوید نامہ" میں منافقین کی اس خصوصیت کو یہاں تک اہمیت دی ہے کہ ایسے منافق کو دوزخ کی آگ بھی قبول نہیں کرتی۔ جب وہ مولینا رومؒ کی رہنمائی میں فلک زحل میں پہونچتے ہیں تو

اُسے ایسی ارواح رذیلہ کا مسکن پاتے ہیں جنہوں نے ملک اور ملت سے غداری کی ہو اور منافقت سے کام لیا ہو۔ اس مقام کو اقبالؒ "منزلِ ارواح بے یوم النشور" قرار دیتے ہیں اور اُس کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں کہ ایک قلزمِ خونین ہے جس کو چاروں طرف سے ایک طوفان محیط ہے اُس کی فضا میں سانپ اس طرح محوِ پرواز ہیں جس طرح سمندر میں مگرمچھ، موجیں ہیں کہ شیر کی طرح خونخوار جن کے خوف سے مگرمچھ ساحل پر ہی جان دے دیتے ہیں یہ ایک ایسا سمندر ہے جس کے تھپیڑوں سے ساحل بھی پناہ مانگ رہا ہے اور خون کی موجیں آپس میں برسرِ پیکار ہیں۔ ان خونین موجوں کے بھنور میں ایک کشتی پھنسی ہوئی ہے جس میں دو مرد بیٹھے ہوئے ہیں اُن کے چہرے زرد ہیں، بدن عریاں اور بال بکھرے ہوئے یہ دو آدمی کون ہیں؟ ایک جعفر بنگالی ہے جس نے نواب سراج الدولہ سے غداری کی اور دوسرا صادق دکنی جس نے سلطان ٹیپو شہید سے منافقت برتی۔

اقبالؒ اس منظر کو دیکھ رہے تھے کہ آسمان شق ہو گیا اور ہندوستان کی روح ایک پاک نژاد حور کی شکل میں نمودار ہوئی اور اُس نے نالہ و فریاد کرنا شروع کی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی غلامی کا باعث یہی دو شخص ہوئے ہیں جنہوں نے دو اسلامی سلطنتوں کو اپنی اغراض کی بھینٹ چڑھا دیا تھا اور اب ہندوستان کی قسمت میں اس وقت تک غلامی باقی ہے جب تک جعفر اور صادق جیسے منافقین اسلام اُس میں پیدا ہوتے رہیں گے۔ یہ جعفر اور صادق ہر زمانے میں کس طرح عالمِ وجود میں آتے رہتے ہیں اقبالؒ اس حقیقت کو روحِ ہندوستان کی زبان سے اس طرح ادا کرتا ہے ؎

گے شبِ ہندوستاں آید بروز	مُرد جعفر، زندہ روحِ اُو ہنوز
تا ز قیدِ یک بدن وا مے رہد	آشیاں اندر تنِ دیگر نہد
گاہ اورا با کلیسا ساز باز	گاہ پیشِ دیریاں اندر نیاز
دینِ اُو، آئینِ اُو سوداگری است	عنتری اندر لباسِ حیدری است

تا جہانِ رنگ و بُو گردد دگر　　　رسم و آئینِ او گردد دگر

پیشِ ازیں چیزے دگر مسجودِ او　　　در زمانِ ما وطن معبودِ او

ظاہرِ او از غمِ دیں دردمند　　　باطنش چوں دیریاں زنّار بند

جعفر اندر ہر بدن ملّت کش است　　　ایں مسلمانِ کہن ملّت کش است

خند خنداں است و باکس یار نیست　　　مار اگر خنداں شود جز مار نیست

از نفاقش وحدتِ قومے دونیم　　　ملّتِ او از وجودِ او سقیم

ملّتے را ہر کجا غارت گرے است　　　اصلِ او از صادقے یا جعفرے است

الاماں از روحِ جعفر الاماں

الاماں از جعفرانِ ایں زماں

اقبالؒ نے روحِ ہندوستان کی زبانی ان شعار کے ذریعہ اُن تمام حقائق کو مجملاً بیان کردیا ہے جو "حقیقت نفاق" کے مضمون میں تفصیلاً موجود ہیں۔ روحِ نفاق کے متعلق انہوں نے یہ بتایا ہے کہ یہ ہر زمانہ میں موجود رہتی ہے اگر ایک جعفر مر جاتا ہے تو یہ دوسرے جعفر کو پیدا کرلیتی ہے اور منافقت کے جو رنگ برنگ لباس یہ اختیار کرتی ہے وہ مذہبی نفاق، معاشرتی نفاق، اقتصادی نفاق اور سیاسی نفاق کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ باوجود اسلام کے ساتھ نسبت رکھنے کے وہ اہل کلیسا کے ساتھ اس لئے ساز باز کرتی ہے اور دیریوں کے آگے اپنا سرِ نیاز جھکا دیتی ہے کہ اُس کے ذاتی مفاد اُس کو مجبور کرتے ہیں خواہ اُن کا تعلق طلبِ زر سے ہو یا جاہ طلبی سے۔ اپنے اِس مفاد کے حصول کی خاطر اپنے دین کو فروخت کرنے میں بھی اُسے کوئی باک نہیں ہوتا۔ اس سے پہلے منافقت کی صورتیں اور تھیں لیکن موجودہ زمانہ میں منافقت کی جملہ صورتیں وطنیت کے بت کے گرد جمع ہو کر رہ گئی ہیں اور مسلمانوں کے وجود میں اس نوعیت کی روحِ نفاق پھونک دی گئی ہے کہ وہ اپنے آپ کو

پہلے ہندوستانی اور اس کے بعد مسلمان ظاہر کر رہے ہیں۔ اسلام اور اس کی تعلیمات سے اُن کو یہاں تک بُعد ہو گیا ہے کہ مسلمان کہلاتے ہوئے کبھی آزاد خیالوں کی جماعت ...... میں اپنے لئے سرمایۂ حیات تلاش کرتے ہیں، کبھی بہائیوں ...... کے حلقۂ درس میں زانو تہ کرتے ہیں اور کبھی تھیوسوفیکل سوسائٹی ...... میں جا کر اپنے افکار کو ملا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ الغرض ہر خیال کی محفل میں مسکراتے ہوئے جا داخل ہوتے ہیں۔ دراصل یہی وہ نام نہاد مسلمان ہیں جن کے منافقانہ رویّہ سے مسلمانوں کی جمعیّت کو نقصانِ عظیم پہونچ رہا ہے اس لیے اقبالؒ تاکید کرتے ہیں کہ ان سے پرہیز کرنی چاہیے۔

روحِ ہندوستان کے نالہ و فریاد کرنے کے بعد اُس کشتی کے ساکنین جعفر اور صادق میں سے ایک نے اس حقیقت کو اپنی زبان سے بیان کرنا شروع کیا کہ ہم ایسے منافقوں اور غداروں کو دوزخ بھی قبول نہیں کرتا اور موت بھی ہماری جان کو حفاظت اور آسائش میں رکھنا پسند نہیں کرتی چنانچہ دنیا کو چھوڑ کر جب ہم دوزخ کے دروازہ پر انتہائی رنج و کرب کی حالت میں پہنچے تو

یک شرر بر صادق و جعفر نزد | بر سرا مشتِ خاکستر نزد
گفت دوزخ را خس و خاشاک بہ | شعلۂ من زیں دو کافر پاک بہ

یعنی دوزخ نے بھی اپنی آگ کو ایسے منافقوں اور غداروں سے ناپاک نہ کرنا چاہا رہی جان جس کی حفاظت و آسائش کا فرض موت کے ذمہ ہے اس نے صاف صاف کہدیا۔

ایں چنیں کارے نمی آید ز مرگ | جانِ غدارے نیا سائد ز مرگ

اقبالؒ نے جو تصریحات اپنے اس بیان میں کی ہیں اُن سے ظاہر ہے کہ غداروں اور منافقوں

کے لیئے کتنا دردناک عذاب ہے یہاں تک کہ اُن کی روحوں کے لئے یوم نشور بھی نہیں ہوگا۔
ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت آج کل ناگفتہ بہ ہے، اور اس کی زیادہ تر وجہ یہی نفاق ہے اس لیئے ہمیں اُمید ہے کہ اس مضمون کو افادہ کی نظر سے پڑھا جائیگا۔ اور اِصلاح نفس کی جانب اولیں فرصت میں توجہ کی جائے گی۔

بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر جنوری کے پرچے کی اشاعت میں تاخیر ہوتی گئی چونکہ اب فروری کا مہینہ شروع ہوگیا ہے اس لئے یہ مناسب سمجھا گیا ہے کہ دونوں مہینوں کے پرچوں کو اکٹھا شائع کر دیا جائے تا کہ آئندہ کے لئے پرچے کی اشاعت باقاعدہ ہو جائے اب مارچ سے پرچہ ہر مہینے کی یکم تاریخ کو شائع کیا جائے گا
"اقبال نمبر" کے متعلق یہ طے کیا گیا ہے کہ بجائے مارچ کے اپریل کے مہینہ میں اس کو شائع کیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ۲۱ اپریل کو علامہ اقبالؒ کی رحلت کا دن ہے اس مناسبت سے ہمارے خیال میں یہ بہت موزوں موقعہ ہوگا۔
معزز مقالہ نگاروں کی خدمت میں یہ التماس ہے کہ وہ ۱۰ مارچ تک اپنے اپنے مقالے بھیج دیں ہم اُن اصحاب کے بے حد ممنون ہیں جنہوں نے ہمارے گزشتہ اعلان کے مطابق اپنے مقالے لکھ کر روانہ کر دیئے ہیں۔ قارئین کرام کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہماری یہ دلی خواہش ہے کہ ہم اس اقبال نمبر کو تمام گزشتہ اقبال نمبروں سے بہتر بنا کر اربابِ ذوق کے سامنے پیش کریں چنانچہ ہندوستان کے جن ادیبوں اور مقالہ نگاروں سے ہم مضامین حاصل کر رہے ہیں انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اقبالؒ کی صحبت سے فیضیاب ہونے میں صرف کیا ہے اور خود بھی بڑی دقتِ نظری کے ساتھ اُن کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے اس وقت تک جو مقالے موصول ہو چکے ہیں اُن کی اہمیت کا اندازہ قارئین کرام کو مطالعہ کرنے کے بعد ہوگا۔
پروفیسر یوسف سلیم چشتی بی۔ اے کی تصنیف "تعلیمات اقبال" طبع ہو کر آگئی ہے۔ شائقینِ اقبال اس کو ہاتھوں ہاتھ خرید رہے ہیں "شرح اسرار خودی" بھی مطبع میں چلی گئی ہے جو ہفتہ عشرہ تک طبع ہو جائے گی اس لئے اہل ذوق کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے آرڈر پہلے ہی رجسٹر میں درج کرالیں تاکہ جونہی کتاب طبع ہو کر آئے فوراً بھیجی جاسکے۔
(نگار)

حقیقتِ نفاق

منافقین کی صفات

(از جناب مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی)

اسلام کے مقابلہ میں دو طاقتیں ہمیشہ سے نبرد آزما چلی آرہی ہیں۔ ایک کفر اور دوسری نفاق۔ تاریخ اسلامی کے ابتدائی صفحات ہمیں بتلاتے ہیں کہ اسلام کی راہ میں جتنی مشکلات کفار نے پیدا کیں وہ ان ہولناکیوں کی بہ نسبت کہیں کم اور بے ضرر تھیں جو منافقین کی بدولت پیش آئے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کفار کی بھی اکثر معاندانہ کارروائیاں انہیں منافقین کی خفیہ ریشہ دوانیوں کی رہینِ منت ہوا کرتی تھیں۔ بارہا انہوں نے مشرکین کو لڑائی پر ابھارا، غزوات میں مسلمانوں کو اپنی نفس پرستیوں سے نقصان پہنچایا، رسول اللہ صلعم اور صحابہ کرام کی توہین و تذلیل کی، وطن اور حسب و نسب کے جھگڑے برپا کر کے مسلمانوں کی جمعیت پراگندہ کرنے کی کوششیں کیں، تقسیم غنائم کے مواقع پر کمزور ایمان رکھنے والوں کو رسول اللہ سے بدظن کیا، اسلامی نظام کے تندرست پیکر میں طرح طرح کے وبائی جراثیم داخل کرنے کی سعی کی۔ غرض ضرر رسانی کے جتنے طریقے ممکن ہو سکتے تھے ان میں سے کسی کو بھی فتنہ و شیطنت کے ان علمبرداروں نے باقی نہ اٹھا رکھا۔ کفر تو اسلام کے مقابلہ میں بے نقاب آتا ہے۔ ڈنکے کی چوٹ، اپنی عداوت کا اعلان کر کے کھلے میدان میں دعوت پیکار دیتا ہے۔ لیکن نفاق پیشانی پر دوستی و رفاقت کا لیبل لگا کر اسلام کے گھر میں بیٹھ کر اصد ہا طریقوں سے اس کی بیخ کنی کرتا ہے اور اس انداز میں کہ نگاہِ ظاہر بین کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ پھر غور فرمائیے کہ کفر کے مقابلہ میں نفاق کی خطرناکیاں کتنی زیادہ کتنی بے پناہ اور کیسی کارگر ہوں گی۔ دن کی روشنی میں زمین پر پڑے ہوئے بڑے سے بڑے اژدھے کو مار ڈالنا کچھ مشکل نہیں لیکن جو

ناگن آستین میں چھپی بیٹھی ہو اس کے زہر سے بچنا مشکل ہی نہیں تقریباً ناممکن ہے۔

خیر و شر کی کشمکش آج بھی اسی طرح جاری ہے جس طرح ابتدائے اسلام میں تھی اور آج بھی حق کے مقابلہ میں وہی دونوں طاقتیں مصروف جنگ ہیں جو بدر و اُحد کے میدانوں اور مدینہ کی گلیوں میں تھیں۔ وہی شرار بولہبی ہے اور وہی فتنۂ "عبداللہی"۔ اگر چالیس کروڑ مردم شماری کے مسلمانوں کے خلاف اقصائے عالم میں تقریباً پونے دو ارب "ابولہب" پھیلے ہوئے ہیں تو خود ان چالیس کروڑ کے اندر بھی بے شمار "عبداللہ ابن اُبی" موجود ہیں، اور دونوں اپنے اپنے طور پر قرآن اور اسلام کی جڑ کھودنے میں منہمک ہیں پس جس طرح اسلام کی مدافعت اور خدمت میں اس کے حقیقی پیروؤں کے لئے کفر کے اس شرار کو بجھانا ضروری ہے اسی طرح نفاق کے اس فتنہ کا سر کچلنا بھی ناگزیر ہے، بلکہ اپنی اہمیت کے لحاظ سے یہ کارِ خدمت اوّلین توجہ کا مستحق ہے۔

کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ایک زمانہ میں تو چند ہزار اسلامی سپاہیوں کی ایک چھوٹی سی نہتی جماعت روم و ایران کی شوکتوں کو پاش پاش کرنے کے بعد بھی اپنے حوصلوں میں کوئی سستی اور اپنے جسموں میں کوئی تھکن نہ محسوس کرے، اور دوسرے زمانہ میں اسی اسلام کے نام لیوا اور اسی قرآن کے اتباع کا دعویٰ کرنے والے کروڑہا افراد اللہ کے باغیوں کے پنجۂ استبداد میں جکڑے پڑے ہوں، اور اس دنیا کے بسنے والوں کے لیے اسلامی نظام جماعت و خلافت کا تصور تک عنقا ہو جائے اور خود مسلمانوں کو اس نظام کا نام لینے سے پہلے گھر کے دروازے بند کر لینے کی ضرورت محسوس ہونے لگے! آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا حق کی فطرت بدل گئی ہے؟ کیا خدا کا قانون الٹ گیا ہے؟ کیا اس انقلاب حال کی وجہ یہ ہے کہ فطرۃ اللہ پہلے اسلام کے غلبہ کی مقتضی تھی اور اب کفر کے غلبہ کی مقتضی ہو گئی ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یہ حقیقت مسلّم ہے کہ فطرۃ اللہ کبھی نہیں بدلتی تو ماننا پڑے گا کہ تغیر دراصل اسلام کی فطرت میں نہیں بلکہ خود مسلمانوں کے نفس میں ہوا ہے۔ چالیس کروڑ کے عظیم الشان عدد سے دھوکا نہ کھائیے۔ اس تعداد میں حقیقی مسلمان کم اور منافق زیادہ ہیں، اور منافقین کی کثرت نے حقیقی مسلمانوں کی ایمانی طاقت کو بے اثر بنا دیا ہے۔ اس قسم

کی کثرت تعداد اسلام کے لیے وجہ مسرت نہیں باعث اذیت ہے یہ دراصل کماس ہے جو اسلام کے جسم کو لاحق ہو گیا ہے اور اس کے اندر کی رہی سہی واقعی توانائی اور انرجی کو بھی بروئے کار نہیں آنے دیتا۔ جب وہ حرکت کرنا چاہتا ہے تو یہ کماس اس کا پاؤں پکڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ پس آنکھیں چرانے کا وقت نہیں مصلحت کوشی اور مداہنت پر ہزار بار لعنت ہو کفر پر ہاتھ اٹھانے سے پہلے خود اپنے جسم کے اس زہریلے کماس پر نشتر چلانے کی ضرورت ہے پروانہ کرنی چاہیئے اگر اس عمل جراحی سے اس موٹے جسم کا خون کثیر مقدار میں نکل جائے۔ اگر ان چالیس کروڑ قطرہ ہائے خون میں سے تین سو تیرہ صالح قطرے بھی باقی بچ جائیں تو غم کیوں ہو؟ وہ تو اسلام کی عین صحت اور طاقت کا وقت ہو گا۔ لیکن اگر کوئی اس تجویز پر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار نہیں تو پھر اسلام کی خدمت کے لیے جو رہ بھی چاہے اختیار کرے ناکامی اور محرومی کے ماسوا کچھ نہیں ہاتھ آنے کا۔ سورۂ نساء کے مطالب پر غور کیجئے وہاں یہ حقیقت معلوم ہو گی کہ سچے مومنوں کو جھوٹے مدعیوں سے چھانٹ کر الگ کرنا اسلامی جماعت کی تنظیم کے لیے کس قدر اہم ہے۔ اسے ترک کر کے اسلام کی بھلائی کا کوئی کام نہ اب تک ہو سکا ہے اور نہ اب ہو سکتا ہے۔

لیکن اسے مخالف اسلام طاقتوں کی خوش قسمتی کہیے یا اسلام کی بدقسمتی کہ اب حالات جس قدر ان کے حق میں سازگار ہیں پہلے نہ تھے۔ اور ساری باتوں کو تو چھوڑیے، سب سے بڑا سوال تو یہ ہے کہ ابولہب اور ابوجہل تو اپنا نام خود بتا دیتے ہیں اور ہم انہیں پہچان کر ان کے مکائد سے بآسانی بچ سکتے ہیں، مگر یہ عبداللہ بن اُبی اور عبداللہ بن سبا جو ہماری جماعت میں ایک دو نہیں لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں، ان کا پتہ ہم کس طرح چلائیں؟ ان کے نام بھی مسلمانوں کے سے ہیں، ان کی زبانوں سے اسلامی مفاد کے نعرے اور اسلامی درد کے نالے بھی سننے میں آتے ہیں، حتیٰ کہ بسا اوقات یہ ہاتھوں میں تسبیحیں اور بغل میں مصلے بھی لیے ہوتے ہیں۔ اب کہاں وہ نگہ نبوت کی معصوم بصیرت ہے جو ان مسلمانیت کا سوانگ بھرنے والوں کی پس پردہ ذہنیتوں کو پڑھ کر ہمیں ان کے شر سے آگاہ کرے گی؟ اور کہاں وہ

پیام رسانی بلاغ امین ہے جو ہر موقع پر اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ کہہ کر ان بلند بانگ دعاوی کے فریب سے متنبہ کر دے گی، بالخصوص جبکہ ہر شعبۂ زندگی پر یہ لوگ اکابرا ور زعمائے ملت بن کر چھائے ہوئے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ ان دشواریوں کے پیش نظر نظری حیثیت سے بھی مومن و منافق کی تمیز اور تمحیص بہت ہی مشکل اور دشوار طلب ہے، مگر بحمداللہ کہ ناممکن اور محال ہرگز نہیں ہے۔ قرآنِ حکیم اگر رب العالمین کا نازل کردہ ہے اور دنیا کی آخری زندگی تک کے لیے قولِ فیصل اور فرقان بن کر آیا ہے تو یقیناً اس کی قدر و حیثیت کا تقاضا ہے کہ اس حیرانی اور دشواری کے وقت بھی وہ ہماری رہبری کرے اور اس کی آیات ایک ایک منافق کی طرف انگلی اٹھا کر بتلا دیں کہ یہ آسمانی بادشاہت کا مفسد باغی جا رہا ہے اس کی فتنہ پردازیوں سے بچتے رہو۔ چنانچہ جب ہم اس غرض سے قرآن پر نگاہ ڈالتے ہیں تو معاً نفاق کی پوری اور بے آمیز تصویر وہ ہمارے سامنے کر دیتا ہے اور منافق کی شکل کو اس کے ایک ایک خط و خال کے ساتھ ہم اس طرح دیکھ لیتے ہیں جس طرح دن کی روشنی میں سورج کو۔ لہٰذا مناسب اور ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام تصریحات کو مرتب کر دیا جائے جو قرآن نے وقتاً فوقتاً احوال و صفاتِ منافقین کے متعلق ہمیں دی ہیں تاکہ ہر شخص کے ہاتھوں میں ایک مکمل اور شفاف آئینہ پہنچ جائے جس میں وہ منافقینِ اُمت کی حقیقی تصویر کا عکس دیکھ لے۔ پھر ہم منافقین کے بارے میں قرآن کا حکم بھی بیان کریں گے تاکہ ہر مسلمان خود فیصلہ کرے کہ ان لوگوں کے ساتھ اسے کونسا سلوک کرنا چاہیے۔ اور اسلامی نقطۂ نظر سے ان کے ساتھ اس کے اخلاقی، تمدنی، معاشرتی اور سیاسی تعلق کی نوعیت کیا ہونی چاہیے۔

نفاق کی حقیقت

بعض اہل علم کا خیال ہے کہ عہدِ نبوت کے بعد دنیا میں منافقین کا وجود نہیں رہا۔ اب یا تو کوئی شخص کافر ہو سکتا ہے یا مسلمان۔ کسی کے منافق ہونے کا نہ اب کوئی موقع ہے اور نہ ضرورت و علت۔ کیونکہ منافق صرف اس وقت ہوا کرتے تھے جب اسلام دنیوی اسباب کے لحاظ سے ناتواں اور کمزور تھا۔ اور اس کے مقابلہ میں کفر کی مادی ہیبت چہار دانگ عالم پر چھائی ہوئی تھی جو ہر لمحہ اسلام اور متبعین اسلام کو مصائب کے طوفان میں گھیر تک

دینے کی تیاریاں کیا کرتی تھی۔ اس وقت مسلمان ہونا گویا موت سے چشمک زنی کرنا اور دردناک تکلیفوں کو دعوت دینا تھا۔ اس لیے جو لوگ ان مصائب کو جھیلنے اور عیش دنیا کی قربانیاں دینے کی اپنے اندر سکت نہ پاتے تھے وہ زبان سے آمنا وصدقنا کہا کرتے تھے اور نبی کی صحبتوں میں اور خود اپنے دل کے اندر کفر کے حامی و پرستار تھے، تاکہ مسلمانوں کے خوف سے بھی مامون رہیں اور کفار کے خوف سے بھی۔ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّاۡمَنُوۡکُمۡ وَیَاۡمَنُوۡا قَوۡمَهُمۡ۔ لیکن جب حالات منقلب ہو چکے، اسلام کی مغلوبیت اور کمزوری، طاقت وغلبہ سے بدل چکی، اور کفار کے ان خطرات کا اندیشہ نہ رہا جو اسلام کے دورِ مظلومیت میں تھا تو پھر کوئی منافقت اختیار کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کرنے لگا ہ اگر وہ قرآن کو حق تصور کرتا ہے تو کھلے بندوں اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرے گا۔ اور اگر وہ اس پر ایمان نہیں رکھتا تو پھر زبان سے آمنا کہنے کی نہ کوئی مصلحت ہے نہ ضرورت۔

یہ شبہ دراصل لفظ نفاق اور منافق کی حقیقت، اس کے محرکات، اس کے مصالح اور اس کے مظاہر پر پوری وسعت اور سنجیدگی سے غور نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ اگر مذکورۂ بالا دلیل بغیر ردّ وقدح کے تسلیم بھی کر لی جائے تب بھی اس سے زیادہ سے زیادہ یہ لازم آتا ہے کہ منافق کی یہ خاص قسم اب نہیں پائی جا سکتی یعنی اس خاص مقصد اور مصلحت کی بنا پر اب کوئی شخص منافقت نہیں اختیار کر سکتا اس سے یہ کسی طرح ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ اب نفاق کسی شکل میں موجود ہی نہیں رہا۔ منافق کی اگر ایک قسم اور منافقت کی اگر ایک علت نہیں رہی، تو اس کے سوا بہت سی دوسری اقسام اور علل اب بھی موجود ہیں جو ملت اسلام کی تباہی و بربادی کا کام نہایت ہوشیاری اور کامیابی سے سرانجام دے رہی ہیں۔ شیطان کے سینکڑوں ہاتھوں میں سے ایک ہاتھ اگر ٹوٹ جائے تو یہ کتنی بڑی نادانی اور بے بصری ہوگی کہ اسے ناکارہ، اپاہج اور لولا سمجھ لیا جائے۔ نفاق کا مفہوم اس کے سوا کیا ہے کہ زبان سے خدا کی خدائی اور رسول کی رسالت کا اقرار کیا جائے مگر دل میں خدا کے قانون اور رسول کی ہدایت سے کوئی لگاؤ نہ ہو، اور آئین قرآنی کے مقابلہ میں دنیوی مصالح، نفسانی رجحانات

اور جسمانی لذائذ زیادہ مرغوب ہوں بلکہ انہیں مصلحتوں اور فائدوں کو حاصل کرنے اور محفوظ رکھنے کے لیے ایمان اور اسلام کو آڑ بنایا جائے۔ چنانچہ قرآن نے نفاق کو خوبی کئی جگہ کھول کھول کر بیان کیا ہے:۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ (بقرہ - ۲)

اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور روزِ جزا پر ایمان لائے حالانکہ اندر سے وہ مومن نہیں۔ یہ (ابزعم خود) اللہ کو اور مسلمانوں کو فریب دینا چاہتے ہیں، حالانکہ حقیقت میں وہ اپنے سوا کسی کو فریب نہیں دیتے، مگر انہیں اس حقیقت کا شعور نہیں۔

...... الَّذِينَ قَالُوا آمَنَّا بِأَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوبُهُمْ (مائدہ - ۶)

جو اپنے منہ سے تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے مگر فی الحقیقت ان کے دل ایمان نہیں لائے۔

إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ (المنافقون - ۱)

جب منافق تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ ہاں اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم اس کے رسول ہو مگر وہ گواہی دیتا ہے کہ منافق (اپنے اس دعوائے ایمان میں) جھوٹے ہیں۔

وَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ وَمَا هُمْ مِنْكُمْ وَلَٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَفْرَقُونَ۔ (توبہ - ۷)

اور یہ لوگ اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تم میں سے ہیں حالانکہ وہ تم میں سے نہیں بلکہ وہ تو ایسے لوگ ہیں جو (غیر اللہ سے) ڈرتے ہیں۔

اعراب کے دعوائے ایمان کے متعلق فرمایا جاتا ہے کہ:۔

قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَٰكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ

عرب کے بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ ان سے کہہ دو کہ نہیں تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم مطیع ہو گئے

الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ ہیں (یعنی بظاہر مسلمان ہیں) ورنہ ایمان کا تو ابھی تک تمہارے دلوں میں گذر تک نہیں ہوا ہے۔ (حجرات - ۲)

یعنی بظاہر اطاعت کر لینا ایمان کی دلیل اور سند نہیں ہے۔ ایسے "مسلمان" کو مومن نہیں کہا جا سکتا۔ یہ وہ مسلمانیت ہے جس کی تہ میں خالص کفر کے سوا کچھ نہیں۔ ایسے "مسلمان" اس اعلان و اقرار کے پہلے جس طرح کافر تھے، اللہ عالم الغیب کہتا ہے کہ ویسے ہی اس کے بعد بھی کافر ہے وَاِذَا جَآءُوْکُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْکُفْرِ وَھُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِہٖ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا کَانُوْا یَکْتُمُوْنَ (مائدہ - ۹)

یعنی جب وہ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے حالانکہ جیسا کفر لیے ہوئے وہ آئے تھے ویسا ہی کفر لیے ہوئے واپس گئے۔ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ چھپائے ہوئے ہیں۔

یہ ہے نفاق کی ماہیت جو ان آیات کے اندر جھلک رہی ہے۔ انہی تصریحات کو سامنے رکھکر علمائے اصطلاحات شرعیہ نے نفاق کی تعریف اس طرح کی ہے:-

ھوالدخول فی الشرع من باب والخروج عنه من باب ۔[1]

پھر اس دخول و خروج کا محرک ہونا صرف ایک ہی شئے تک تو محدود ہے نہیں۔ اس کے بیسیوں محرکات ہو سکتے ہیں۔ البتہ سب کی تہ میں حقیقت اور روح ایک ہی ہوگی اور ایک ہی ہو سکتی ہے، یعنی قرآن پر عدم یقین اور دنیا پرستی چنانچہ آگے کی تفصیلات میں آپ پائیں گے کہ تقریباً ہر گروہ منافق کے ادعائے ایمان پر عالم غیب انھیں جھوٹے، کذاب، منکر قرآن اور محارب اسلام کے خطاب سے یاد کرتا ہے۔

منافقین کی اقسام

اگرچہ نفاق کی اصل اور روح ہر جگہ ایک ہے لیکن اس کے مظاہر میں کافی تعداد پایا جاتا ہے۔ اس لیے ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ قرآن کی رو سے منافقین کی کتنی اقسام ہیں اور ہر قسم کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں۔

---

[1] ایک دروازے سے حلقۂ اسلام میں داخل ہونے اور دوسرے سے نکل آنے کو نفاق کہتے ہیں۔ (مفردات امام راغب اصفہانی)

(۱) بناوٹی مسلمان | نزول قرآن کے وقت ایک قسم کے منافق وہ تھے جو اپنے قدیم مذہب پر سختی کے ساتھ جمے ہوئے تھے مگر بظاہر اسلام قبول کرنے کا اعلان محض اس لیے کرتے تھے کہ بعد میں مرتد ہو کر اسلام سے دنیا کو متنفر کریں اور لوگوں سے کہیں کہ اگر اسلام حق مذہب ہوتا تو ہم اسے قبول کر کے چھوڑ کیوں دیتے؟ قرآن اس گروہ کا ذکر بدیں الفاظ کرتا ہے:۔

وَقَالَتْ طَّائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ۔ (آل عمران۔۸)	اہل کتاب میں سے ایک گروہ اپنی جماعت کے آدمیوں سے کہتا ہے کہ مسلمانوں پر جو قرآن نازل ہوا ہے اس پر صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو انکار کردو تاکہ دوسرے بھی تمہیں دیکھ کر اس دین سے پھر جائیں۔

اسلام کی اجتماعی طاقت کو توڑنے اور اس کی ہوا اکھاڑنے کے لیے دشمنان الٰہی کا یہ کتنا مؤثر نفسیاتی حربہ تھا۔ آج یہ حربہ ایک دوسری طرح استعمال ہو رہا ہے۔ بعض پیدائشی اور خاندانی مسلمان اسلام کو اعتقاداً اور عملاً چھوڑ کر کسی دوسرے طرز خیال اور مسلک اجتماعی پر ایمان لے آتے ہیں، مگر اپنے نام نہیں بدلتے بلکہ بدستور مسلمان بنے رہتے ہیں اور پھر اُس مسلک کی تبلیغ کرتے پھرتے ہیں تاکہ دوسرے مسلمان بھی ان کے ناموں اور لباسوں سے دھوکا کھا کر اس کفر کو آسانی سے قبول کر لیں۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کو بڑے بڑے علمبرداران حریت ـــ مسلمان علمبرداران حریت ـــ یہ سبق دیتے اور نہایت دلسوزی سے سمجھاتے ہیں کہ اس دور جدید میں اُس پرانے اسلام کو نہ لیے پھرو جو ایک خاص ماحول اور ایک خاص قوم کی اصلاح کے لیے تھا۔ دنیا ہزارہا منزلیں آگے نکل چکی ہے۔ اب وہ اصول کام نہیں دے سکتے۔ اب ایک نیا اسلام بناؤ۔ رضا شاہ اور اتاترک کو دیکھو آخر وہ بھی تو مسلمان ہیں بلکہ "اسلام کی تلوار" ہیں۔ اگر اسلام کے وہ قدیم اصول آج کام کے ہوتے تو یہ لوگ کیوں انہیں چھوڑ کر سوئٹزرلینڈ اور فرانس کے قوانین اختیار کرتے؟ اس قسم کا وعظ "مسلمان" زعماء اور اہل قلم حضرات مسلمانوں کو بار بار سنا رہے ہیں، لیکن چونکہ زمانہ ہے آزاد خیالی اور

روشن خیالی کا اس لئے انہیں منافق نہیں کہا جاتا بلکہ یہ اسلام کے دوست، محافظ اور رہنما کہلاتے ہیں۔

(۲) دشمنان اسلام کے جاسوس اسلامی نظام کی تباہی کے لیے قرنِ اول کے منافقین کبھی ایک اور راستہ اختیار کرتے تھے۔ وہ اسلام کا دعویٰ کر کے مسلمانوں کی جمعیت میں گھس جاتے تھے اور گھسے رہتے تھے تاکہ ان کے سیاسی عزائم و تدابیر کی ٹوہ لگاتے رہیں اور اپنی قوم کو یا دوسرے اعدائے اسلام کو ان سے باخبر کرتے رہیں۔ قرآن میں متعدد مقامات پر اس شر انگیز گروہ کے وسائس کو عریاں کیا گیا ہے:۔

وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ ...... وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ط (النساء ۔ ۱۱)

منہ سے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اطاعت گذار ہیں مگر جب تمہارے پاس سے اٹھ کر جاتے ہیں تو ان میں سے کچھ تمہاری گفتگو اور تلقین کے برعکس دوسری ہی باتوں کا مشورہ کرتے ہیں ...... اور جب ان کے پاس امن یا خوف کی کوئی خبر آتی ہے تو اسے اہلِ حل و عقد کے پاس صیغۂ راز میں رکھنے کے بجائے مشہور کر دیتے ہیں۔

دوسری جگہ ہے:۔

فَتَرَى الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ يُسَارِعُونَ فِيهِمْ۔ (مائدہ ۔ ۸)

تم دیکھو گے ان لوگوں کو جن کے دلوں میں نفاق کا مرض ہے کہ وہ مخالفین اسلام کے درمیان بڑی دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں۔

ایک اور مقام پر منافقین کی یہ صفت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے:۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نُهُوا عَنِ النَّجْوَى ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَيَتَنَاجَوْنَ بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُولِ (مجادلہ)

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں سرگوشیاں کرنے سے منع کیا گیا تھا پھر وہ باز نہیں آئے اور گناہ اور عدوان اور نافرمانیِ رسول کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔

ان کے سینے ایک ایسے تنور کے مانند تھے جس میں اسلام کی نفرت اور عداوت کی آگ ہر دم جلتی رہتی تھی۔ وہ مسلمانوں کی برتری اور خوشحالی کو دیکھ کر غصہ سے پاگل ہو جاتے، اور انھیں مصائب و آلام میں گھرا دیکھ کر قلبی سکون و مسرت محسوس کرتے۔ قرآن نے ان کی اس کینہ جوئی کے مکروہ چہرے سے یوں نقاب اٹھایا ہے۔

وَ اِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَ اِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ .... اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَ اِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا۔ (آل عمران - ۱۲)	جب یہ لوگ تم (مسلمانوں) سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم مومن ہیں اور جب علیحدہ ہوتے ہیں تو غصہ کے مارے اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں ..... اور اگر تمہارا کوئی بھلا ہوتا ہے تو ان کو رنج پہنچتا ہے اور اگر تمہیں کوئی گزند پہنچتا ہے تو بہت مگن ہوتے ہیں۔

جن لوگوں کو ترکی سلطنت کی پچھلی داستانیں معلوم ہیں وہ جانتے ہیں کہ کس طرح اس سلطنت کا قلب ان سازشیوں کا مرکز بن گیا تھا جو یورپین حکومتوں سے اندرونی تعلق رکھتے تھے عرب میں کتنے ہی ایسے منافق اسلام کے لباس میں موجود تھے جنہوں نے اپنی دنیوی اغراض کی خاطر کفار کو مسلمانوں پر مسلط کرایا۔ خود ہندوستان میں مسلمانوں کی برائے نام حکومت کو جنہوں نے بیرونی حملہ آوروں کے ہاتھ فروخت کیا وہ بھی تو آخر "مسلمان" ہی تھے۔ اور آج ہمارے درمیان کتنے وہ لوگ موجود ہیں جو ماشاء اللہ مسلمان بھی ہیں اور پھر اپنے دنیوی فائدوں کے لئے خبر رسانی سے لے کر لاٹھی چارج اور آتش باری تک کی تمام وہ خدمات انجام دیتے ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کو مغلوب رکھنے کے لئے کفار اُن سے لینا چاہتے ہیں حتیٰ کہ ایسے لوگ بھی مسلمانوں میں مل جائیں گے جو حکومت کفر کی خیر خواہی و مصلحت اندیشی میں خود کفار سے بھی آگے قدم رکھتے ہیں۔

(۳) مذہبی گروہ بندی کرنے والے لوگ | منافقین کا ایک طبقہ وہ تھا جو مسلمانوں کی جماعت میں محض تفریق اور فتنہ و فساد برپا کرنے کی خاطر اسلام کا لیبل لگائے رہتا تھا۔ یوں تو جماعتی زندگی کے لئے

تفرقہ عموماً مضرت رساں ہوتا ہے، لیکن خصوصیت کے ساتھ جو تفرقہ مذہب اور حق پرستی کی آڑ میں نمودار ہوتا ہے وہ ایسا زہر ہلاہل ہے جس کا کوئی تریاق نہیں۔ منافقین نے اس نسخہ کو بھی پورے حزم و احتیاط کے ساتھ آزمایا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کفارِ مکہ سے مایوس ہو کر مدینہ کی طرف ہجرت فرما ہوئے تو ابتداء میں آپ نے شہر سے تین میل کے فاصلہ پر قبا نامی ایک مقام پر چند روز قیام فرمایا تھا (باختلاف مورخین چار دن یا چودہ دن وہاں قیام رہا)۔ اس اثناء میں باقاعدہ اور باجماعت نماز ادا کرنے کے لئے آپ نے اپنے دستِ مبارک سے ایک مسجد کی بنا ڈالی جو مسجد قبا کے نام سے مشہور ہوئی۔ سنہ ۹ھ میں ابو عامر راہب کے اشارے پر منافقین نے اس کے قریب ہی ایک اور مسجد بنائی اور مشہور کیا کہ کمزور اور مجبور لوگوں کے لیے، جو بارش یا رات کی تاریکی میں اس مسجد تک نہیں جا سکتے، ہم نے یہ انتظام کیا ہے تاکہ وہ آرام سے یہاں نماز پڑھ لیں۔ تعمیر ہو چکنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان منافقین نے استدعا کی کہ آپ بطور تبرک اس کا افتتاح فرما دیں، اس کے بعد ہم نماز پڑھیں گے۔ قبل اس کے کہ آپ ان کی خواہش کو عملاً شرفِ پذیرائی بخشتے، عالم الغیب نے ان بد طینت لوگوں کی مکروہ لیکن سخت خوفناک چالوں کا راز فاش کرتے ہوئے آگاہ کیا کہ:

"اور ایک قسم کے منافقین وہ بھی ہیں، جنہوں نے اس غرض سے ایک مسجد تیار کی ہے کہ مسلمانوں میں تفریق پیدا کر کے انہیں نقصان پہنچائیں اور خدا کے ساتھ کفر کریں اور ان لوگوں کے لیے کمین گاہ بنائیں جو پہلے اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کر چکے ہیں۔ (مسجد کی تعمیر تو اس فتنہ اور عداوت کی نیت سے عمل میں آئی ہے لیکن جب پوچھا جائے گا تو) قسمیں کھا کر کہیں گے کہ خیر اور نیکی کے سوا ہمارے ارادعل میں کوئی چیز نہیں۔ مگر خدا گواہی دیتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں۔ (پس اے پیغمبر) تم اس مسجد میں ہرگز نماز نہ پڑھنا .... (توبہ - ۱۳)

مسجد یعنی خدا پرستی اور امن و صداقت کے مرکز اور وحدت و اخوّت کے سرچشمہ کو نفس پرستی اور تفرقہ انگیزی کا ذریعہ بنانا کچھ اُسی زمانہ کے منافقین کی خصوصیت نہیں تھی۔ کیا آپ اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے

ہیں کہ اس مرکز وحدت وجمعیت کو آج بھی اُسی طرح تفریق بین المومنین کا ذریعہ بنایا جارہا ہے۔ مدینہ کے دشمنانِ حق نے تو ایک مسجد ضرار بنائی تھی لیکن یہاں علمبرداران حق نے مشرق سے مغرب تک ہزارہا ایسی مسجدیں بنا رکھی ہیں اور تبلیغ حق کے نام پر امت کو دعوت نزاع دے رہے ہیں۔ اسلام دشمنی کی یہ انتہائی خطرناک صورت تھی جسے منافقوں نے اختیار کیا تھا کہ فتنہ کو آشتی، شر کو خیر اور معصیت کو نیکی کے پردہ میں پیش کیا جائے یا بالفاظ دگر خیر وصلاح ہی سے شر وفساد کا کام لیا جائے۔ اُن منافقوں پر تو سو بار لعنت کی جاتی ہے جنہوں نے آغاز اسلام میں ایسی شرانگیز حرکت کی تھی، اس لئے کہ خدا نے صاف صاف ان پر نفاق کا الزام لگا دیا ہے، لیکن کیا تصور فرمائیں گے آپ دور حاضر کے اُن پیشوایان دین کے متعلق جنہوں نے دین کو اپنی اہوا رو آرار کی آماجگاہ بنا رکھا ہے؟ جو اسلام کے نام پر اُمت کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہیں، جن کی مسجدوں کے دروازوں پر موٹے موٹے حرفوں میں لکھا رہتا ہے کہ "اس مسجد میں کوئی وہابی نہ گھسے" "یہ مسجد اہل حدیث کی ہے، کوئی مقلد اس میں نماز نہیں پڑھ سکتا" "یہ مسجد فلاں فرقہ کی ہے دیگر فرقوں کو اندر قدم رکھنے کی اجازت نہیں" ۔ اور ایسی ہی دوسری عبارتیں جنہیں پڑھ کر آنکھیں فرط حیرت سے اور دل شدت الم سے پھٹ جاتے ہیں۔ اور ان لوگوں کے حق میں کیا ارشاد ہے جنہوں نے یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ کو ایک امت کا مخصوص شعار قرار دیا اور اس کلمہ کو اپنی مساجد کے دروازوں اور محرابوں پر باصرار کندہ کرایا تاکہ ہر ایسی مسجد اس کلمہ کی برکت سے لڑائی کا اکھاڑا بن جائے۔ کہا جاتا ہے کہ گو اعمال اور نتائج ایک سے ہیں لیکن نیتوں میں فرق ہے۔ اس وقت مسلمانوں میں جو مذہبی گروہ بندیاں ہیں ان کی تخلیق میں وہ غرض و غایت نہیں ہے جو اُن منافقین کے پیش نظر تھی۔ مگر اوّل تو ہمیں یہی نہیں معلوم کہ نیتیں متعین کس طرح کی جاسکتی ہیں؟ آخر مسجد ضرار کے بانیوں کی زبان سے بھی تو اِنْ اَرَدْنَا اِلَّا الْحُسْنٰی کا ہی نعرۂ خلوص سنا گیا تھا۔ پھر اگر فرض کر لیا جائے کہ ان مدعیان اسلام کی نیتیں بالکل خالص اور بے لوث ہی ہیں تب بھی کیا سنکھیا کسی شخص کو موت کے حوالہ کرنے سے اس لیے باز رہ سکتی ہے کہ کھلانے والے نے اسے تریاق سمجھ کر کھلایا تھا؟

اگر یہ صحیح نہیں تو یہ کس طرح صحیح ہے کہ کعبہ سے کفر کی تبلیغ کرنا محض اس وجہ سے درگذر کے قابل ہے کہ تبلیغ کرنے والے کی نیت صاف ہے۔ افسوس ہے کہ یہ مصیبت جتنی ہی سخت ہے اور ہولناک ہے اس سے اتنی ہی بے پروائی اور مداہنت برتی جارہی ہے۔

(۴) نسلی اور وطنی افتراق پیدا کرنے والے مفسد | تفرقہ انگیزوں کا ایک اور گروہ وہ تھا جو مہاجرین اور انصار کے درمیان نسلی، قومی اور وطنی عصبیتیں پیدا کرنے میں سرگرم رہتا تھا، اور مسلمانوں کی جماعت میں اس مقصد سے دوڑ دھوپ کرتا تھا کہ موقع پاکر نسلی اور وطنی حمیت جاہلیہ کو ابھار کر اس جماعت کی طاقت فنا کردے۔ منافقوں نے یہ شرارت کئی بار کی۔ غزوۂ بنی المصطلق کے موقع پر تو اسی شرارۂ قومیت نے سارے اسلامی خرمنِ اتحاد کو جلا کر خاکستر کر دیا تھا اگر رسول اللہ کی مستحکم تربیت نے صحابہ کرام کو ان جہل پرستیوں سے بلند و بالا نہ کر دیا ہوتا۔ ایک انصاری اور ایک مہاجر میں معمولی سی جھڑپ ہو گئی تھی۔ سید المنافقین عبداللہ ابن اُبی نے موقعہ غنیمت جانا۔ انصار کو اپنے نسلی اور قومی مفاخر یاد دلائے اور کہا کہ یہ غیر ملکی اب تمہاری آستین کے سانپ بن گئے ہیں، کل تک تمہارے رحم و کرم پر جی رہے تھے، آج تمہارے منہ لگ رہے ہیں بلکہ خود ذلیل ہوتے ہوئے الٹا تم کو ذلیل اور کمتر سمجھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فوراً ان کے فتنہ سے لوگوں کو متنبہ کیا اور عزت و ذلت کے جاہلی تخیلات کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

يَقُولُونَ لَئِن رَّجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ	یہ منافق کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینہ لوٹے تو
لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ	عزت والا (اہل مدینہ) ذلیل لوگوں (آنحضرت
وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَٰكِنَّ الْمُنَافِقِينَ	اور مہاجرین) کو وہاں سے نکال باہر کرے گا۔
لَا يَعْلَمُونَ۔ (منافقون۔ ۲)	حالانکہ اصلی عزت تو اللہ ہی کے لیے ہے اور

اس کے رسولؐ کے لیے اور مومنوں کے لیے۔ لیکن یہ منافق جانتے نہیں۔

اس قسم کے منافقوں کا تو آج عالم اسلامی میں جال بچھا ہوا ہے۔ اپنی جاہلی اغراض کی خاطر آئے دن

لیت اور وطنیت کے سوالات اٹھا کر امت مسلمہ کے جس کا کبھی ایک قبلہ اور ایک مرکز تھا، اب بے شمار قبلے
مختلف مرکز بنائے جا چکے ہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ منافقین غیر مسلم گھرانوں میں پیدا ہوئے تھے اور آج
ے دشمنان قرآن مسلمان گھروں میں پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن جس طرح وہ پیشرو اپنی سفلی اغراض اور نفسانی رجحانات
کی تکمیل کے لیے اسلامی نظام جماعت کو ڈھانا ضروری سمجھتے تھے اسی طرح ان کے مقلدین بھی اس نظام کو توڑنے
ہی میں اپنے نفس کی فلاح سمجھتے ہیں مگر جس طرح وہ اپنی تکمیل اغراض کے لیے اسلام کا نقاب اوڑھنا ضروری سمجھتے
تھے اسی طرح یہ بھی مسلمانیت کا لبادہ اتار پھینکنا مصلحت کے خلاف سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اولی و انسب طریقہ
یہی ہے کہ وطن پرستی کی چھری سے اسلامی نظام جماعت کو ذبح بھی کریں تو بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر کریں۔

(۵) مطلب پرست اور وقت کے ساتھ بدلنے والے لوگ | منافقین کا ایک گروہ وہ ہوتا ہے جن کے لئے سب سے مقدم اپنے ذاتی
دنیوی فوائد ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ہر اس راہ پر چلنے سے گریز کرتے ہیں جو ان کے لیے کوئی جانی یا مالی خطرہ پیدا
کرنے والی ہو خواہ وہ حق کی راہ ہو یا باطل کی۔ یہ لوگ ابن الوقت اور موقع پرست ہوتے ہیں۔ ان کو حق اور باطل
کے جھگڑے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ صرف اپنے شخصی مفاد سے دلچسپی ہوتی ہے جس کی خاطر وہ مسلمانوں سے
بھی ملے رہنا چاہتے ہیں، اور کفار سے بھی تاکہ معرکۂ کفر و اسلام میں واقعات کا اونٹ جس کروٹ بیٹھے اسی کروٹ
پر یہ بھی بآسانی پلٹ جائیں۔ ابتدائے اسلام میں بھی ایسے منافقین کی ایک اچھی خاصی تعداد موجود تھی چنانچہ قرآن
ان کی باطنی و ظاہری خصوصیات کا تفصیلی خاکہ اس طرح کھینچتا ہے:۔

"اور بعض لوگ ایسے ہیں جو زبان سے تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم اللہ اور یوم آخر پر ایمان لائے حالانکہ
وہ دل سے ایمان نہیں لائے ہیں (محض برنبائے مصلحت یہ کہکر) وہ خدا اور ایمان لانے
والوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں، حالانکہ وہ اس طرح خود اپنے ہی کو دھوکا دے رہے ہیں جس کا وہ
شعور اور ادراک نہیں رکھتے ۔۔۔۔۔۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (قانون اسلام کے
مکمل تابع ہو جاؤ اور) زمین میں فساد نہ برپا کرو تو تم کہتے ہیں کہ ہم تو (کفار اور اہل اسلام

کے باہمی جھگڑوں سے الگ رہ کر، صلح کل کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ یاد رکھو! یہی لوگ حقیقی مفسد ہیں (جو یک طرفہ صاف راہ نہیں اختیار کرتے) لیکن وہ اس حقیقت کو سمجھتے نہیں۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (اس دورنگی کو چھوڑ کر) اسی طرح ایمان لاؤ جس طرح کہ اور مسلمان ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ کیا ہم بھی اُس طرح ایمان لائیں جس طرح بے وقوف غیر مآل اندیش اور نامصلحت شناس لوگ ایمان لائے ہیں؟ لیکن یاد رکھو! واقعی احمق اور ناانجام شناس یہی لوگ ہیں مگر وہ اس راز کو بوجھتے نہیں۔ اور جب مسلمانوں سے یہ لوگ ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ امنّا (ہم بھی مومن ہیں) اور جب تنہائی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو یونہی مسلمانوں سے مذاق کرتے ہیں اور انہیں بیوقوف بناتے ہیں۔" (بقرہ - ۲)

خط کشیدہ فقروں پر غور کیجئے۔ یہ لوگ خدا کے قانون کی پیروی اور رسول کی کامل اطاعت کو فساد اور نقضِ امن کی بنا سمجھتے تھے۔ قرآنی اوامر و نواہی پر خلوص قلب کے ساتھ عمل کرنے کو "بے وقوفی" سے تعبیر کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ یہ کیسے احمق اور ناعاقبت اندیش لوگ ہیں جو کھلم کھلا قرآن کی حاکمیت تسلیم کر کے عرب و عجم کی دشمنی مول لیتے اور اپنے عیش و آرام کو برباد کرتے ہیں، مصلحت وقت کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہر فریق سے نباہتے چلو، ہر ایک سے اپنا مقصد حاصل کر و۔ اگر مسلمان شکست کھائیں تو کفار سے دوستی قائم رکھنے کا صلہ ملے گا، گیہوں کے ساتھ گھن نہ پسے گا۔ اگر مسلمان فتح یاب ہوئے تو مسلمانوں میں شامل رہنے کا فائدہ حاصل ہوگا، جو دنیوی فوائد دوسرے مسلمانوں کو حاصل ہوں گے ان میں حصہ بٹانے کا موقع ملے گا۔ اور یہ دوہرا نفع اس طرح حاصل ہوگا کہ نہ اپنا ایک حبہ خرچ کرنا پڑے اور نہ اپنے پسینے کا ایک قطرہ بہانا پڑے۔ دیکھو ہمارا طریقہ کس قدر مصالحانہ اور امن آفریں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ رسول کی کامل اطاعت کیوں ضروری ہو؟ ہر شریعت اپنی اپنی جگہ درست اور حق ہے اور ایک کو دوسرے پر فضیلت

کی کیا وجہ ؟ امن اور صلاح کا راز اسی میں ہے کہ ہر ایک کو برحق قرار دو اور اس حق و باطل کے جھگڑے میں کسی کے ساتھ شریک نہ ہو۔

آگے چل کر اسی سلسلہ میں قرآن مجید ان لوگوں کی حالت کو ایک تمثیل کے پیرائے میں یوں بیان کرتا ہے :-

"یا ان منافقوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی بارش میں گھر گیا ہو جس میں کئی طرح کی تاریکیاں ہیں، کڑک ہے، بجلی ہے۔ کڑک ایسی سخت کہ جان کے خوف سے کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں اور بجلی کا ایسا زور کہ آنکھیں اندھی ہوئی جا رہی ہیں اور کافروں کو چاروں طرف سے خدائے قادر و توانا نے گھیر رکھا ہے۔ جب ان کے سامنے بجلی چمکتی ہے تو اس کی روشنی میں دو قدم چل لیتے ہیں اور جب ان پر تاریکی چھا جاتی ہے تو ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں" (البقرہ — ۲)

پچھلی تفصیل میں ان منافقین کی تصویر باطنی کے جو گوشے کسی قدر تاریکی میں رہ گئے تھے اس تشبیہ نے ان سب کو روشنی میں کر دیا ہے۔ یہاں یہ بھی ظاہر کر دیا گیا کہ وہ اپنی اس دورنگی کو نباہتے کس طرح تھے اور "مسلمانیت" کے ظاہری دعویٰ کا حق کس حد تک ادا کرتے تھے۔ قرآن پر ان کا اعتقاد تو تھا نہیں، محض اپنے دنیوی مفاد اور مقاصد کی خاطر زبان سے ایمان ایمان کا شور مچایا کرتے تھے۔ اس لیے جب قرآن کے ہلکے اور بے ضرر احکام کا معاملہ ہوتا تو اس پر بڑی مستعدی اور تندہی سے عمل کر کے اپنی اسلامیت کا اظہار کرتے۔ لیکن جب سخت احکام کی باری آتی، جب عیش و آرام اور لذات دنیوی کی قربانی کا مطالبہ ہوتا تو یکایک سارا جوش ایمانی سرد ہو کر رہ جاتا۔ دہشت اور حیرانی کی تاریکیوں میں گھر جاتے اور موت کی سی غشی طاری ہونے لگتی رب العالمین کے احکام جو دوسروں کے حق میں باران رحمت تھے وہ ان بدنصیبوں کے حق میں بجلی کے جاں ستاں کڑکے بن گئے تھے کہ سنتے

اور موت کے خوف سے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے گویا ان منافقین کا مرکزی وصف یہ تھا کہ احکام کی تعمیل ان پر سخت شاق گذرتی تھی۔ اور خدا کی شریعت ان کے لئے رحمت و نعمت ہونے کے بجائے الٹی مصیبت اور زحمت بن جاتی تھی۔

جہاد کا میدان قوت ایمانی کی سب سے کڑی آزمائش گاہ ہے، جہاں منافق کے لیے اپنے رنگ باطن کا چھپانا یکسر ناممکن ہو جاتا ہے منافقین کا یہ گروہ، جس کا ذکر مندرجہ بالا آیات میں ہے، ہر موقع پر اپنے آپ کو چھپانے میں کچھ نہ کچھ ضرور کامیاب ہو جایا کرتا تھا، اسلامی معاملات پر ایمان و اخلاص کا پیکر بن کر آتش بیانیاں بھی کر لیتا تھا مسلمانوں کی قومی فلاح کے لئے تجاویز بھی پیش کیا کرتا تھا موقع بموقع جیب سے چند سکے بھی "راہ خدا" میں صرف کر دیا کرتا تھا اور کسی نہ کسی طرح نمازیں بھی پڑھ لیا کرتا تھا لیکن جب خدائی احکام ان کی جانوں کا مطالبہ کرتے، وہ وقت اس کے لیے بڑا سخت ہوتا۔ جس دنیا کے عشق میں اس نے دین اور حق اور اپنے ضمیر کو بیچا تھا اگر اسی کی نذر مانگی جائے تو وہ اس کو کیسے گوارا کر سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ ادعائے ایمان کا راز فاش ہو جاتا اور لاکھ زیر نقاب ہونے کے باوجود بے نقاب ہو کر رہتا۔ عالم الغیب بار بار قتال کا حکم دے کر، نیز بعض اوقات مسلمانوں کی جماعت کو شکستیں کھلا کر ایسے تمام فریب کاروں کی اصل تصویر کو برملا عریاں کرنے اور انہیں مسلمانوں کی جماعت سے علیحدہ کر دینے پر تلا ہوا تھا چنانچہ جب کبھی حکم قتال نازل ہوتا، یہ منافق کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ضرور ہی گھروں میں بیٹھے رہتے۔ اور جب مسلمان لڑ کر واپس آتے تو یہ لوگ اپنی عدم شرکت کے لیے معذرتیں پیش کرتے اور قسمیں کھا کھا کر اپنے حسن باطن کا یقین دلانے کی سعی کرتے، غزوہ احد کے سلسلے میں ان عیاروں اور دنیا کے پرستاروں نے منافقت کا جو پارٹ ادا کیا سنیئے قرآن اس کا تذکرہ کن لفظوں میں کرتا ہے:۔

"دونوں جماعتوں کی (یعنی مسلمانوں اور کافروں کی) مڈبھیڑ کے دن (غزوۂ احد کے وقت) تمہیں جو کچھ نقصان اور ہزیمت اٹھانی پڑی وہ اللہ کے حکم کے مطابق تھی اور اس غرض سے تھی کہ

رہم تمہیں آزمائیں، اور معلوم کرلیں (یعنی لوگوں پر ظاہر کر دیں) کہ کون سے لوگ واقعی مومن
ہیں اور کون سے ایسے ہیں جن کے دلوں میں نفاق ہے۔ اس دن منافقوں سے کہا گیا
کہ آؤ اللہ کی راہ میں لڑو یا کم سے کم (دشمنوں کی) مدافعت ہی کرو۔ یہ سن کر کہنے لگے کہ اگر ہم
سمجھتے کہ آج لڑائی ہوگی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ چلتے۔ یہ لوگ اس وقت ایمان کی بہ نسبت
کفر سے زیادہ اقرب تھے۔ اپنے منہ سے ایسی بات کہہ رہے تھے جو ان کے دلوں میں نہیں
تھی۔ اور اللہ تعالیٰ ان کے راز دروں کو خوب جانتا ہے۔ (یہی وہ لوگ ہیں) جو خود بیٹھے
رہے اور میدانِ جنگ میں شہید ہو جانے والوں کی نسبت کہتے رہے کہ اگر وہ ہمارا کہا مانتے تو
قتل نہ ہوتے"۔ (آلِ عمران)

یہ تھی نفاق کی خباثت اور اس کی حیلہ جوئی۔ دشمن صدہا میل طے کر کے اپنی پوری قوت سے میدانِ جنگ
ں خیمہ ڈالے پڑا ہے اور ادھر سے جواب دیا جاتا ہے کہ لڑائی بھلا تو ہونے کی نہیں۔ اور جب اللہ کے
لص جاں نثار اپنا فرض ادا کر کے شہید ہو گئے تو ہمدردانہ فرمایا جاتا ہے کہ اگر ہماری تدبیر پر عمل کرتے
کیوں دنیا کی لذتوں سے ہاتھ دھوتے۔ گویا خود تو خود، دوسرے انسانوں کے متعلق بھی یہ بندگانِ نفس
تصور کرنے سے قاصر تھے کہ آیا حق و ایمان کی اتنی قیمت بھی ادا کی جا سکتی ہے کہ اس پر اس دنیائے
نی کو قربان کر دیا جائے۔

جب سچے مسلمان بے سروسامانی کے عالم میں، دشمن کی کثرت اور اپنی قلتِ تعداد کا لحاظ کیے
بر رسول کی دعوتِ جہاد پر آحاضر ہوتے تو یہی منافق ان پر آوازے کستے کہ انہیں ان کے دین نے
ھوکے میں ڈال دیا ہے" (انفال۔ ۷)، ان پر عقیدت کا جن سوار ہے، یہ مذہبی مجنون ہیں جو کچھ نہیں
یکھتے کہ انجام کیا ہوگا۔ دراصل ان منافقین کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اس دنیا میں اگر کوئی راہ اختیار کرنے کی
ہے تو صرف اس لیے کہ وہ مادی منفعت بخش سکے، اور اگر کوئی راہ چھوڑ دینے کی ہے تو محض اس لیے کہ

اس میں جان و مال کا زیاں ہے۔ انہی ذہنیت کی دوسری تصویر ملاحظہ ہو:۔

" اور تم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو میدان جہاد سے بچنے کی ٹھانے بیٹھے ہیں۔ اگر تم کسی مصیبت میں پھنس گئے تو کہنے لگے کہ خدا نے مجھ پر بڑا ہی فضل و احسان کیا کہیں ان (مسلمانوں) کے ہمراہ نہ تھا ورنہ میں بھی پس گیا ہوتا) ۔ اور اگر تمہیں خدا کی طرف سے کوئی فضل حاصل ہوا تو (ان کا دل جل گیا) کہنے لگے ــــ اس طرح کہ گویا تمہارے اور ان کے درمیان کبھی کوئی دوستی تھی ہی نہیں ـــــ کہ اے کاش میں بھی ان (مسلمانوں) کے ساتھ ہوتا تو میں بھی بڑی کامیابی حاصل کرتا (یعنی مجھے بھی مال غنیمت ملتا) "۔ (النساء ــــ ۱۰)

جیسا کہ تمثیل بالا میں ذکر ہو چکا ہے، یہ ابن الوقت اس وقت تو سراپا ایمان بن جاتے جب احکام ہلکے اور بے ضرر ہوتے اور ہاتھ سے کچھ کھونے کے بجائے کچھ حاصل ہونے کی توقع ہوتی۔ لیکن جہاں سخت احکام آتے اور ان کے دنیوی مفاد کو خطرہ لاحق ہوتا تو صاف کترا جاتے۔ ان کو اس سے بحث نہیں تھی کہ اللہ کی راہ میں لڑنے والا برسر حق ہے یا طاغوت کی راہ میں لڑنے والا۔ انہیں اس امر کا احساس تک نہ تھا کہ ظلم اور فساد کی بیخ کنی کرنا اور ارض الٰہی میں عدل و صلاح کی تخم ریزی کرنا بھی کوئی انسانی فریضہ ہے۔ وہ معاملات کو اس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہی نہ تھے۔ ان کی شریعت کا فتویٰ یہ تھا کہ لڑائی اس حیثیت سے تم پر فرض ہے کہ اس میں مال غنیمت ہاتھ آتا ہے، لیکن اس پہلو سے قطعاً حرام ہے کہ اس میں جان دینی پڑتی ہے۔ یہی بات مذکورۂ بالا آیات میں بیان ہوئی ہے اور اسی کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ایک جگہ اللہ تعالیٰ یوں فرماتا ہے کہ:۔

" اگر فوری فائدہ ہوتا اور سفر بھی (دشوار اور صبر آزما ہونے کی بجائے) متوسط قسم کا ہوتا تو یہ منافق ضرور تمہارا ساتھ دیتے۔ لیکن اس وقت (غزوۂ تبوک کے وقت) مسافت انہیں بہت دور معلوم ہوئی (اس لئے وہ چپ سادھ کر بیٹھ رہے) اور (جب تم لوٹنے کے بعد اس تخلّف کی وجہ پوچھو گے

تو قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ اگر ہمارے لیے ممکن ہوتا اور ہم مجبور نہ ہوتے تو ضرور تمہارے ساتھ نکل کھڑے ہوتے۔ (توبہ - ۷)

مسلمانوں کے ساتھ اور احکام قرآنی کے ساتھ ان کا یہ برتاؤ تھا۔ اب تصویر کا دوسرا رُخ دیکھیے کہ اعدائے اسلام کے ساتھ ان کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی:۔

بَشِّرِ الْمُنَافِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكَافِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ ...... (نساء - ۲۰)

اے پیغمبر ان منافقوں کو بشارت دے دو کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے ہیں۔ کیا یہ کافروں کے ہاں عزت کے طالب ہیں؟

دوسری جگہ آتا ہے کہ مومن کی شان یہ نہیں ہے کہ یہود و نصاریٰ وغیرہ معاندین حق سے کسی طرح کا ربط وضبط رکھے لیکن یہ منافق کیا کرتے ہیں:۔

تَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ۔ (مائدہ - ۸)

سو تم دیکھتے ہو کہ یہ لوگ جن کے دلوں میں نفاق کا مرض ہے، کفار کے ہاں بڑی آمد و رفت رکھتے ہیں۔

نیز:۔

...... قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ (محمد - ۳)

جو لوگ خدا کے نازل کئے ہوئے قرآن کو ناپسند کرتے ہیں (مثلاً یہود) یہ منافق ان سے کہتے ہیں کہ بعض باتوں میں ہم تمہارا ہی کہا مانیں گے۔ ✓

اس منافقانہ سازش کی تشریح ذیل کے الفاظ میں ہے:۔

...... يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ

یہ منافق اپنے بھائیوں یعنی کفار اہل کتاب سے کہتے ہیں کہ اگر تم (مسلمانوں کے ہاتھوں اپنے وطن سے)

لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيعُ فِيكُمْ أَحَدًا أَبَدًا وَإِنْ قُوتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ۔ (حشر-۲) نکالے جاؤ گے تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکل چلیں گے اور تمہارے بارے میں کسی کا کہنا مانیں گے۔ اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم (مسلمانوں کے خلاف) تمہاری مدد کریں گے۔

لیکن کیا جو اپنے شہوات نفس کی غلامی میں اسیر ہو کر مسلمانوں کے ساتھ نہ لڑسکتا تھا کہ مبادا جان عزیز کے لالے پڑ جائیں وہ غیر مسلموں کے لیے اتنا وفادار اور ایثار پیشہ ہو سکتا تھا کہ ان کی خاطر گھر بار چھوڑنے اور سر بکف میدانِ جنگ میں اتر آنے پر تیار ہو جاتے؟ قرآن ان کے ان دعاوی کو نقل کر کے فوراً ہی حقیقت سے پردہ اٹھاتا ہے کہ:-

"اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں۔ اگر اہل کتاب جلاوطن کئے گئے تو یہ ہرگز ان کے ساتھ نہ نکلیں گے اور اگر ان سے مسلمانوں نے جنگ کی تو کبھی بھی یہ جھوٹے مدعی ان کی اعانت نہ کریں گے اور (بالفرض) اگر مدد کے لیے آئیں گے بھی تو رجم کر لڑنہ سکیں گے، اور موت کی صورت دیکھکر) بھاگ کھڑے ہوں گے۔"

غرض جو سلوک ان کا اہل ایمان کے ساتھ تھا بعینہٖ وہی اہل کفر کے ساتھ بھی تھا۔ یہ دراصل اپنے نفس کے دوست تھے اور اس کی خاطر مسلم و کافر دونوں کو خوش رکھنا چاہتے تھے تاکہ موقع پر ہر ایک سے حق دوستی حاصل کریں اور جب کچھ نقصان اٹھانے کا موقع ہو تو اس سے محفوظ رہیں۔ یہی دورنگی کا کمال ہے جس میں جہاں تک ان کی تدبیروں کا بس چلتا، کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے۔ ان کی پالیسی کا خلاصہ قرآن کے چند مختصر لفظوں میں یہ تھا کہ:-

"یہ منافق تمہارے انجام کا انتظار کرتے رہتے ہیں اگر تم (مسلمان) بحکم خداوندی جیت گئے تو تم سے کہنے لگتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے (لاؤ ہمیں بھی مال غنیمت دو) اور اگر کافروں کو فتح نصیب ہوئی تو ان سے کہتے ہیں کہ کیا ہم تم پر غالب نہیں ہو گئے تھے اور ہم نے تم کو مسلمانوں

سے ہاتھ سے نہیں بچایا ؟ پس جو کچھ لڑائی میں ملا ہے ہمارا حصہ بھی لگاؤ (النساء - ۲۱)

اور اس سے بھی زیادہ جامع و مانع ان کی تعریف یہ تھی :-

مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى　　کفر اور ایمان کے بیچ میں پڑے لٹک رہے ہیں نہ

هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ (النساء - ۲۱)　　مسلمانوں کی طرف ہیں نہ کافروں کی طرف۔

اور اپنی اسی مذبذب پالیسی کو وہ صلح کل کی پالیسی قرار دے کر دعویٰ کرتے تھے کہ اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ (ہم تو سراپا اصلاح ہیں۔ اس دو رخی پالیسی کا نباہنا ان کی طلاقت لسانی پر موقوف تھا سو قرآن کہتا ہے وہ اس فن کے بڑے ماہر ہیں :-

"اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کی باتیں تمہیں اس وقت دنیا کی زندگی میں بڑی ہی بھلی معلوم ہوتی ہیں اور وہ خدا کو گواہ ٹھیرا کر اپنی مخلصانہ اطاعت کا یقین دلایا کرتے ہیں، حالانکہ وہ نہایت ہی جھگڑالو اور بڑے ہی فتنہ پرداز ہیں۔ اور جب تمہارے پاس سے اٹھکر جاتے ہیں تو اپنی سرگرمیاں زمین میں فساد پھیلانے کے لیے وقف کر دیتے ہیں...... اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا سے ڈرو (اور واقعی اطاعت شعار ہو جاؤ) تو جھوٹی عزت کا خیال ان کا دامن پکڑ لیتا ہے اور انہیں مجبور کرتا ہے کہ اپنی غلطی پر اڑے رہیں۔" (البقرہ - ۲۵)

دوسری جگہ ہے :-

"اور جب تم انہیں دیکھتے ہو تو ان کے اجسام تمہاری نگاہوں میں کھب جاتے ہیں (یعنی نہایت مہذب اور شریف معلوم ہوتے ہیں) اور اگر وہ تم سے بات کریں تو بس ان کی باتیں سنتے ہی ہو (کیونکہ ان کی چرب زبانی مجبور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے) (منافقین - ۱)

لیکن اللہ تعالیٰ نے جس طرح ان کے اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ کے دعوے کو یہ کہکر جھٹلا دیا تھا کہ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ کیونکہ مطلب پرستی اور اتباع شہوات ہی تو فتنوں کی ماں ہے

اور یہ لوگ اسی کُنہ کو سمجھنے سے قاصر تھے، اسی طرح یہاں بھی مذکورۂ بالا سورۂ بقرہ والی آیت کے بعد ہی، مطالبہ کیا کہ اگر تم واقعی مومن ہو، جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے، تو قانون اسلامی کے مکمل تابع ہو جاؤ (اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً) اور یہ دو رنگی چھوڑ دو۔ خدا کو ان بلند بانگ دعووں اور زبانی شین قاف کی مطلق ضرورت نہیں، بلکہ اس کے نزدیک تو یہی فساد کا منبع ہے۔ چنانچہ اسی فلسفۂ اصلاح و افساد کے بارے میں منافقوں کی غلط فہمیوں کو دور کرتے ہوئے فرمایا جاتا ہے کہ:۔

"پھر جب کوئی محکم سورۃ نازل ہوتی ہے جس میں جہاد کا حکم مذکور ہوتا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ جن کے دلوں میں نفاق کا مرض ہے وہ تمہاری طرف ایسی دہشت زدہ اور ہراساں نگاہوں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں جیسے کہ کسی پر موت کی غشی طاری ہو (اور اس کی آنکھیں خوف و وحشت برسا رہی ہوں) ..... تو اے منافقو! تم سے کچھ بعید ہے کہ اگر تم جہاد سے پیٹھ پھیر کر بیٹھ رہے تو بھی ملک میں فساد برپا کرتے رہو اور خود غرضیوں کی بنا پر باہم لڑ کر اپنے رحمی تعلقات کی دھجیاں اُڑاتے رہو۔" (محمد۔ ۳)

یہاں بھی وہی بات کہی گئی ہے جو سورۂ بقرہ میں ان کے دعوئے اصلاح کے جواب میں کہی گئی تھی کہ یہ نادان جہاد کو تو، جو مصالح تمدن کا حقیقی محافظ اور امن و عدل کا سرچشمہ ہے فساد قرار دیتے ہیں اور اپنی دو رنگی پالیسی کو موجب امن و آشتی کہتے ہیں، حالانکہ حقیقی فساد تو وہی خود غرضی و مطلب پرستی ہے جو ان کی روحوں پر چھائی ہوئی ہے، اَلَآ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰکِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ۔

یہی دو رنگی تھی جس کو ترک کرنے کا قرآن ان سے بار بار مطالبہ کرتا تھا۔ لیکن وہ جس بت کو اپنے سینوں میں چھپائے تھے اس کی عقیدت کیونکر یہ اجازت دے سکتی تھی کہ کھلے دل سے رسول کی اطاعت کاملہ کا عملاً اقرار کر لیں۔ زبانی دعووں کے بعد جب احکام الٰہی کی عملی اطاعت کی نوبت آ اور میدان جہاد میں دین و دنیا کی متاعیں تلنے لگیں تو آپ نے دیکھا کہ کس طرح وہ لپک کر دنیا کو اپنے

سینے سے چمٹا لیتے۔ اور جہاد ہی پر کیا موقوف تھا نفع و نقصان کے ہر موقع پر ان کا شیوہ یہی تھا۔ علیٰ ہذا قرآن کی پیروی اور خدا کی عبدیت کا تھا لیکن جب احکام کا معاملہ ہوتا تو دفعتہً یہ رشتۂ ایمانی تارِ عنکبوت کی طرح پرزے پرزے ہو کر اڑ جاتا۔ چنانچہ قرآن ان کے اس اصول مسلّمہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:۔

"اے مسلمانو! کیا تم نے دیکھا اُن لوگوں کو جو دعویٰ کرتے ہیں قرآن پر اور پچھلی آسمانی کتابوں پر ایمان لانے کا (لیکن) ارادہ یہ رکھتے ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ طاغوت سے کرائیں، حالانکہ خدا کا حکم یہ تھا کہ وہ طاغوت سے کفر کریں۔.........

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کے نازل کردہ قانون اور رسول کی طرف رجوع کرو (اور دین سے معاملات کا تصفیہ کرایا جائے) تو تم ان منافقوں کو دیکھتے ہو کہ تمہارے پاس آنے سے بھی رک جاتے ہیں (کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر ہم گئے اور قانون الٰہی کے مطابق فیصلہ کر دیا گیا تو ہم گھاٹے میں رہیں گے)۔" (نسار ۔ ۹)

دوسری جگہ اور زیادہ صاف لفظوں میں فرمایا گیا ہے کہ:۔

"اور جب ان منافقین کو دعوت دی جاتی ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف تاکہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک فریق راہ فرار اختیار کرتا ہے (جب کہ مقدمہ کا فیصلہ اس کے خلاف پڑنے کا احتمال ہو) البتہ اگر حق ان کی طرف ہو (یعنی فیصلہ ان کے حق میں اور ان کے حسب منشا ہو) تو سر کے بل دوڑتے ہوئے آتے ہیں۔" (نور ۔ ۶)

نہ صرف احکام کی پیروی سے بھاگتے تھے بلکہ:۔

"جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ رسول اللہ کی طرف چلیں، تاکہ وہ تمہارے حق میں دعائے مغفرت کریں تو (سنتے ہی نہایت معنی خیز انداز میں) اپنے سر پھیر لیتے ہیں۔..... (المنافقون ۱)

اور اس کی وجہ بالکل عیاں ہے۔ مغفرت و عدم مغفرت کے فلسفہ سے انہیں کیا لگاؤ تھا جس کا دین سونے چاندی کا سکہ اور جس کی شریعت خود غرضی ہو وہ اس امر پر غور ہی کیوں کرنے لگا کہ اس دنیوی فلاح و نجات کے ماسوا بھی کوئی شے ہے جس کے حصول کی تمنا کی جائے۔ یہ گردن پھیر لینا دراصل اسی حقیقت کا ایک مظہر ہے جس کو یہ منافق اپنے شیاطین سے یہ کہہ کر ظاہر کیا کرتے تھے اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَھْزِءُوْنَ (ہم تو مذاق کرتے اور ان مسلمانوں کو بیوقوف بناتے ہیں)۔

چونکہ اس قسم کے منافق بڑی تعداد میں موجود تھے اس لیے قرآن نے ان کے حالات بھی پوری تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ اب اپنے گرد و پیش نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ اس وقت بھی یہ روح نفاق کسی قالب میں موجود ہے یا نہیں؟ اس کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے آپ کو اپنے "قومی" اخبارات کے دفتروں، اپنی سیاسی انجمنوں، اپنے "ملی" زعماء کے خلوت خانوں اور صاحب بہادر کے شاہی ایوانوں کا جائزہ لینا چاہیے۔ وہاں آپ کو نظر آئے گا کہ رسول کی کامل اطاعت کو مذہبی جنون کہہ کر کس طرح اس کی تضحیک کی جاتی ہے۔ چند ٹکوں کے عوض مساجد کی حرمتیں کس طرح بیچ دی جاتی ہیں۔ مسلمانوں کے روبرو اپنی اسلامیت کا کیسا دلیرانہ اعلان کیا جاتا ہے اور پھر اپنے دلیسی اور بدیسی اولیاء کے سامنے کس طرح اسلام اور شعائرِ اسلامی کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور کس طرح انہیں اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَھْزِءُوْنَ کا یقین دلایا جاتا ہے۔ اگر مسلمانوں کا مجمع ہو تو فرمایا جاتا ہے کہ میں سب سے پہلے مسلمان ہوں پھر سب کچھ۔ لیکن جب غیر مسلموں کے ہاں پیشی ہوتی ہے تو اسی زبان اور اسی حلق سے صدا بلند ہوتی ہے کہ میں پہلے ہندوستانی ہوں پھر مسلمان۔ غریب مسلمان کا سلام قبول کرنا تو باعث ننگ ہے لیکن اعداء کے حق سے موالات رکھنا باعث صد افتخار سمجھا جاتا ہے۔ خدا کہتا ہے کہ عزت صرف میرے حضور میں ملتی ہے مگر یہ منافق کافروں کے ہاں عزت تلاش کرنے جاتے ہیں۔ آنکھیں کھول کر دیکھیے کہ آج کیا ہو رہا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ پیشانی پر آستانِ فرنگ کا نشانِ سجدہ لگائے بغیر کوئی "باعزت" کہلا سکے؟ آخر یہ والسرائے بہادر

سے ہاتھ ملانے کی تمنا میں عمر بسر کر دینے والا "مسلمان" کس سنت پر عمل کر رہا ہے؟ اس کے قلب میں وہ کونسی چیز ہے جو خدا کی اپنی حکومت کو جنگ کا خطرہ پیش آنے پر اس سے اعلان کراتی ہے کہ لَئِنْ قُوتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ[1] وہ کیا چیز ہے جو مسلمان کو گاندھی اور جواہر لال اور بوس کے آستانوں پر کشاں کشاں لے جاتی ہے اور جب ہندو اخبارات سے اس کو قوم پرستی کا سرٹیفکیٹ ملتا ہے تو وہ پھولا نہیں سماتا؟ پھر وہ مسلمان کس قرآن پر ایمان رکھتا ہے جو دن رات قال اللہ و قال الرسول کے ورد میں منہمک ہے لیکن جب کہا جاتا ہے کہ آؤ اس ظالمانہ اور غیر اسلامی نظام حکومت کو الٹ پھینکو تو پوری متانت اور تقدس مآبی کے ساتھ فرما دیتا ہے کہ لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنٰكُمْ[2] جب سود کی حلت کا فتویٰ پوچھا جاتا ہے تو ارشاد ہوتا ہے کہ بالکل جائز ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہندوستان دارالحرب ہے۔ لیکن اگر کوئی اللہ کا بندہ مطالبہ کر بیٹھے کہ آؤ اسے دارالاسلام بنائیں تو کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی جاتی ہیں اور بنی الاسلام علی خمس کی حدیث پڑھ کر اسی ہندوستان کو دارالاسلام یا کم از کم دارالامن ثابت کر دیا جاتا ہے۔ احکام الٰہی کی پیروی کا یہ حال ہے کہ اگر اپنا فائدہ ہو تب تو قرآن و سنت ہی سب کچھ ہے لیکن اگر اپنا نقصان ہو تو طاغوتی عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے۔ اسلامی قانون وراثت اس لحاظ سے تو نہایت موزوں اور عادلانہ ہے کہ اس کے ماتحت دوسرے کی لڑکی ہمارے گھر مال و جائداد لے کر آئے گی، لیکن اس لحاظ سے قطعاً غیر موزوں، نامناسب اور ناقابل عمل ہے کہ ہماری لڑکی ہمارا جمع کیا ہوا مال و اسباب لے کر پرائے گھر چلی جائے گی۔ غرض جدھر دیکھیے كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا[3] کا سماں پیش نظر ہے۔ یُرِیْدُوْنَ

---

[1] اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم ضرور تمہاری مدد کریں گے۔

[2] اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ واقعی لڑائی ہوگی تو ہم تمہارا ساتھ ضرور دیتے۔

[3] ان پر بجلی چمکتی ہے تو اس کی روشنی میں چند قدم چل لیتے ہیں اور جب تاریکی چھا جاتی ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اَنْ یَّتَحَاکَمُوْا اِلَی الطَّاغُوْتِ[1] اور رَاَیْتَ الْمُنٰفِقِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا[2]
کی قدیم سنت دہرائی جارہی ہے۔ یُعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا[3] کی کمین گاہیں موجود ہیں
اور ان کی آڑ سے خودغرضیوں اور نفس پرستیوں کے خوفناک بھیڑیئے نکل نکل کر پیکرِ ملت
کا خون چوس رہے ہیں۔ اور جب کہا جاتا ہے کہ خدا سے ڈرو اور آنے والی زندگی کا کچھ تو خیال کرو
تو معاً گردنیں اکڑ کر پھر جاتی ہیں اور اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ[4] کا جاہلی نشہ ایک ایک رگ و تنگٹے
پر چھا جاتا ہے۔

(۶) مسلمانوں کے حقوق سے فائدہ اٹھانے والے جب مدینہ میں اسلام کو کچھ طاقت اور ثبات
حاصل ہو چلا اور غزوات سے مال غنیمت بکثرت آنے لگا تو منافقوں کا ایک گروہ ایسا بھی پیدا ہو گیا
جو مسلمانوں کے حقوق میں اپنا حصہ لگانے کی غرض سے اظہار اسلام کیا کرتا تھا۔ یہ لوگ بھی اپنے
دوسرے ہم مشربوں کی طرح جہاد کی دعوت پر کنی کاٹ جایا کرتے تھے۔ بلکہ حد سے زیادہ بزدل
تھے اور دشمن کا نام سن کر کانپ جایا کرتے تھے۔ اس سے پہلے جس گروہ کا ذکر تھا وہ اپنی دورخی
پالیسی کی وجہ سے لڑائی کے موقع پر زیادہ ہراساں نہیں ہوا کرتا تھا۔ لیکن ان کا معاملہ ہی دوسرا
تھا جس کی تفصیل قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:۔

"اللہ تعالیٰ تم میں سے ان منافقوں کو خوب جانتا ہے جو لوگوں کو لڑائی میں جانے سے روکتے
ہیں اور اپنے بھائی بندوں سے کہتے ہیں کہ (لڑائی کے میدان میں کہاں جان دینے جاتے ہو)
ہماری طرف آؤ۔ اور وہ خود بھی لڑائی میں نہیں جاتے مگر بہت تھوڑی دیر کے لیے (تاکہ نام ہو جائے)۔"

---

[1] یہ لوگ (اداء ایمان کے باوجود) چاہتے ہیں کہ معاملہ کا فیصلہ خدا کی بجائے طاغوت سے کرایا جائے [2] تم دیکھتے ہو کہ (نقصان کے اندیشہ سے) یہ منافق تمہاری عدالت میں آنے سے رکتے ہیں [3] دنیا کی زندگی میں ان کی باتیں تمہارے لیے بہت ہی جاذب توجہ ہیں۔ [4] جھوٹی عزت کا خیال اسے گناہ پر اصرار کرنے کے لئے مجبور کرتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تمہارے معاملہ میں بڑے بخیل ہیں (اور تم سے یا تمہارے مقاصد سے ہمدردی نہیں رکھتے) جب خطرہ کا موقع آتا ہے تو تم انہیں دیکھتے ہو کہ تمہاری طرف وہ اس طرح شدت خوف سے ناچتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہیں جیسے کسی پر موت کی غشی طاری ہو۔ پھر جب خطرہ کی گھڑی گذر جاتی ہے تو وہ نہایت چرب زبانی کے ساتھ آتے ہیں تاکہ مال غنیمت میں حصہ بٹائیں۔ .... (باوجودیکہ لشکر اعداء محاصرہ اٹھا کر واپس جاچکا ہے لیکن اب تک یہ بزدل یہی خیال کئے بیٹھے ہیں کہ دشمن کی فوجیں ابھی نہیں گئیں۔ اور اگر یہ فوجیں پھر آموجود ہوں تو پھر ان پر وہی دہشت طاری ہونے لگے اور) تمنا کریں کہ اے کاش ہم (موقع جنگ سے دور) کہیں دیہات میں نکل جائیں اور وہیں سے بیٹھے بیٹھے تمہاری خبریں معلوم کیا کریں (احزاب ۲)

اس تفصیل کے اندر ان منافقین کی پوری تصویر موجود ہے۔ گو یہ گروہ، گروہ سابق کی طرح دوطرفہ فوائد حاصل کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا تھا لیکن تھا یہ بھی دنیا ہی کا پرستار اور اس کا نصب العین بھی مال کا حصول ہی تھا۔ اسی غرض سے وہ مسلمانوں میں شامل تھا اور جب کبھی ایسا موقع آتا کہ ان کا دہانِ آز صدقات یا غنیمت کے دیناروں سے نہ بھرتا تو یہ لوگ بہتان تراشیوں پر اتر آتے تھے۔ جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے:۔

"اور ان منافقین میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو صدقات کے بارے میں تم پر (ناانصافی اور جانب داری کے) اشارے کرتے ہیں۔ پھر اگر ان میں سے حسب خواہش انہیں دیا جائے تو خوش رہتے ہیں اور اگر ان کی خواہش کے بموجب حصہ نہ ملا تو بگڑ بیٹھتے ہیں" (توبہ ۔ ۷)

اسی طرح جب مسلح دشمنوں کا سامنا ہوتا تو یہ اپنی خلوت گاہوں میں جا چھپتے۔ اور جب لڑائی کی مشقیں محض غنائم لوٹنے تک ہی محدود رہتیں اس وقت یہ شیر بن کر گرجتے ہوئے گھروں سے نکل آتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے صاف حکم دیدیا کہ ایسے بے ایمانوں کو ہرگز ساتھ نہ لیجاؤ جو کل

مصیبت کی گھڑیوں میں عافیت کے گوشوں کے اندر چھپے بیٹھے تھے اور اب ایمان کی تلوار بنے میدان جنگ کے لیے بیچین ہو رہے ہیں صرف اس توقع پر کہ اس وقت ہاتھ سے دینا کچھ نہیں ہے جو کچھ ہے لینا ہی ہے۔ چنانچہ سفر حدیبیہ سے پیچھے رہ جانے والے لوگوں کے متعلق غزوۂ خیبر کے قریب وحی الٰہی آتی ہے کہ:۔

"جو لوگ (سفر حدیبیہ سے) پیچھے رہ گئے تھے جب تم (خیبر کی) غنائم حاصل کرنے جاؤ گے تو وہ تم سے کہیں گے کہ ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے دو۔ اس سے ان کی خواہش یہ ہے کہ حکم الٰہی کو بدل دیں (یعنی خدا حکم صادر کر چکا ہے کہ جو لوگ سفر حدیبیہ میں تمہارے ساتھ نہیں گئے تھے وہ غنائم خیبر سے کوئی حصہ نہیں پا سکتے اور یہ لوگ جہاد کرنے کے بہانے سے ساتھ ملنا اور چل کر حصہ بٹانا چاہتے ہیں) سو اے پیغمبر ان سے صاف صاف کہہ دو کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چلنے پاؤ گے۔ اللہ کا یہ پہلے ہی سے فیصلہ ہے"

لیکن ظاہر ہے کہ یہ چیز ان کی طبیعت پر کس قدر شاق تھی۔ وہ ایسے تر لقمہ کو منہ سے چھنتے ہوئے دیکھ کر بھلا کیونکر صبر کر سکتے تھے۔ چنانچہ قبل اس کے کہ عملاً یہ معاملہ درپیش ہو، اللہ عالم الغیب نے خود ہی کھول کر بتا دیا کہ اس وقت یہ لوگ کیا کہیں گے:۔

فَسَيَقُولُونَ بَلْ تَحْسُدُونَنَا (فتح - ۲) (یہ سن کر) یہ منافق کہیں گے (کہ خدا کا حکم تو فاک نہیں ہے) البتہ تم لوگ ہم سے حسد رکھتے ہو (کہ غزوہ میں جائیں گے تو ہم بھی مال و زر حاصل کر لیں گے)

غور فرمائیے کہ گھوم پھر کر بار بار ان کی نگاہ کس طرح اپنے اسی واحد نصب العین پر جا کر جمتی ہے۔ شکایت یہ نہیں ہے کہ تم ہمیں جہاد فی سبیل اللہ کے ثواب سے روک رہے ہو بلکہ یہ ہے کہ مال و متاع دنیا کی تحصیل میں ہمارے مزاحم کیوں ہو رہے ہو۔ اور جب یہ ان کا نقطۂ نظر تھا تو ظاہر ہے کہ وہ سفر

جہاد میں اپنے شریک نہ کیے جانے کی اس کے سوا کوئی دوسری وجہ نہ سمجھ سکتے تھے کہ مسلمان ان سے حسد رکھتے ہیں۔

ایسے منافقین کی آج اس دور میں بھی کوئی کمی نہیں ہے "حقوق مسلمین" کا شور مچانے والے مجاہدین کو کھرچ کر دیکھیے تو اندر سے کتنے ہی ایسے نکلیں گے جن کا ضمیر خود غرضیوں کی غلاظت سے اٹا ہوا ہو گا گھر کی چہار دیواریوں کے اندر کان لگا کر بیٹھیے تو اسلامی معتقدات، اسلامی نظریات، اسلامی روایات، اسلامی شعائر، اور اسلامی عبادات کا مضحکہ اڑاتے نظر آئیں گے لیکن جیسے ہی قدم باہر نکلنے کو ہوا، اسلام کا نقاب اٹھا کر سر سے پیر تک اوڑھ لیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ محض اسی طرح مسلمانوں کے نام سے حقوقِ ملازمت میں حصہ مل سکے گا اور اگر آج اس نقاب کو نوچ پھینکیں گے تو اسلام اور مسلمان کے نام پر جو "صدقہ" خداوندان فرنگ کی طرف سے ملتا ہے اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہ رہے گا۔ پھر ملازمت ہی پر کیا منحصر ہے اب سیاسیات اسلامی کی علمبرداری بلکہ اسلام کی دینی امامت تک اسی ترکیب سے حاصل کی جا رہی ہے۔ چونکہ دنیا نے جاہ و منصب کے یہی معیار قائم کر رکھے ہیں اس لیے یہ لوگ ان پر پورے اترنے کی سعی میں ہر دم کوشاں رہتے ہیں۔ اس وقت عملاً یہی لوگ دنیا میں اسلام کے ترجمان اور نمائندے بنے ہوئے ہیں اور یہ انہیں کی ترجمانی کا کرشمہ ہے کہ "اسلامی مفاد" اب دوسرا نام ہو گیا ہے مسلمانوں کے معاشی اور سیاسی حقوق کا۔ جب کوئی اسلام کا حقیقی اور دردمند و مخلص ترجمان اس گرم بازاریِ نفاق کے خلاف آواز اٹھاتا ہے اور اسلام کی واقعی ضروریات کو سامنے لاتا ہے تو یہ لوگ اس پر کینہ توزی اور حسد پروری کا الزام لگا کر اس کی زبان بندی کر دیتے ہیں بلکہ بعض اوقات قید و بند کی مصیبتوں میں مبتلا کر دیتے ہیں، اور خود بدستور اسلام کے نام پر اپنی اغراض کے لیے کام کرتے رہتے ہیں۔ مگر جب کبھی انہیں نام نہاد "حقوق" کے لیے تھوڑی بہت قربانیاں دینے کی ضرورت پیش آجاتی ہے تو آغاز سرما کے بادلوں کی طرح چھٹ جاتے ہیں اور دعائیں کرتے ہیں کہ کاش ہم اس وقت

لندن کے ہوٹلوں میں ہوتے اور وہیں بیٹھے بیٹھے ہندوستانی آگ و خون کی ہولی کا نظارہ اخبار کے صفحات پر کیا کرتے۔

(۷) جھوٹی شہرت کے حریص: بعض منافق ایسے بھی تھے جو مفت کی شہرت اور تعریف کے لالچ میں جمعیت اسلامی کی رکنیت کا اظہار کیا کرتے تھے۔ ان لوگوں کا ظہور غالباً اس وقت ہوا ہے جب اسلامی شوکت عرب کے افق سیاست پر غالب ہوتی جا رہی تھی اور مسلمان اپنی جاں فروشیوں کی بدولت اپنی تاریخ میں شاندار اور معجز نما کارناموں کا اضافہ کرتے جا رہے تھے۔ اُس وقت جس طرح بہتوں نے روپیہ پیسہ کے لالچ میں اپنے کو مسلمان ظاہر کرنے میں مصلحت دیکھی اسی طرح بعض نے پانچوں سواروں میں نام لکھانا اپنا مطمح نظر قرار دے لیا تھا لیکن کسی طرح کی قربانی نہ دینا بہرحال ان کے یہاں بھی ایک طے شدہ چیز تھی۔ وہ محض دوسروں کا خون لگا کر ہی شہید بننا چاہتے تھے۔ جیسا کہ قرآن کی یہ وعید قاہرہ بتلا رہی ہے:-

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَا	اور جو لوگ اپنے کیے پر خوش ہوتے ہیں اور چاہتے
اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا	ہیں کہ جو کام انہوں نے نہیں کیے ان پر ان کی تعریف ہو ایسے
لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ	لوگوں کے بارے میں تم ہرگز یہ مت خیال کرنا کہ وہ عذاب کی زد سے
مِّنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ	باہر ہیں بلکہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

ان پیش روؤں کے متبعین سے آج بھی ہماری جماعت خالی نہیں ہے۔ خصوصاً ہمارے سیاسی پلیٹ فارم پر تو جھوٹی شہرت کے ایسے دلدادوں کی کسی طرح کمی نہیں پھولوں کے ہار اور زندہ باد کے نعروں کی چاٹ نے لیڈروں کا ایک لشکر کا لشکر تیار کر دیا ہے جو قومی اجتماعوں میں اسلام اور قرآن کا نعرہ اتنے زور سے لگاتے ہیں کہ پوری قوم کا نہاں خانۂ عقیدت اس کے شور سے گونج اٹھتا ہے لیکن جس وقت زندہ باد کے نعروں کے بجائے دشمنانِ اسلام کی قہر آلود اور خشمگیں صدائیں کانوں

میں آنے لگتی ہیں تو یہ ضیغمانِ ملت گھر کی سب سے محفوظ کوٹھریوں میں جا گھستے ہیں۔ پھر جب عامۂ مسلمین کی
پامردیوں کے طفیل میدان کا کوئی گوشہ فتح ہوتا ہے تو پھر یہ لوگ اپنے پرانے جلالی روپ میں نمایاں
ہوتے ہیں اور مختلف حیلوں سے یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس فتح کا سہرا ہمارے ہی سر بندھے، اور سہر
زبان ہمیں مجاہدِ قوم اور شہیدِ ملت کے مقدس ناموں سے یاد کرے۔

(۸) دین و شریعت کا مذاق اڑانے والے | منافقین میں اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جو دینی
احکام و مناسک کا مذاق اڑاتے، اسلامی عبادات کا استہزا کرتے اور خود مسلمانوں کے اوضاع و اطوار اور
ان کے اعمال و کردار پر پھبتیاں کستے تھے۔ مثلاً ایک گروہ کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ:۔

وَإِذَا نَادَيْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا (مائدہ - ۹)

(اور جب تم نماز کے لیے اذان دیتے ہو تو یہ لوگ نماز کو ہنسی اور کھیل بناتے ہیں اور اس کا تمسخر کرتے ہیں)

اور یہ گروہ تھا کون؟ عام کفار اور اہل کتاب نہیں بلکہ وہ کفار اور اہل کتاب جو ایمان کے مدعی تھے
چنانچہ آگے چل کر قرآن ان کے حالات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:۔

وَإِذَا جَاءُوْكُمْ قَالُوْا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ (مائدہ - ۹)

اور جب یہ لوگ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم مومن ہیں حالانکہ کفر لے کر آئے تھے اور کفر ہی لے کر گئے

ان کا تمسخر صرف نماز کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ خدا کا ہر حکم، رسول کا ہر اقدام اور قرآن کی ہر آیہ
ان کے لیے دل لگی کا سامان بنی ہوئی تھی۔ البتہ وہ اس کا خاص اہتمام کرتے تھے کہ اُن کی ان حرکات
راز عامۂ مسلمین پر واشگاف نہ ہوا کرے کیونکہ انہیں اجتماعی احتساب کا خوف تھا۔ اور اگر کبھی ان کی
شرارتیں منظرِ عام پر آجاتیں اور ان سے پوچھ گچھ ہوتی تو کہتے کہ وہ کوئی سنجیدہ محفل تھوڑا ہی تھی، ہا
تو ہم یونہی ہنسی میں کر رہے تھے، ہمارے خلوصِ اطاعت اور رسوخِ ایمان پر ذرا شبہ نہ کرو۔ سورۂ توبہ
ان منافقوں کے اس ذخیرہ کا ذکر ان لفظوں آیا ہے:۔

(مسلمانو!) یہ منافق اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تمہیں راضی رکھیں، حالانکہ اللہ اور اس کا رسول اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ یہ لوگ ــ اگر یہ واقعی مومن ہیں ـــــــ تو اُن کو (اپنی مخلصانہ اطاعت سے) راضی کریں۔۔۔۔۔ منافق اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں ان (مسلمانوں) پر کوئی ایسی سورۃ نازل نہ ہوجائے جو انہیں ہمارے دلوں کی باتیں بتا دے۔ (اے پیغمبر! ان منافقوں) سے کہہ دو کہ (اچھا دین الٰہی کے ساتھ) استہزاء کر لو جس بات کا تمہیں ڈر ہے اللہ ضرور اسے ظاہر کر کے رہیگا۔ اور اگر تم ان لوگوں سے دریافت کرو کہ یہ تم کیسی حرکتیں کرتے ہو) تو وہ ضرور یہی جواب دیں گے کہ ہم تو یونہی بات چیت اور ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ اے پیغمبر (ان نامراد شریروں سے) کہدو کہ کیا تم ہنسی مذاق کرتے ہو اللہ کے ساتھ! اس کی آیات کے ساتھ! اور اس کے رسول کے ساتھ!" (ترجمہ)

یہ منافق زیادہ تر قرآن کی ان آیات کا مذاق اڑاتے تھے جن میں اللہ تعالیٰ اپنے اسرار غیب بیان کرتا ہے جن کی کنہ تک انسانی دماغ کسی طرح نہیں پہنچ سکتا یعنی وہ آیات جنہیں قرآن نے اپنی اصطلاح میں "متشابہات" سے تعبیر کیا ہے اور جن کے متعلق اس کا ارشاد ہے کہ وہ آزمائش کے لئے اتاری گئی ہیں "تاکہ جن کے دلوں میں عقل سلیم اور ایمان کا جوہر موجود ہے وہ بغیر کسی دلیل و حجت کے سر تسلیم جھکا دیں، اور جن کے اندر جاہلیت اور کفر و نفاق کی بیماری ہے وہ یا تو اپنے اوہام اور رجحانات کے مطابق اس کی تاویلیں کرنے لگیں، یا پھر پکار اٹھیں کہ مَاذَا اَرَادَ اللّٰہُ بِھٰذَا مَثَلًا (یعنی ان باتوں سے اللہ تعالیٰ کا مطلب آخر کیا ہے ؟)۔ چنانچہ سورۂ مدثر میں جہنم کی تصویر کھینچتے ہوئے، یہ بیان کرنے کے بعد کہ اس پر انیس[19] ملائکۂ عذاب تعینات ہیں، اللہ تعالیٰ اس انیس[19] کی تعداد کی تعیین کو ایک فتنہ قرار دیتا ہے اور اس کی مصلحت یہی بتاتا ہے کہ مومنین خالصین کے لیے تو یہ چیز ازدیاد ایمان کا باعث ہوگی لیکن جو کافر اور منافق ہیں ان کے دل کی بیماری کا حال کھل جائے گا:۔

"اور تاکہ جن کے دلوں میں (نفاق کا) مرض ہے اور جو کھلے منکر حق ہیں، بول اٹھیں کہ ایسی بات

کے بیان کرنے سے خدا کی غرض کیا ہے؟ (یہ تو کوئی معقول بات نہیں معلوم ہوتی)۔ (مدثر۔ رکوع ۱)

اللہ، رسول اور قرآن کے بعد اب عام مسلمانوں کے ساتھ ان کے استہزار کی داستان سنیئے۔

"یہی لوگ (یعنی یہی منافق) ہیں جو کھلے دل سے خیرات کرنے والے مسلمانوں پر تو انگلیاں اُٹھاتے ہیں (یعنی ان پر ریاکاری کا الزام لگاتے ہیں)، اور جو غریب مسلمان اپنی گاڑھی محنت (کی کمائی) کے سوا اور کوئی مقدور نہیں رکھتے ان کا یہ مذاق اڑاتے ہیں"۔ (توبہ - ۱۰)

چشمِ عبرت آج کیا دیکھ رہی ہے؟ ہمارے "تعلیم یافتہ" اور "نئی روشنی" کے دلدادہ حضرات کا طرزِ عمل کیا کہہ رہا ہے؟ اگر کتابِ الٰہی کا یہ ریمارک غلط نہیں ہے (جسے ابھی بیان کیا جاچکا ہے) تو ان "مسلمانوں" کے متعلق کیا تصور کیا جائے گا جن کی "آزادخیالی" (Free thinking) اور "عقلیت" (Rationalism) کی ابتدا ہی اذان اور نماز کے تمسخر سے ہوتی ہے، جن کے ذوقِ تجدد کی تسکین اسلامی سیرت وصورت پر پھبتیاں کسنے ہی پر منحصر ہے، جو قرآنی آیات کے ساتھ کھلے بندوں تمسخر کرتے ہیں، جو اپنی عقلیت کے زعم میں جن، شیطان، ملائکہ اور دوسری غیر مرئی چیزوں کی ہستی تسلیم کرنے کو وہم پرستی اور توہین عقل قرار دیتے ہیں، جو قرآن کی بیان کی ہوئی جنت اور دوزخ کی تفصیلات پر مذاحیہ مقالے لکھتے ہیں اور جو غیب کے حقائق مجردہ کو قرآنی تصریحات کی روشنی میں دیکھ کر چلا اٹھتے ہیں کہ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰہُ بِھٰذَا مَثَلًا؟ اگر نزولِ قرآن کے وقت اس قسم کا تمسخر کرنے والے "مسلمانوں" کو منافق کہا گیا تھا تو آج جو نام نہاد "مسلمان" وہی حرکات کر رہے ہیں انہیں کیوں نہ منافق کہا جائے؟

(۹) مسلمانوں کے ڈر سے اظہارِ ایمان کرنے والے | اب تک منافقین کے جن گروہوں کا ذکر تھا وہ سب کے سب یا تو کسی مادی منفعت کی خاطر اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے تھے یا اسلام اور مسلمانوں کی در پردہ بیخ کنی کرنے کے لیے مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہو جاتے تھے۔ لیکن ایک گروہ ایسے

منافقوں کا بھی تھا جو اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب اور مسلمانوں کی روز افزوں طاقت وشوکت سے مرعوب ہو کر مجبوراً اپنے اسلام کا اظہار کرتے تھے۔ جیسا کہ قرآن شہادت دے رہا ہے:۔

وَيَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنَّهُمْ لَمِنكُمْ وَمَا هُم مِّنكُمْ وَلَٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَفْرَقُونَ (توبہ۔۷)

اور یہ (منافق) خدا کی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ یہ تم میں سے ہیں (یعنی تمہاری ہی جماعت کے آدمی ہیں) حالانکہ یہ تم میں سے (ہرگز) نہیں ہیں۔ بلکہ یہ تو ڈرنے والے لوگ ہیں۔

یعنی جو چیز اندر سے اسلامیت کا اعلان کرا رہی ہے وہ کوئی یقین اور اذعان کا جذبہ نہیں ہے، بلکہ ان کی وہ بزدلی ہے جو انہیں دہشت زدہ کر کے مجبور کر رہی ہے کہ اپنے ایمان کا اور اسلامی ملت کی پیروی کا جھوٹا مظاہرہ کریں، کیونکہ انہیں خوف ہے کہ اسلامی شوکت کا یہ امنڈتا ہوا سیل بے پناہ جو تمام منکرین اسلام کو بے دست و پا کیے دے رہا ہے ایک دن انہیں بھی اپنی زد میں لے لے گا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب کبھی انہیں مسلمانوں کی طاقت و گرفت سے نکلنے کی کوئی صورت نظر آتی، فوراً وہ اسلامیت کا نمائشی جوا گردن سے اتار پھینکتے۔ چنانچہ مذکورہ بالا آیات کے بعد ہی آتا ہے کہ:۔

لَوْ يَجِدُونَ مَلْجَأً أَوْ مَغَارَاتٍ أَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا إِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُونَ (توبہ۔۷)

(ان بزدل منافقوں کا جو زبان سے ایمان ایمان چلاتے ہیں حال یہ ہے کہ اگر کوئی جائے پناہ پا جائیں یا چھپ بیٹھنے کے قابل، غار یا گھس بیٹھنے کی کوئی اور جگہ، تو سرکشانہ اس کی طرف دوڑ پڑیں۔

پس یہ اسلام، جس کا یہ بدکیش منافق اظہار کیا کرتے تھے، غرض اور مجبوری کا اسلام تھا اعتراف حق اور شرح صدر کا اسلام ہرگز نہ تھا۔ قرآن حکیم ایک جگہ اور زیادہ کھلے لفظوں میں کہتا ہے کہ:۔

قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُل لَّمْ

بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، اے پیغمبر! ان سے

تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (حجرات - ۲) کہہ دو کہ تم ہرگز مومن نہیں ہو۔ بلکہ یہ کہو کہ ہم "مسلمان" ہو گئے (یعنی بظاہر مطیع ہو گئے ہیں) اور ایمان کا تو ابھی تمہارے دلوں میں گذر تک نہیں ہوا۔

گویا ان کے ایمان کی بنا اور علت ان کی بزدلی تھی۔ دل تو صداقت قرآنی کے منکر تھے۔ لیکن طاقت کے خوف سے زبان اُس کی صداقت کا بار بار اقرار کرتی رہتی تھی۔ یہ وقت وہ تھا جبکہ خود مسلمانوں کی اپنی حالت بھی کچھ بہت زیادہ محفوظ اور قابلِ اطمینان نہ تھی۔ وہ ہر طرف دشمنوں سے گھرے ہوئے تھے۔ کفار و مشرکین کے ساتھ پیہم کشمکش جاری تھی جس میں کبھی مسلمانوں کا پلڑا بھاری ہوتا تھا اور کبھی دشمنوں کا۔ اُس وقت یہ بزدل منافق عجب گوگو کی حالت میں تھے۔ مسلمانوں میں شریک ہوتے تو دشمنانِ اسلام کا خوف انہیں کھائے جاتا تھا۔ اور کفار سے جا ملنے کا ارادہ کرتے تو مسلمانوں کی طاقت سے دم نکلا جاتا تھا۔ ان کے اس اضطراب کی پوری تصویر قرآن نے چار لفظوں میں کھینچ کر رکھ دی ہے:۔

وَيَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ (منافقون ۱) اور یہ منافق ہر نعرہ کی آواز پر چونک پڑتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انہیں پر کوئی آفت آ رہی ہے۔

ان نمائشی مسلمانوں کے جھوٹے ادعائے اسلام کا راز ایک اور صورت سے بھی فاش ہوا کرتا تھا اور وہ یہ تھی کہ یہ مسلمانوں پر اور پیغمبر صلعم پر احسان رکھتے تھے کہ ہم نے مسلمان ہو کر تمہاری جماعت کو تقویت دی ہے اور تمہاری تعداد بڑھا دی ہے يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا (حجرات - ۲) یعنی "یہ منافق تم پر اپنے اسلام لانے کا احسان رکھتے ہیں" حالانکہ اگر یہ واقعی مسلمان اور نعمتِ ایمانی کے قدر شناس ہوتے تو خود رسول کے احسان مند ہوتے۔

چونکہ یہ لوگ محض اسلامی سطوت کے دباؤ سے مجبور ہو کر اپنے اوپر مسلمانیت کا لبادہ سالوسی

ڈالے ہوئے تھے اس لیے اندر اندر یہ مسلمانوں کے سخت بد خواہ تھے۔ ان کی خوشحالی انہیں ایک آنکھ نہ بھاتی۔ انہیں مسلسل غلبہ اور تمکن حاصل ہوتے دیکھ کر ان کے کلیجوں پر سانپ لوٹنے لگتے، اور یہ دن رات اس تمنا میں رہتے کہ انقلاب روزگار کا کوئی جھونکا آئے اور ان مسلمانوں کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ کر پھینک دے تاکہ ہم ان کی قاہرانہ گرفت کے خطرات سے بے خوف ہو کر آزادی کا سانس لے سکیں۔ قرآن میں ان منافقوں کی اس داستانِ عداوت کا کئی جگہ ذکر ہے۔ سورہ آل عمران میں ہے۔

"جب یہ لوگ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم مومن ہیں، اور جب علیحدہ ہوتے ہیں تو (تمہاری ترقی اور برتری پر) مارے جلن کے دانتوں سے انگلیاں کاٹتے ہیں ....

اگر تمہارا بھلا ہوتا ہے تو انہیں رنج پہنچتا ہے اور اگر تمہیں کوئی گزند پہنچتا ہے تو ان کے دل کو خوشی ہوتی ہے۔ (رکوع ۱۲)

دوسری جگہ آتا ہے کہ :۔

"اگر تمہیں کوئی بھلائی نصیب ہوتی ہے تو ان (منافقوں) کو جلن ہوتی ہے اور اگر تم (کبھی) مبتلائے مصیبت ہوتے ہو تو (کوئی جماعتی ہمدردی تو خاک نہیں ہوتی بلکہ الٹا یہ) کہنے لگتے ہیں کہ (اسی خیال سے) ہم نے تو پہلے ہی سے اپنا معاملہ (ٹھیک ٹھاک) کر لیا تھا۔ (یعنی ہم نے پہلے ہی سے احتیاط کر رکھی تھی۔ پھر یہ خود غرضانہ بات کہکر) اٹھتے ہیں اور خوش خوش واپس چلے جاتے ہیں۔ ...... اے پیغمبر! ان کو (برملا) کہہ دو کہ تم ہمارے حق میں دو بھلائیوں میں سے ایک (نہ ایک) کا تو انتظار کرتے ہی ہو ...... الخ (توبہ۔ ۷)

"دو بھلائیوں میں سے ایک نہ ایک کا انتظار کرنے" کا مطلب یہ ہے کہ منافق ہمیشہ اس انتظار میں رہا کرتے تھے کہ دیکھیں مسلمان لڑائیوں میں فتح یاب ہوتے ہیں یا شکست کھاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو تلقین کرتا ہے کہ ان منافقوں کو سمجھا دو کہ ہمارے لیے تو فتح میں بھی بھلائی ہے اور شکست میں

بھی کسی صورت میں بھی ہم فلاح و سعادت سے محروم نہیں ہو سکتے۔ اگر مارے گئے تو شہادت کی ابدی زندگی نصیب ہوگی جو خوش بختی کی آخری معراج ہے۔ اگر مظفر و منصور لوٹے تو غازی اور مجاہد فی سبیل اللہ ہوں گے جس کے آگے شرف و مجد کا کوئی مقام نہیں۔ پھر ہمیں غم کاہے کا۔ تم ہمارے حق میں جس چیز کی بھی تمنا رکھو وہی ہمارے لیے باعث سعادت ہے۔ غم ہو تو تمہیں ہو کہ تمہارے لیے ہر طرف ہلاکت اور بدبختی کی آگ تیار ہے وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ أَنْ يُصِيبَكُمُ اللَّهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهِ أَوْ بِأَيْدِينَا۔ (توبہ ۔ ۷)

انتظار کرنے کو تو یہ ارباب نفاق مسلمانوں کے حق میں فتح و شکست دونوں ہی کا کرتے تھے کہ دیکھیں ان کا انجام کیا ہوتا ہے۔ لیکن کفر کا ظاہری کرّ و فر دیکھ کر انہیں گمان غالب یہی ہوتا تھا کہ مسلمان ہی لڑائی میں ہاریں گے اور اسی خوف سے کہ مبادا اس ہار کے تلخ نتائج ہمیں بھی بھگتنے پڑیں، وہ مختلف حیلوں بہانوں سے جہاد کی منادی سن کر گھر بیٹھ رہتے تھے جیسا کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے:۔

"اے پیغمبر! (سفر حدیبیہ سے) پیچھے رہ جانے والے بدوی (اب جبکہ تم زندہ و سلامت واپس آ گئے ہو) تم سے کہیں گے کہ (افسوس کہ ہم بوجہ مجبوری نہ جا سکے) ہمیں ہمارے اموال اور ہمارے اہل و عیال نے پھنسا رکھا تھا۔ سو ہمارے لیے خدا کے حضور میں مغفرت کی دعا فرمائیے۔ یہ لوگ اپنی زبان سے وہ باتیں کہتے ہیں جو در اصل ان کے دلوں میں نہیں ہیں .... (ان نابکاروں سے) کہہ دو کہ (غلط کہتے ہو) بلکہ (تم مارے ڈر کے پیچھے رہے اور) تمہارا گمان تھا کہ پیغمبر اور مسلمان (ضرور) اس لڑائی میں ہلاک ہو جائیں گے (اور) اپنے اہل و عیال میں کبھی لوٹ کر نہیں آنے کے ...... الخ" (فتح ۔ ۲)

قرآن کی دیگر تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف وہ مسلمانوں کے متعلق یہ ظن رکھتے تھے

بلکہ دل میں دعائیں کرتے تھے کہ کسی طرح یہ میدان جنگ میں کھیت ہو رہیں اور ہمارے سر سے بلا ٹلے ۔ سورۂ توبہ میں ہے :۔

" اور اکثر دیہاتی ایسے ہیں جو اگرچہ زبان سے قرآن کی صداقت پر بظاہر ایمان لا چکے ہیں لیکن) راہ خدا میں خرچ کرنے کو مفت کا تاوان سمجھتے ہیں اور تم مسلمانوں کے حق میں آسمانی گردشوں کے منتظر ہیں (کہ کاش کسی آفت میں پھنس کر تم ہلاک و برباد ہو جاؤ) ۱۱ رکوع ۔ ۱۲)

اس غرض کے لیے وہ اپنی جانی و مالی قربانیوں سے دریغ کرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی روکتے تھے تاکہ امداد کے تمام دروازے بند ہو جائیں اور ہر طرح سے ان مسلمانوں کو کمزور اور بے یار و مددگار کر دیا جائے ۔ سورہ منافقون میں ہے :۔

" یہی لوگ (یعنی یہی منافق) تو ہیں جو لوگوں سے کہا کرتے ہیں کہ رسول خدا کے ساتھیوں پر کچھ خرچ مت کرو کہ (آخر کار اس طرح افلاس سے تنگ ہو کر خود ہی) ادھر ادھر منتشر ہو جائیں گے " (رکوع ۔ ۱)

اسی طرح جانی قربانیوں سے بھی یہ لوگوں کو باز رکھتے تھے بلکہ بعض اوقات تو شروع میں مسلمانوں کے ساتھ مل کر میدانِ جہاد میں جاتے اور جب جنگ کی آگ بھڑک چکتی تو آہستہ سے خود بھی پیچھے کھسک جاتے اور دوسروں کو بھی بھاگ کھڑے ہونے کی ترغیب دیتے تاکہ مسلمانوں کی ہمتیں چھوٹ جائیں اور دشمن کے حوصلے بڑھ کر انہیں فنا کے گھاٹ اتار دیں ۔ غزوۂ احزاب میں اس شیطنت کا پورا پورا مظاہرہ ہوا تھا ۔ جس کا ذکر قرآن ان لفظوں میں کرتا ہے :۔

" اور (اے مسلمانو ! یاد کرو) اس وقت کو جب منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں (شک اور تذبذب کا) مرض تھا کہنے لگے کہ خدا اور رسول نے جو ہم سے (فتح و نصرت کا) وعدہ کیا تھا وہ نرا دھوکا ہی دھوکا تھا ۔ اور اس وقت کو بھی یاد کرو جب ان میں سے ایک گروہ کہنے لگا کہ

(اہل یثرب! اب دشمن کے مقابلہ میں) تمہارے لئے ٹھیرنے کا کوئی موقع نہیں پس تم میدان چھوڑ کر واپس چلے جاؤ۔ اور ان میں سے کچھ لوگ پیغمبر سے (گھر لوٹ جانے کی) اجازت مانگنے لگے یہ کہہ کر کہ ہمارے گھر غیر محفوظ پڑے ہیں حالانکہ وہ گھر غیر محفوظ نہیں تھے بلکہ ان کا مقصد صرف جان چھڑا کر بھاگنے کا تھا .... (اے مسلمانو!) اللہ تعالیٰ تم میں سے ان (منافقوں) کو اچھی طرح جانتا ہے جو لڑائی میں شریک ہونے سے (خود رکنے کے علاوہ دوسروں کو بھی) روکتے ہیں اور اپنے بھائی بندوں سے کہتے ہیں کہ (لڑائی میں کہاں جان دینے جاتے ہو) آؤ ہماری طرف (امن اور خوشی کی زندگی گزارو)۔ (احزاب ۔ ۲)

دوسرے مقام پر ہے:۔

" جو لوگ (اپنے اصرار کی وجہ سے لڑائی سے) پیچھے چھوڑ دیئے گئے وہ لوگ رسول اللہ کی مرضی کے خلاف لڑائی سے بیٹھ رہنے پر بہت خوش ہوئے اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان کے ساتھ جہاد کرنے کو انہوں نے گراں محسوس کیا اور دوسروں سے بھی کہنے لگے کہ ایسی بے پناہ گرمی میں گھر سے نہ نکلنا" (توبہ ۔ ۱)

غرض اشقیاء ازلی کا یہ بے ضمیر اور بزدل گروہ اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی میں اپنی کسی تدبیر کے استعمال سے دریغ نہ کرتا تھا لیکن چونکہ خودداری سے یکسر بے بہرہ تھا اس لیے اپنے دل کے اصلی رجحانات کی پردہ پوشی میں بڑی احتیاط اور تندہی سے کام لیتا تھا۔ ہاں اللہ عالم الغیب کی رازافشانیوں کا اس کے پاس کوئی علاج نہ تھا اور ہر لحظہ اسے اس امر کا کھٹکا لگا رہتا تھا کہ کہیں کوئی ایسی سورہ نہ نازل ہو جائے جو ہمارے باطن کو عام مسلمانوں کے سامنے کھول کر رکھ دے۔ یَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِىْ قُلُوْبِهِمْ (توبہ ۔ ۷) کیونکہ اگر ایسا ہوا تو اس نفاق اور سازش کے خوفناک عواقب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اور یہی وہ مصیبت عظمیٰ تھی جس کے لیے مکر و فریب کے انہوں نے اتنے

نقاب تیار کر رکھے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ سالقہ انسانی نگاہ اور بشری فہم و فراست سے نہ تھا کہ وہ اپنی تمناؤں اور کوششوں میں کامیاب رہتے بلکہ معاملہ تھا اس علیم سے جو انسانی دوربینیوں اور عیاریوں کے مقابلہ میں عالم الغیب والشہادہ اور بشری مکر بازیوں اور کید آرائیوں کے مقابلہ میں خیر الماکرین تھا۔ اس نے ہر ہر موقع پر ان کی شرارتوں کو طشت از بام کیا اور صاف صاف اعلان کر دیا کہ:۔

"کیا وہ لوگ جن کے دلوں میں (نفاق کا) مرض ہے اس خیال میں ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے دلی کینوں کو کبھی نہ ظاہر کرے گا؟ اے پیغمبر اگر ہم چاہتے تو تمہارے سامنے ان لوگوں کو اس طرح کھول دیتے کہ تم ان کی پیشانی دیکھ کر انہیں پہچان لیتے۔ اور (یوں بھی) تم ان کے اندازِ گفتگو سے تو انہیں پہچان ہی لیتے ہو" (محمدؐ - ۴)

منافقین کی یہ قسم غالباً اس وقت نہیں پائی جاتی، اور اس کی وجہ بالکل عیاں ہے۔ اسلام کا سیاسی اقتدار اور مسلمانوں کا شاہانہ دبدبہ و جلال تو اب افسانہ بنکر رہ گیا ہے جس کا ذکر تاریخ کے پرانے صفحوں سے باہر کہیں موجود ہی نہیں کہ خلافت الٰہی کے باغی اس کا خوف کھائیں اور اس قسم کی منافقانہ پالیسی اختیار کرنے پر مجبور ہوں۔ اور اگر کہیں اس عمومی دورِ شکست و ریخت میں چشمِ فلک سے بچ بچا کر مسلمانوں کی کوئی حکومت قائم ہے بھی تو اس کے نزدیک دینی تصورات اور معتقدات چنداں قابلِ اعتنا نہیں ہیں، بلکہ ان کی جگہ اب وطنی یا نسلی یا لسانی تعصبات نے لی ہے، پھر اس حکومت کے زیرِ اقتدار کسی شخص کو بربنائے مذہبیت نفاق اختیار کرنے کی حاجت ہی کیا ہے؟

(۱۰) ضعفاء: اب تک جن جن اقسام کے منافقین کا ذکر ہوا، وہ تو سب کے سب ایمان کی نعمت سے بالکل بے بہرہ تھے اور ہر ایک کو کسی نہ کسی غرض اور مصلحت نے ایمان کا محض خارجی اظہار کرنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ لیکن ان کے علاوہ ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی تھا جو منافقین کی مذکورہ بالا اقسام کی طرح ایمان سے بالکل خالی نہ تھے بلکہ کفر کی بہ نسبت ایمان سے قریب تر تھے۔ لیکن چونکہ

انہیں شرح صدر کی توفیق حاصل نہ تھی اور کڑی آزمائشوں کے وقت وہ اس عزم و ثبات سے عاری ثابت ہوتے تھے جو ایک حقیقی مسلمان میں ہونا چاہیے، اس لیے ہم تذکرۂ منافقین کے ضمن میں اس گروہ کے حالات اور اوصاف بھی روشنی میں لاتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ "مسلم" کا خطاب صرف انہیں کو دیتا ہے جو ایک ہاتھ پر نقد جاں اور دوسرے پر نقد مال لیے اس کی طلب رضا میں ہر وقت نکلنے کو تیار ہوں۔ ضعیف القلب اور عزیمت ناآشنا لوگوں کو اللہ اپنا مطیع اور فرماں بردار (مسلم) کہنا پسند نہیں کرتا بلکہ بعض اوقات تو انہیں اس نے صاف لفظوں میں منافق کہکر پکارا ہے۔ چنانچہ ایسے ہی ضعفا کی شان میں قرآن کہتا ہے :-

"اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے۔ لیکن جب انہیں راہ خدا میں کوئی گزند پہنچتا ہے تو انسانوں کی دی ہوئی تکلیف کو عذاب الٰہی (کے مانند ناقابل برداشت) تصور کرنے لگتے ہیں۔ اور اگر تمہارے پروردگار کی مدد آجائے تو یہی لوگ کہنے لگیں گے کہ ہم تو تمہارے ہی ساتھی تھے۔ کیا اللہ دنیا جہان کے لوگوں کے اسرار (قلوب) سے واقف نہیں ؟ اور وہ انہیں آزمائشوں میں ضرور ڈالے گا تاکہ جان لے (یعنی دنیا پر ظاہر کر دے) کہ کون (واقعی) صاحب ایمان ہے اور کون منافق ہے[1]" (عنکبوت - ۱)

یہاں جس آزمائش کی طرف اشارہ ہے وہ ہجرت کی آزمائش ہے جو چند دنوں بعد ہی مسلمانوں کو پیش آئی۔ یہ آزمائش بھی جان اور مال کی قربانیوں کی طرح نہایت ہی سخت ہے جس میں اچھے اچھوں کی ہمتیں چھوٹ جاتی ہیں۔ چنانچہ جب ہجرت کا صریح حکم آگیا تو کمزور ایمان والوں کے قدم پھسل گئے اور وہ مختلف حیلوں بہانوں سے مکہ ہی میں رہ گئے۔ یہ لوگ اگرچہ خدا کو ایک مانتے تھے

---

[1] واضح رہے کہ یہ آیات سورہ عنکبوت کی ہیں جو اس وقت نازل ہوئی تھی جب مسلمانوں کا قافلہ ستم کدۂ مکہ ہی میں جاگزیں تھا اور دشمنانِ الٰہی کے نت نئے مظالم کا تختۂ مشق بنا ہوا تھا۔ (بقیہ حاشیہ برصفحہ ۵۱ پر)

رسول کو برحق مانتے تھے، قرآن کی تلاوت بھی کرتے تھے اور نماز بھی پڑھتے تھے، اور اس لحاظ سے ملت اسلامیہ ہی میں شامل تھے، مگر چونکہ ان کا ایمان ایسا نہ تھا کہ خدا کی محبت پر اپنے گھر بار اور اہل وعیال اور ملک وطن کی محبت کو قربان کر دیتے اور اسلام سے ان کا تعلق ایسا مضبوط نہ تھا کہ جس وطن میں ان کو مسلمانہ زندگی بسر کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا اُسے چھوڑ کر اُسے چھوڑ کر نکل کھڑے ہوتے اور ہر اس جگہ جانے کے لیے تیار ہو جاتے جہاں وہ مسلمانہ زندگی بسر کر سکیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو سچے مسلمانوں سے الگ کر دیا ــــ ان کے اخلاقی درجہ اور قانونی حقوق دونوں کو اصلی مسلمانوں سے الگ کر کے رکھ دیا۔

"رہے وہ جو لوگ ایمان تو لائے مگر انہوں نے ہجرت نہیں کی ان کی دوستی اور ولایت سے تمہیں کوئی سروکار نہیں جب تک کہ وہ (بھی تمہاری طرح) ہجرت نہ کریں۔ ہاں اگر دین کے معاملہ میں وہ لوگ (کفار کے خلاف) تم سے مدد چاہیں تو تم پر ان کی مدد فرض ہے بشرطیکہ وہ گروہ جس کے خلاف وہ تم سے مدد طلب کریں پہلے تمہارے ساتھ کوئی معاہدہ نہ کر چکا ہو۔" (انفال ۷۲)

دیکھیے یہاں اگرچہ اللہ تعالیٰ کے اندازِ بیان سے ان ضعفاء کے خلاف وہ ناگواری نہیں ظاہر ہو رہی ہے جو کامل منافقوں کے بارے میں عموماً وہ ظاہر کیا کرتا ہے، لیکن وہ صاف طور پر فرق کرتا ہے اُن مسلمانوں میں جو اسلام لانے کے بعد دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر اسلام کو عزیز رکھتے ہیں، اور ان

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۸) کہ مظلومیت میں ایسے منافقین کا ظہور کہاں سے ہو سکتا تھا جو کسی غرض اور مصلحت کی بنا پر اظہار ایمان کرتے۔ اس وقت تو اسلام سیاسی اور سماجی ہر حیثیت سے مظلوم و مقہور تھا۔ اس کا نام لینا ہی ہر طرح کی اذیتوں کو دعوت دینا تھا۔ لہٰذا یہ بالکل ناممکن ہے کہ یہاں ان منافقوں کا ذکر مقصود ہو جن کی اقسام اور صفات کی تفصیل اوپر بیان کی جا چکی ہے۔ یہ دراصل اُن کمزور مسلمانوں کا ذکر ہے اور انہیں کو تغلیظاً منافق کہا گیا ہے جو اصحاب موسیٰ کی طرح کفار کی وحشیانہ ستم آرائیوں سے بے قرار ہو کر صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے تھے۔ چونکہ اب ایک عظیم الشان قربانی کی طلب کا وقت قریب تھا (یعنی ہجرت) اس لئے خدا نے ابھی سے زمین ہموار کرنی شروع کر دی تھی چنانچہ اس سورہ کا عمود ہی ہجرت کی تمہید ہے، اور یہ جو کہا گیا ہے کہ ہم آزمائش میں ڈال کر سچے اور جھوٹے مسلمانوں کو پرکھیں گے تو اس سے مراد یہی ترکِ وطن کی آزمائش ہے۔

مسلمانوں میں جن کے اندر اتنی اخلاقی طاقت یا اسلام کی اتنی محبت نہیں ہے کہ اس کی خاطر اہل وعیال اور گھر بار کو چھوڑ سکیں۔ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں اصل ملّت اسلامیہ پہلا گروہ ہے، نہ کہ دوسرا۔ وہ اسلامی جماعت کی حیثیت سے صرف پہلے گروہ کو خطاب کرتا ہے اور دوسرے گروہ کی حیثیت اس کی نظر میں صرف یہ ہے کہ محض ان کے اقرار اسلام کی وجہ سے وہ اسلامی جماعت کے ساتھ ان کا ایک گونہ تعلق تسلیم کرتا ہے۔ اور یہ "ایک گونہ تعلق" بھی کتنا حقیر ہے۔ ایمان لانے والے اور ہجرت اور جہاد کرنے والے مسلمان تو ایک دوسرے کے اولیاء ہیں۔ مگر ہجرت اور جہاد نہ کرنے والے مسلمان اِس برادری سے باہر ہیں۔ ان کے ساتھ "ولایت" کا کوئی تعلق نہیں ان کا حق صرف اتنا ہے کہ اگر مسلمان ہونے کی وجہ سے کفار ان کو ستائیں اور وہ اسلامی جماعت سے مدد مانگیں تو اسلامی جماعت پر فرض ہے کہ ان کی مدد کرے۔ لیکن اگر کفار سے اسلامی جماعت کا پہلے سے کوئی معاہدہ موجود ہو تو اس صورت میں اسلامی جماعت اپنے ان نام نہاد مسلمان بھائیوں کی کوئی مدد نہ کرے گی۔ کیونکہ جو مسلمان اپنے ایمان پر وطن اور قبیلہ کی محبت کو قربان نہیں کر سکتے وہ اتنی قیمت نہیں رکھتے کہ ملّت اسلامیہ ان پر سے اپنے معاہدات کو قربان کر دے۔

یہ تو اس قسم کے کمزور ایمان رکھنے والے مسلمانوں کی عمومی حیثیت ہے۔ اب رہے وہ مسلمان جو نہ صرف یہ کہ کفر کی حکومت میں کفار کے ساتھ رہتے ہیں، بلکہ کفار سے تعاون بھی کرتے ہیں، اور جب مسلمانوں سے کفار کا مقابلہ ہوتا ہے تو یہ ان کی فوجوں میں شریک ہو کر مسلمانوں سے لڑنے آتے ہیں، ایسے لوگوں کو قرآن مجید صاف الفاظ میں جہنم کی بشارت سناتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِیْٓ	اُن لوگوں سے جن کی جان فرشتے اس حال میں
اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِیْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا	نکالتے ہیں کہ وہ (کافروں کے خوف سے علانیہ حق
مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ	پرستی نہ کر کے اور پھر اس کے لئے ترک وطن نہ کر کے)

تَكُنْ أَرْضُ اللهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولٰئِكَ مَأْوٰهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ۔ (النساء ـ ۱۴)

اپنے اوپر آپ ظلم کر رہے تھے، فرشتے پوچھتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے؟ وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم وہاں دنیا میں بے بس تھے۔ فرشتے کہتے ہیں کہ کیا خدا کی زمین تمہارے لیے وسیع نہ تھی کہ تم (حق کی خاطر) اس میں کسی طرف ہجرت کر کے چلے جاتے (اور وہاں آزادانہ خدا کی پرستش کرتے) پس یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔

حضرت ابن عباس اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ مکہ میں کچھ لوگ اسلام کا اقرار کر چکے تھے لیکن کفار قریش کے خوف سے اس کا علانیہ اظہار نہیں کرتے تھے۔ مشرک انہیں اپنا ہی آدمی سمجھتے رہے آخر کار جب بدر کا معرکہ پیش آیا تو انہیں بھی طوعاً و کرہاً مشرکوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے مقابل آنا پڑا۔ بعض ان میں سے مارے گئے۔ ہنگامۂ کارزار فرو ہونے کے بعد جب ان کی نعشیں پہچانی گئیں تو مسلمانوں نے کہا کہ یہ تو ہمارے بھائی تھے، صرف کافروں کے مجبور کرنے سے جنگ میں شریک ہوئے تھے، آؤ ان کے حق میں اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کریں۔ اس پر یہ آیت اتری اور اس نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ جس مدعی ایمان نے استطاعت رکھتے ہوئے اپنی متاع ایمانی کی حفاظت کے لیے وطن کی محبت کو قربان نہ کیا اور جلا وطنی کی مصیبتیں سہنے سے منہ موڑا، اللہ تعالیٰ کی جناب میں اس کے ایمان کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اسے مومن اور مسلم کہنا ہی سرے سے غلط ہے۔

ایک موقع پر اسی حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ :۔

من جامع المشرك وسكن معه فانه مثله (ابوداؤد، کتاب الجهاد)

جو شخص مشرک کے ساتھ مل جل کر رہا وہ بھی اسی کے مانند ہے۔

دوسری جگہ حضور نے اور زیادہ کھلے لفظوں میں فرمایا ہے کہ :۔

انا بریٔ من كل مسلم

میں ہر اس مسلمان سے بری الذمہ ہوں جو مشرکوں کے

بین ظھرانی المشرکین۔ درمیان زندگی بسر کرتا ہو۔

غرض ایک مومن کامل کے لیے کسی ایسے ماحول میں ایک سانس لینا بھی جائز نہیں جہاں ہر طرف سے شرک و کفر اور ظلم و فسق کی فرمانروائی اسے گھیرے ہوئے ہو اور جہاں وہ خدا کی شریعت پر پورے طور سے عمل پیرا نہ ہو سکتا ہو۔ جو شخص ایسے ماحول میں بلا کسی مجبوری کے برضا و رغبت زندگی کے دن گذار رہا ہو اس کے ایمان کا کوئی اعتبار نہیں۔ مسلمان کے لیے سلامتی ایمان کی بس یہی صورت ہے کہ یا تو اس ماحول سے نکل جائے، یا اگر کوئی ملجا و مامن نہ رکھتا ہو تو اس سے لڑنے اور اس کو بدلنے کی کوشش میں جان دے دے۔

انہیں ضعفار کی صف میں وہ مسلمان بھی شامل ہیں جو جہاد کی منادی سن کر بیٹھے رہتے تھے۔ قرآن ان کو بھی منافقین میں شمار کرتا ہے اگرچہ وہ نمازیں پڑھتے تھے، روزے رکھتے تھے، حج اور زکوٰۃ بھی ادا کرتے تھے:۔

"کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا کہ (ابھی لڑائی سے) اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو (یعنی سر دست محض) نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو۔ (سو یہ احکام تو وہ بخوبی ادا کرتے رہے) مگر جب ان پر جہاد فرض کیا گیا تو ان میں سے ایک گروہ آدمیوں سے (یعنی دشمنوں سے جو بہر حال انہیں جیسے انسان تھے) اس طرح ڈرنے لگا جس طرح اللہ سے ڈرنا چاہیئے، بلکہ اس سے بھی زیادہ، اور کہنے لگا خدایا! تو نے ہم پر جہاد کیوں فرض کر دیا؟ ہمیں تھوڑی مہلت اور کیوں نہ دی ...." (النساء ـ ۱۱)

دیکھو یہاں اس امر کی صراحت موجود ہے کہ یہ لوگ قرآنی احکام و نواہی سے بالکلیہ منحرف نہیں تھے بلکہ نماز و زکوٰۃ کی ادائیگی اور ایسے ہی دوسرے احکام کے بجالانے میں دوسرے مسلمانوں سے کسی طرح کم نہ تھے۔ لیکن جب لڑائی کا وقت آتا تو وہ میدان جنگ کے خوفناک مناظر و مصائب

کا تصور کر کے کانپ اٹھتے اور ایمان کی کمزوری دلوں سے نکل کر چہروں پر جھلکنے لگتی۔ غزوۂ احد میں کسی طرح طوعاً و کرہاً یہ لوگ بھی میدان جنگ تک پہنچ گئے تھے۔ جب تک مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا یہ مطمئن رہے۔ مگر جب کفار کا پہلو غالب ہونے لگا، اور لشکر اسلام میں انتشار برپا ہوا تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے:۔

"انہیں بس اپنی جانوں ہی کی فکر لگی ہوئی تھی۔ اللہ کے متعلق ناروا اور جاہلیت کے زمانہ کا سا گمان کر رہے تھے۔ کہتے تھے کہ کیا ہمیں بھی کچھ اختیار ہے؟ (اے پیغمبر) ان سے کہہ دو کہ سارا اختیار تو اللہ کے ہاتھ ہے۔ (محض اتنا ہی نہیں بلکہ) وہ اپنے دلوں میں اور باتیں بھی چھپائے ہوئے ہیں جنہیں صاف صاف ظاہر نہیں کرتے۔ دل میں کہتے ہیں کہ اگر ہمارا اختیار ہوتا تو (نہ ہم یہاں آتے اور) نہ ملے جاتے ...." (آل عمران - ۱۶)

غزوۂ تبوک کے وقت بھی (جس میں بڑے سخت معرکہ کا اندیشہ تھا، اس جماعت نے یہی پارٹ ادا کیا۔ جب اعلان ہوا کہ سب لوگ جہاد کے لئے نکلیں تو یہ لوگ جی چرانے لگے۔ خدائی عتاب آیا:۔

"اے ایمان والو! (یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے راہِ خدا میں نکلنے کے لیے کہا جاتا ہے تو زمین تمہارے پاؤں پکڑ لیتی ہے۔ کیا تم آخرت کو چھوڑ کر صرف دنیا کی زندگی پر قانع ہو؟ ......" (توبہ — ۱۶)

کچھ تہدید آمیز تلقین کے بعد پھر انہیں لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:۔

"اگر کوئی قریبی فائدہ اور متوسط درجہ کا سفر ہوتا تو یہ لوگ تمہارا ساتھ ضرور دیتے، لیکن یہ مسافت انہیں بہت دور کی معلوم ہوئی (اس وجہ سے تمہاری دعوت جہاد سن کر باہر نہیں نکلے) اور جب بعد میں تم اس کا سبب پوچھوگے تو قسمیں کھا کر کہیں گے کہ اگر ہم سے بن پڑتا تو ضرور تمہارے ساتھ نکلتے۔ یہ لوگ (اپنی اس روش سے خود) اپنے تئیں ہلاک کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ اے پیغمبر تمہیں اللہ تعالیٰ معاف کرے، تم نے انہیں پیچھے رہ جانے کی اجازت کیوں دی؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پیچھے رہ جانے کی اجازت صرف وہی لوگ مانگتے ہیں جو (دراصل) اللہ پر اور روزِ قیامت پر ایمان نہیں[۵] رکھتے اور ان کے دل شک میں پڑے ہیں اور وہ اپنی اس حالتِ شک میں حیران ہیں (کہ کیا کریں کیا نہ کریں)۔ (توبہ - ۶)

یہ ایک مکمل تصویر ہے ان ضعیف الایمان لوگوں کی جو محض نماز روزہ سے آگے بڑھنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ ہمیشہ تن آسانی اور سکون و عافیت کے جویا تھے اور جب لڑائی کا وقت آتا تو کہتے کہ

---

[۵] سورۂ توبہ کی جن آیات کا ترجمہ اوپر نقل کیا گیا ہے ان پر ایک نگاہ ڈال کر پھر غور کرو۔ پہلے تو ان لوگوں کو "یاَیُّھَا الَّذِینَ اٰمَنُوا" کے الفاظ سے خطاب کیا گیا ہے۔ پھر آگے چل کر انہیں کے متعلق یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ "پیچھے رہ جانے کی اجازت صرف وہی لوگ مانگتے ہیں جو اللہ پر اور روزِ جزا پر ایمان نہیں رکھتے"۔ (اِنَّمَا یَسْتَاذِنُكَ الَّذِینَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ)۔ ان دونوں آیتوں پر غور کرنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ یہ لوگ نہ تو بالکل کافر اور حقیقی منافق تھے نہ کامل مسلمان۔ یعنی پہلے جو انہیں ایمان والو کہکر خطاب کیا گیا ہے وہ اس امر کی دلیل ہے کہ وہ سرحدِ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں اگرچہ بالکل کنارے ہی کھڑے ہیں۔ اسی طرح دوسری جگہ جو "لا یومنون" فرمایا گیا ہے وہ اس بات کا اعلان ہے کہ ان کے دلوں میں ایمان خاطر خواہ ابھی اترا نہیں ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ایسے ہی لوگوں کو مخاطب کر کے قرآن کہتا ہے کہ:-

یٰاَیُّھَا الَّذِینَ اٰمَنُوا اٰمِنُوا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ (النساء - ۱۹) اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر۔

یہ آیت صاف بتا رہی ہے کہ کمزور ایمان والوں کو بھی اللہ تعالیٰ ایمان والے کہکر خطاب کرتا ہے ورنہ جو راسخ الایمان ہیں ان سے ایمان لانے کا مطالبہ کیا معنی رکھتا ہے۔

دراصل یہ قرآن کا ایک عام اسلوبِ بیان ہے کہ وہ ایک فعل کے مختلف مدارج قرار دے کر کبھی تو اس کے ابتدائی درجے کا لحاظ کر کے اس فعل کو استعمال کرتا ہے اور کبھی انتہائی درجہ پیشِ نظر ہوتا ہے۔ گو ہر مقام پر لفظ ایک ہی ہوتا ہے لیکن سیاق و سباقِ کلام اس کے معنی کی تعیین کرتا ہے۔ آیاتِ مذکورہ بالا میں لفظ "ایمان" کے دو مختلف استعمالات میں یہی نکتہ پنہاں ہے۔

لَا تَنْفِرُوْا فِی الْحَرِّ (گرمی بڑی شدید ہے اس وقت لڑائی کے لیے نہ نکلو) لیکن اللہ تعالیٰ بار بار انہیں متنبہ کرتا ہے کہ عافیت کوشی اور تن آسانی کی یہاں کوئی گنجائش نہیں۔ اگر سورج کی گرمی سخت ہے تو یاد رکھو کہ دوزخ کی گرمی اس سے کہیں سخت تر ہے (قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا)۔ اس طرح جی چرا کر تم کوئی اپنا بھلا نہیں کر رہے ہو بلکہ درحقیقت اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہو۔

یہ ضعف ایمان، جس کو قرآن نے نفاق کے شعبوں میں سے ایک شعبہ قرار دیا ہے، اس وقت دنیا کے مسلمانوں پر ایک بلائے عام اور مرض مزمن کی حیثیت سے چھایا ہوا ہے۔ ضعف ایمان کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی مسلمان نہ ہو، یا خدا اور رسول اور قرآن اور آخرت کو نہ مانے، یا نماز اور روزہ اور حج وغیرہ ارکان و فرائض دینی سے انکار کرے۔ دراصل ضعف ایمان نام ہے اس چیز کا کہ آدمی کو اپنا ایمان اور اپنا اسلام اتنا عزیز نہ ہو کہ اس کی خاطر وہ اپنے آرام، اپنی آسائش، اپنے مال، اپنی جان اور نفسانی اغراض کو قربان کر سکے۔ ضعف ایمان کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود کفر کے غلبہ و تسلط کو قبول کر لے اور اُس کے ماتحت رہ کر صرف اُس قدر اسلام پر قانع و مطمئن ہو جائے جسے کفر کی حکومت گوارا کر سکتی ہو۔ ضعف ایمان سے مراد یہ ہے کہ آدمی زبان سے تو خدا کے قانون کی برتری کا اقرار کرے، مگر عملاً خدائی قانون کو زمین میں نافذ کرنے کی ذمہ داری سے جی چرائے، بلکہ خود اُن قوانین کے تحت زندگی بسر کرنے پر راضی ہو جائے جن سے خدا راضی نہیں ہے۔ یہ ہے ضعف ایمان کی تعریف۔ اس تعریف کو نگاہ میں رکھیے اور پھر زمین کے ایک ایک گوشہ پر نظر ڈال کر دیکھیے کہ کس جگہ کے مسلمان ضعف ایمانی کے اس داغ سے اپنا دامن محفوظ رکھ سکے ہیں اور شیطانی قوانین کی گرفت سے آزاد ہو کر صحیح معنوں میں اسلامی زندگی بسر کرنے کی آزادی حاصل کیے ہوئے ہیں؟ کیا ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کو یہ آزادی حاصل ہے؟ کیا جاوا کے ساڑھے تین کروڑ، ملایا کے پچپن لاکھ، سیام

کے پانچ لاکھ اور چین کے پانچ کروڑ مسلمان اسلامی زندگی بسر کر رہے ہیں؟ کیا روس کے دو کروڑ، یوگوسلاویہ کے سولہ لاکھ، رومانیہ کے تین لاکھ، البانیہ کے سات لاکھ، شام کے سولہ لاکھ، الجزائر کے تریسٹھ لاکھ، مراقش کے ستر لاکھ، ٹیونس کے بائیس لاکھ، طرابلس کے سات لاکھ، حبشہ کے چالیس لاکھ، سوڈان کے پچاس لاکھ اور نائجیریا کے ایک کروڑ مدعیان اسلام پر الٰہی قانون نافذ ہے؟ کیا کویت، بحرین، قطار، کینیا، زنجبار، سومالی لینڈ، جنوبی افریقہ، بورنیو، قبرص، فلسطین، شرق اردن، عدن اور حضرموت پر قرآن حکومت کر رہا ہے؟ اور اگر صاف گوئی سے کام لیا جائے تو کیا خود نام کی مسلمان حکومتوں ترکی، عراق، ایران اور مصر وغیرہ میں واقعی اسلام کی حکومت قائم ہے؟ غور کیجئے اس زمین کا کونسا خطہ ہے جہاں مسلمان بستے ہیں اور ان پر مغربی شیاطین براہ راست یا ان کے قوانین فرمانروائی نہیں کر رہے ہیں؟ کتنے مسلمان ایسے ہیں جو خداوند عالم کے سوا کسی کے بندے نہیں ہیں اور کتنے ایسے ہیں جن کے خدا حقیقت میں اسٹالین، مسولینی، چرچل، پتیان، فرانکو اور دوسرے ائمۂ کفر و جہل بنے ہوئے ہیں؟ پھر ان مسلمانوں کا شمار آخر کن میں ہوگا؟

فرض کرلو کہ یہ سب کے سب بڑے دین دار ہیں۔ ان کی ایک وقت کی نماز بھی قضا نہیں ہوتی، زکوٰۃ اور حج کے فریضہ سے بھی یہ غافل نہیں۔ مگر قرآن سے پوچھیے کہ اس نماز اور اس روزے اور حج و زکوٰۃ کی کیا قدر و قیمت ہے۔ اوپر آپ پڑھ چکے ہیں کہ جن مسلمانوں نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت نہ کی تھی، اور اپنے وطن میں کفار سے مغلوب ہوکر رہنا گوارا کرلیا تھا ان کو قرآن نے "اپنے نفس پر ظلم کرنے والا" قرار دیا اور جہنم کی وعید سنائی، اللہ کے رسول نے ان کو کفار کے مثل قرار دیا اور ان سے بری الذمہ ہونے کا اعلان فرمایا۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ نماز نہ پڑھتے تھے یا روزہ نہ رکھتے تھے۔ بلکہ صرف یہ وجہ تھی کہ انہوں نے کیوں کفر کے ماحول کو بدلنے یا بصورت دیگر اس ماحول سے ہجرت کر جانے کی قربانی نہیں دی اور

کیوں وطن اور اہل وعیال کی محبت میں گرفتار رہ کر غیر اسلامی زندگی بسر کرنے پر قانع رہے یقین کیجیے خدا کی سنت بے لاگ اور اس کا قانون ناآشنائے تغیر ہے۔ اگر دنیا کے یہ بے شمار انسان، جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، کفر و شرک کی اس عالمگیر سلطنت کو جس کے تحت وہ زندگی گزار رہے ہیں، الٹ پھینکنے کے لیے بے چین نہیں ہیں، اگر وہ ان طاغوتی طاقتوں سے جو انہیں دبائے ہوئے ہیں ٹکر لینے کے تصور سے سہمے جا رہے ہیں، اگر وہ تن آسانی کے خلوت کدوں میں بیٹھے ہوئے لَا تَنْفِرُوا فِي الْحَرِّ کا ورد کر رہے ہیں، اگر وہ بزدلی کی دلدل میں پھنسے ہوئے لَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ کی الٹی تاویلیں کر رہے ہیں، اگر ان کے ایمان کی افسردگی خلافت الٰہی کے قیام کا احساس کھو چکی ہے، اور اگر دنیوی تعلقات کی دلفریبی انہیں غیر اسلامی ماحول میں غیر اسلامی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر رہی ہے، تو ان تمام انسانوں کو، خواہ وہ چالیس کروڑ نہیں چالیس ارب ہی کیوں نہ ہوں، خدا کی بے نیاز بارگاہ وہی فیصلہ سنائے گی جو مکہ سے ہجرت نہ کرنے والوں کو اس نے سنایا تھا، اور جب تک وہ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اور اَلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ کے درمیان پڑے لٹک رہے ہیں اس وقت تک ان کی شب بیداریاں، ان کی صوم و صلوٰۃ کی ساری پابندیاں، ان کی لمبی لمبی تسبیحیں اور ان کے خوشنما مصلے کچھ کام نہ آسکیں گے اور انا بری من کل مسلم بین ظهرانی المشرکین کی وعید ان سب کو اپنی گرفت میں لے کر رہے گی۔

لیکن بدقسمتی سے معاملہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ مسلمانوں کو ضعف ایمانی کی سزا صرف اتنی ہی نہیں بھگتنی پڑ رہی ہے کہ غیر قرآنی نظام زندگی ان پر مسلط ہے، بلکہ وہ لعنتیں بھی برداشت کرنی پڑ رہی ہیں جن کو بدر کے معرکہ میں ان ضعیف الایمان لوگوں نے اٹھایا تھا جو مکہ میں کفار سے مغلوب ہو کر رہنے کی وجہ سے بالآخر مجبوراً مسلمانوں کے مقابلہ میں لڑنے کے لیے آگئے تھے جنگ

عظیم میں آپ نے کیا دیکھا؟ یہی ناکہ انگریز بہادر کے غلام "مسلمان" اس کی استعماری خواہشات کی حمایت میں میدان جنگ میں بھیجے گئے اور نہ صرف جرمنی کے منکرین اسلام کے خون سے ہی ان کی تلواریں رنگین ہوئیں بلکہ ٹرکی کے مسلمانوں کے کلیجے بھی ان کی گولیوں سے چھلنی ہوئے۔ اور اس گذری ہوئی داستان کو بھی جانے دیجیے۔ ابھی کل فرانکو نے مراکش کے لاکھوں عربوں سے کس شے کی حمایت میں تلوار اٹھوائی تھی؟ اور آج لیبیا میں، مصر کی سرحدوں پر، اطالوی فرعون عربوں کی جبری فوجی بھرتی کس مقصد کے لیے کر رہا ہے؟ ہندوستان میں تمام اقوام ہند کے ساتھ مسلمانوں کے گرد بھی فوجی بل کا حصار کن اغراض کی خاطر کھینچا گیا ہے؟ کیا تمہارا گمان ہے کہ لوائے کفر کے زیر سایہ لڑ کر جاہلیت کی قوت کو بڑھانے والے "مسلمان" اس لیے معذور سمجھا جائے گا کہ وہ اس کے لیے مجبور تھا؟ مکہ کے ضعیف الایمان لوگوں نے بھی تو یہی عذر پیش کیا تھا کہ ہم مجبور تھے (كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ) مگر کارکنان قضا و قدر نے آتشکدۂ جہنم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کو فیصلہ سنا دیا کہ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا۔

آج ہر چہار طرف کفر کا عالم آشوب طاری ہے۔ مسلمانوں کو مسلمانہ زندگی بسر کرنے کا کہیں سامان نظر نہیں آتا الا ماشاء اللہ۔ مسلمان مجبور ہیں کہ انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کے سانچے میں اپنی زندگی ڈھالیں حتیٰ کہ جب ضرورت ہو تو اسی قانون اور اسی غلبۂ کفر کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی گردنیں بھی وقف کر دیں۔ اس ہمہ گیر عالم آشوبی میں قرآن کی روح بے تابانہ چلا رہی ہے اور مسلمانوں سے مطالبہ کر رہی ہے کہ اٹھو، یا تو زمانہ سے لڑ کر اس کے رخ کو جاہلیت سے اسلام کی طرف پھیر دو یا نہیں تو اس مقصد کے لیے اپنی مادی ہستیوں کو فنا کر دو، اور اگر اس کی واقعی مقدرت نہیں رکھتے تو چھوڑ دو گھر بار، اہل و عیال اور نسل و وطن کے ان رشتوں کو، اور جہاں کہیں تمہیں اس پہنائے عالم میں آزادانہ اسلامی زندگی بسر کرنے کا موقع نصیب ہو، ہجرت کر جاؤ۔ اور اگر انسانی آبادیوں

میں سے کوئی آبادی بھی تمہیں اس مقصد کے لیے جگہ دینے سے انکار کرے تو یاد رکھو کہ پھر بھی تمہارے لیے جائز نہیں کہ اسی غیر اسلامی زندگی کے گذر بسر پر قانع ہو جاؤ۔ نہیں، اصحاب کہف کی راہ اختیار کرو ورنہ عذابِ الہٰی کا مزہ چکھنے کے لیے تیار رہو کہ اس انکار اقرار نما کا جس کے تم مرتکب ہوتے ہو، خدا کے نزدیک کوئی اعتبار نہیں۔ مگر روح قرآنی کی اس پکار پر، یا یوں کہیے کہ حالات حاضرہ کے مقتضیات پر کان کون دھر رہا ہے؟ مشرق سے مغرب تک ہر جگہ ایک عام بے حسی اور مدہوشی طاری ہے۔ اسلام کے عشق میں سر دھڑ کی بازی لگانے کا سودا دماغوں سے نکل چکا ہے۔ مجاہدانہ اسپرٹ عنقا ہو رہی ہے۔ گھربار کی محبت، دینوی رشتوں کی بندشیں، اور نفس کی کمزوریاں دل میں جہاد و ہجرت کا تصور تک نہیں آنے دیتیں۔ جہاد اور ہجرت کا نام سن کر موت کی غشی چھا جاتی ہے۔ جدھر دیکھیے "حاملین قرآن" بغیر کسی احساس ناگواری کے کفر اور اہل کفر کے زیر سایہ زندگی گذار رہے ہیں۔ تن آسانی اور امن پسندی کا گھن ملت کے ایک ایک عضو کو کھوکھلا کر چکا ہے۔ کیا اس کھوکھلے ایمان کا بھی خدا کے ہاں کوئی وزن ہے؟

(۱۱) دو رخے لوگ قرآن میں ایک ایسے گروہ کا بھی ذکر موجود ہے جو اعتقادی حیثیت سے توحید پرستی اور شرک کے بیچ میں معلق تھا۔ یہ لوگ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا اقرار تو کرتے تھے، اور اللہ کی عبادت کے بھی منکر نہ تھے، مگر ہنوز ان کے دلوں سے اَرْبَابٌ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ کی عظمت کے نقوش محو نہ ہوئے تھے۔ ان کا حال یہ تھا کہ جب تک فائدہ رہتا، خدا کی عبادت کرتے رہتے۔ اور جب کوئی مصیبت آتی تو خدا کے سوا ہر اس مخلوق سے دعائیں مانگنے اور منتیں کرنے لگتے جس سے ان کو حاجت روائی کی توقع ہوتی۔ قرآن ان لوگوں کے حق میں کہتا ہے:-

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ	اور بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کی عبادت کرتے
عَلٰى حَرْفٍ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُنِ اطْمَاَنَّ	تو ہیں مگر تذبذب کے ساتھ، یعنی اس طرح کہ اگر

عَلٰی وَجْهِهٖ خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ ۝ یَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَضُرُّهٗ وَمَا لَا یَنْفَعُهٗ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِیْدُ ۝ یَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ لَبِئْسَ الْمَوْلٰی وَلَبِئْسَ الْعَشِیْرُ (الحج - ۲)

انہیں کوئی فائدہ پہنچا تب تو مطمئن ہے اور اگر کوئی مصیبت آ پڑی تو الٹے منہ پھر گئے۔ دنیا اور آخرت دونوں سے گئے، اسی کا نام خسران مبین (کھلا نقصان) ہے۔ یہ لوگ (مصیبت کے وقت) خدا کو چھوڑ کر اُن سے دعائیں مانگنے لگتے ہیں جو نہ تو ان کو نفع پہنچانے کی قدرت رکھتے ہیں نہ نقصان پہنچانے کی۔ یہی ہے پرلے درجے کی گمراہی۔ یہ لوگ (مصیبت کے وقت خدا کو چھوڑ کر) اُنہیں پکارتے ہیں جن کا نقصان ان کے نفع کی بہ نسبت زیادہ یقینی ہے۔ کیا ہی برا ہے رب، مولیٰ (یعنی مرجوع الیہ) اور کیا ہی برا ہے یہ ساتھی (یعنی رجوع کنندہ)۔

اگرچہ اس گروہ کے لیے قرآن میں لفظِ منافق استعمال نہیں ہوا ہے، لیکن ان کی جو حالت بیان فرمائی گئی ہے وہ نفاق کی تعریف میں آجاتی ہے۔ یہ ایک طرف خدا کا اقرار اور اس کی عبادت کرتے ہیں اور دوسری طرف غیر خدا کو حاجت روا بھی بناتے ہیں، یعنی ایک راستہ سے اسلام میں داخل ہوئے اور دوسرے راستہ سے نکل گئے۔ اسی کا نام نفاق ہے۔

شرک اور توحید کا یہ جوڑ بھی کیسا عجیب ہے۔ اللہ تعالیٰ کو الٰہ واحد بھی تسلیم کرنا اور پھر دوسروں کو قاضی الحاجات بھی سمجھنا، یہ تو العجبی یقیناً ہمارے لیے بڑی ہی حیرت کی چیز ہوتی اگر آج ہماری آنکھوں کے سامنے "بزرگوں" کی قبریں اور پیروں کی خانقاہیں نہ ہوتیں۔ ہر صبح اور ہر شام ایک دو نہیں لاکھوں "مسلمانوں" کو ہم دیکھتے ہیں کہ ابھی وہ اللہ وحدہ لاشریک لہ کے آگے سر جھکاتے ہوئے اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ[1] پڑھ رہے تھے،

---

[1] (خدایا) ہم صرف تیرے ہی بندے ہیں اور تجھی سے اعانت طلب کرتے ہیں (فاتحہ)

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ [۵۴] اور لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ [۵۵] کا اقرار کر رہے تھے) اور اس کے چند ہی لمحوں بعد وہی "مسلمان" قبروں کے آگے اپنی ہی جیسی لاچار اور عاجز محض مخلوق سے مرادیں مانگ رہے ہیں اور گڑگڑا کر دعائیں کر رہے ہیں۔ انسانوں کو "مشکل کشا" اور "غوثِ اعظم" (سب سے بڑا فریاد رس!) اور "دستگیر" اور "داتا گنج بخش" کہا جا رہا ہے۔ مصیبت کے وقت خدا سے مدد مانگنے کے بجائے یا علی المدد اور یا غوث اغثنی اور یا پیر دستگیر کے نعرے لگائے جاتے ہیں۔ اولاد اور نوکری اور مقدمہ کی کامیابی اور ایسی ہی دوسری اغراض کے لیے خدا کے بجائے اُس کے بندوں کی طرف رجوع کیا جا رہا ہے یہ سب کچھ اگر مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ کا مصداق نہیں تو اور کیا ہے۔ یہاں تک تو خیر، یہی غنیمت ہے کہ خدا کی عبادت کا مقام، بندوں کو پکارنے کے مقام سے الگ رکھا گیا ہے۔ مگر اس سے بھی آگے بڑھ کر بعض لوگوں نے تو یہ غضب کیا کہ خدا کے گھر میں، ٹھیک اس جگہ جہاں خدائے واحد کی بندگی کا اقرار کیا جاتا ہے، یا شیخ فلاں شیأ للہ [۵۶] کے کتبے نصب کر ڈالے۔ گویا اللہ تعالیٰ کو خود اس کے گھر میں جا کر چیلنج دے دیا گیا۔

---

[۵۴] اور فتح و کامرانی تو صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے (آل عمران) [۵۵] یہ خود ساختہ معبود ان مشرکوں کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

[۵۶] اس فقرے کا لفظی ترجمہ یہ ہے "اے شیخ فلاں، کچھ خدا کے لیے" یعنی خدا کے لیے کچھ عنایت فرمائیے۔ اس کے معنی و مفہوم پر غور کیجیے۔ اس میں دراصل توسل کے مسئلے کو الٹ کر رکھ دیا گیا ہے۔ توسل کے معنی تو یہ ہیں کہ اصل دینے والا اللہ تعالیٰ ہے اور ہم اُسکے مقربوں میں سے کسی کو وسیلہ قرار دے کر اللہ سے مانگتے ہیں۔ مگر یہاں اس کے برعکس اللہ کو وسیلہ قرار دے کر شیخ صاحب سے مانگا جا رہا ہے۔ گویا اصل دینے والے شیخ صاحب ہیں اور اللہ اُن کا مقرب ہونے کی وجہ سے وسیلہ بنایا جا رہا ہے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔ جو شخص لا الٰہ الا اللہ کے معنی کو سمجھ کر اس کلمہ پر ایمان لایا ہو وہ کس طرح اس بات کا تصور کر سکتا ہے کہ خداوند عالم کو کسی بندے کے پاس وسیلہ قرار دے کر اُس بندے سے دعا کی جائے۔ اور لطف یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں انہوں نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۴ پر ملاحظہ ہو)

(۱۲) منافقین کی ایک اور قسم | منافقین کی مذکورۂ بالا اقسام تو وہ ہیں جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ ان کے علاوہ ایک اور قسم بھی اس زمانہ میں پائی جاتی ہے جس کا وجود عہد نزول قرآن میں نہیں تھا، اور نہ قدرتاً ہونا چاہیئے تھا۔ یہ قسم اُن نسلی اور خاندانی مسلمانوں پر مشتمل ہے جن کے دماغ تو غیر اسلامی نظریات اور اصولوں پر پوری طرح ایمان لائے ہوئے ہیں اور اسلامی اصول اور قرآنی تصورات سے یکسر بغاوت کر چکے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے کو "مسلمان" کہنے اور مسلمان کہلائے جانے پر مصر ہیں، اور ان کا یہ اصرار کسی غرض یا کسی ذاتی مصلحت پر مبنی نہیں ہے، جیسا کہ دوسرے منافقوں کا خاصہ ہے، بلکہ انہیں لفظ "اسلام" اور "مسلمان" کے ساتھ ایک گہرا پیدائشی تعلق ہے اور اس تعلق کے قیام و بقا میں وہ سخت متعصب واقع ہوئے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح دنیا میں بے شمار قومیں ہیں اسی طرح انہوں نے "مسلمان" کے لفظ کو بھی ایک قوم کے نام کی حیثیت دے رکھی ہے، اور جس طرح ہر انسان کو اپنی قوم سے ایک خصوصی لگاؤ ہوتا ہے خواہ اس میں اور اس کے دوسرے ہم قوم افراد میں کتنا ہی زبردست اختلاف فکر و نظر موجود ہو ——— اور نفسیاتی اعتبار سے اس لگاؤ میں اتنی مضبوطی ہوتی ہے کہ بسا اوقات انسان کسی قیمت پر اس لگاؤ کو قربان نہیں کر سکتا، بالکل اسی طرح یہ مسلمان زادہ بھی اپنی قومیت کے نشان یعنی لفظ مسلمان کو اپنے سے جدا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا، اور جب کوئی موقع قومی حمایت کا آتا ہے تو دوسرے منافقین کی روش کے برعکس یہ "مسلم قوم" کی حمایت میں سینہ سپر ہو جاتا ہے، اور اس جانفروشی کے مظاہرہ میں نہ تو اُس کی کسی بدنیتی کا دخل ہوتا ہے نہ خود غرضی یا جاہ طلبی کا، بلکہ یہ اثر ہوتا ہے محض اس تعصب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۳) عین مسجد کی محراب میں اسے لکھ کر لگایا ہے۔ خدا کے مقابلہ میں اس سے بڑھ کر اور کیا جرأت ہو سکتی ہے! جو گھر مخصوص کیا گیا تھا ایک خدا کی بڑائی کا اعلان کرنے کے لیے اس کو بھی ان نام نہاد مسلمانوں نے نہ چھوڑا اور وہاں بھی بندوں ہی کی بڑائی کا اعلان کیا۔ اس کے بعد بھی اگر خَسِرَ الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃ کے وبال میں گرفتار نہ ہوتے تو معاذ اللہ خدا کی کتاب جھوٹی ثابت ہو جاتی۔

کا جو اسے اپنی قومیت کے ساتھ ہے۔ یہ چیز دنیوی لحاظ سے خواہ کتنی ہی قابلِ قدر ہو مگر اس کو کیا کیجیے کہ اسلام کی نگاہ میں اس کی کوئی قیمت نہیں۔ اسلام کوئی آبائی اور پیدائشی دین نہیں ہے بلکہ ایک خاص مسلک ہے جو غور و فکر کے بعد اطمینانِ قلب کے ساتھ قبول کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس مسلک کو سمجھ کر اس پر ایمان نہیں لایا ہے، اور اگر کوئی شخص اپنی زندگی کے بعض شعبوں میں یا تمام میں کسی دوسرے مسلک کے اصول و نظریات کی رہنمائی قبول کرتا ہے تو اس کا محض وہ پیدائشی تعصب، جو اسے لفظ "اسلام" کے ساتھ ہے، قرآن کی نگاہ میں کوئی وزن نہیں رکھتا۔

آپ اس "نیک نیت" اور "مخلص" منافق کو صرف اس بنا پر معاف نہیں کر سکتے اور نہ اسے منافق کہنے سے باز رہنے میں حق بجانب ہو سکتے ہیں کہ اس کی نیت بے لوث ہے اور وہ مسلم قوم کا ظاہر حال بہی خواہ ہے، کیونکہ جو شخص اُن اصول اور اساسات ہی کو نہیں مانتا، بلکہ عملاً اُن کی جڑیں کھودتا ہے جن پر اسلام کا وجود منحصر ہے، اور جو شخص لفظ مسلمان کا اطلاق تو اپنے اوپر کرتا ہے مگر اس کے معنی اور اس کی روح سے قطعاً خالی ہے، اس کی ایک نہیں ہزار قربانیاں بھی اسلامی نقطۂ نظر سے بیکار محض ہیں۔ وہ نادانستہ طور پر اسلام کے گھر میں اسلام کا دشمن ہے۔ وہ مخلص ہوتے ہوئے بھی منافق ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دوسرے منافقوں کی طرح اس کا نفاق شعوری اور ارادی نہیں بلکہ غیر شعوری اور غیر ارادی ہے۔ آپ بہت رعایت کرنا چاہتے ہیں تو اس کے دل کو مسلمان کہہ لیجیے لیکن اس کے دماغ کو تو مسلمان کہنے کی کوئی گنجائش آپ کو نہیں مل سکتی۔ اور قرآن کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ اس وقت تک کسی کو اسلامیت کا اعزاز نہیں بخشتا جب تک کہ اس کا دل اور اس کا دماغ دونوں قرآنی رنگ میں رنگے ہوئے نہ ہوں۔ یہ قرآن کا اصول ہے، غیر متبدل اور بے لاگ اصول، جس میں نہ کسی مداہنت کی گنجائش ہے نہ کسی رُو رعایت کی۔

اگر آپ گہری نظر سے مسلمانوں کا جائزہ لیں تو بے شمار درد مندانِ ملت ایسے نظر آئیں گے

جن کی کسی حرکت سے مسلم دشمنی اور خود غرضی کا شبہ تک نہ ہو سکے گا، بلکہ ان کی ساری زندگیاں قوم مسلم کی تعمیر و ترقی میں وقف نظر آئیں گی، لیکن جس وقت آپ عام معیار خدمت وایثار کو چھوڑ کر قرآن کے معیار پر ان کے خیالات اور ان کی زندگی کا جائزہ لیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ اسلام کے بنیادی عقائد تک پر ایمان نہیں رکھتے۔ قرآن کے واضح اور صریح احکام کی نہ صرف خلاف ورزی کرتے ہیں بلکہ نظری حیثیت سے بھی اُن احکام کو غلط سمجھتے ہیں اور مغرب کے اخلاقی، تمدنی اور قانونی نظریات پر ایمان لائے ہوئے ہیں۔ پھر ان کی وہ خدمات جن کا ذکر کر کے ہم سے کہا جاتا ہے کہ ان کی قدر کرو، انہیں جب ہم زیادہ گہری نظر سے جانچ کر دیکھتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ یہ لوگ جن تعلیمی یا سیاسی یا تنظیمی ادارات کو چلا رہے ہیں وہ غیر اسلامی تصوّرات اور غیر اسلامی اصولوں پر قائم ہیں، اور مسلمانوں کو قرآن کے نصب العین اور قرآن کے قانونِ حیات سے دور لیے چلے جا رہے ہیں۔ لہٰذا دنیوی اعتبار سے مسلمان ان کو خواہ اپنے لیے کتنا ہی مفید سمجھیں، قرآنی نقطۂ نظر سے یہ ہرگز کسی قدر کے مستحق نہیں ہیں۔

منافقین کی اقسام بڑی اور اصولی تقسیم کے اعتبار سے یہی ہیں۔ اگر تمام منافقوں کو ایک قوم یا ایک نسل تصور کر لیا جائے تو ان بارہ اقسام مذکورہ کو اس قوم کے بڑے بڑے قبیلے سمجھنا چاہیے، جن میں سے ہر قبیلہ کے تحت بے شمار خاندان ہیں۔ لہٰذا اصلیت کے لحاظ سے منافقوں کی اقسام کو صرف اسی بارہ کی تعداد میں محدود نہ سمجھنا چاہیے، بلکہ ان کی صحیح تعداد تو سانپوں کی طرح اَن گنت ہے۔ اور خود نفاق کی نطرت اور اس کی حقیقت ہی اس دعوی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ لیکن اس وقت ہمیں ضرورت نہیں کہ مزید تجزیہ کر کے ہر چھوٹے سے چھوٹے گروہ کا ذکر تفصیل کی روشنی میں لائیں۔ کیونکہ آپ جس نوع منافقین کو بھی لیں گے وہ انھیں بارہ جنسوں میں سے کسی نہ کسی جنس کے تحت ہوگی، اور قرآنی قانون کی رو سے اس کا حکم وہی ہوگا جو اس کی جنس کا ہوگا۔ رہ گیا یہ سوال کہ ان تمام اقسام منافقین کے بارے میں قرآن کا حکم کیا ہے، اور ان کے ساتھ مسلمانوں کو کس طرح پیش آنے کی ہدایت کی گئی ہے، تو اس

بحث پر کلام کرنے سے پہلے ہم ان تمام صفات اور اعمال اور علامات کو اکٹھا کر دینا چاہتے ہیں جو منافقین کے ساتھ مخصوص ہیں، تاکہ ایک ایسا جامع مرقع نفاق تیار ہو جائے جس میں ہر منافق کی صورت بآسانی دیکھی جاسکے۔

علامات نفاق

سطور بالا میں منافقین کے حالات اور ان کی صفات پر جو تفصیلی گفتگو کی جا چکی ہے اس کے بعد صفات اور علامات نفاق کو یکجا بیان کرتے وقت کسی تفصیل کی حاجت نہیں۔ یہاں ہم صرف مختصراً نفاق کی علامات کو نمبروار درج کر دینے ہی پر اکتفا کریں گے تاکہ ناظرین مجموعی طور پر ان سب کو بیک نظر دیکھ لیں۔ قرآن کی رو سے نفاق کی علامتیں حسب ذیل ہیں:-

(۱) ظاہر اور باطن کا مختلف ہونا، يَقُولُونَ بِأَلْسِنَتِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ۔ (فتح - ۲)

(۲) خود غرض اور موقع پرست ہونا، اَلَّذِينَ يَتَرَبَّصُونَ بِكُمْ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ الخ (النساء - ۲۰)

(۳) خطرے کے وقت اصول کی پابندی کو حماقت، مشکلات میں راستبازی و دیانت کو بے وقوفی، اور راہِ حق میں اظہار عزیمت کو ناعاقبت اندیشی سمجھنا۔ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ الخ (البقرہ - ۲)

(۴) اسلام اور امت اسلامیہ کے مصائب پر مسرور ہونا اور اس کی ترقی اور خوشحالی کو دیکھ کر جل اٹھنا۔ إِن تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِن تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا۔ (آل عمران - ۱۲)

(۵) مصالح اسلامی کے خلاف سازشیں کرنا۔ وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِندِكَ الخ (النساء - ۱۱)

(۶) اسلامی سیاسیات سے متعلق اہم امور کو، جنہیں اہل حل و عقد کے پاس صیغۂ راز میں رکھنا

چاہیے، عوام میں مشہور کر دینا۔ وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ط (النساء - ۱۱)

(۷) ارشادات نبوی اور فرامین الٰہی کے خلاف سرگوشیاں کرنا۔ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَيَتَنَاجَوْنَ بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُولِ (مجادلہ - ۲)

(۸) اہل حق اور اہل باطل دونوں سے فریب کارانہ راہ و رسم رکھنا تاکہ ہر ایک کی مخالفت سے امن حاصل رہے۔ يُرِيدُونَ أَنْ يَأْمَنُوكُمْ وَيَأْمَنُوا قَوْمَهُمْ۔ (النساء - ۱۲)

(۹) قوانین اسلام کو اور خصوصاً جہاد کو خلاف مصلحت بلکہ وجہ فساد اور نا قابل عمل سمجھنا، اور اس کے مقابلہ میں اپنے نفس کے وضع کردہ خود غرضانہ طرزِ عمل کو بنائے صلح و آشتی سمجھنا۔..... قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ۔ (البقرہ - ۲)

(۱۰) مفسدہ پرداز ہونا۔ كُلَّمَا رُدُّوا إِلَى الْفِتْنَةِ أُرْكِسُوا فِيهَا۔ (النساء - ۱۲)

(۱۱) اسلام کو آج قبول کرنا اور کل اس سے برگشتہ ہو جانا، محض اس لیے تاکہ عوام کو اسلام سے نفرت پیدا ہو۔ وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنْزِلَ ..... الخ (آل عمران - ۸)

(۱۲) کفار اور دشمنان اسلام سے دوستی یا محبت یا مددگاری و معاونت کا تعلق رکھنا۔ الَّذِينَ يَتَّخِذُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ۔ (النساء - ۲۰)

(۱۳) اسلام کی محارب اور بدخواہ قوتوں کو مسلمانوں کے مقابل امداد دینا یا امداد کا وعدہ کرنا۔ لَئِنْ قُوتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ۔ (حشر - ۲)

(۱۴) کفار کے ہاں عزت کا طالب ہونا۔ أَيَبْتَغُونَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ۔ (النساء - ۲۰)

(۱۵) اسلامی عدالت کے بجائے ایسی عدالتوں سے اپنے معاملات کا فیصلہ کرانا جو غیر اسلامی قانون پر عمل کرتی ہوں۔ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْا اِلَى الطَّاغُوْتِ۔ (النساء۔ ۹)

(۱۶) شریعت کے قانون پر محض اس وقت عمل کرنا جب کہ اپنا فائدہ ہوتا ہو۔ اور جہاں یہ اندیشہ ہو کہ شریعت کا فیصلہ ان کی خواہشات کے خلاف ہوگا وہاں اس سے دور بھاگنا اور صاف لفظوں میں اسے ٹھکرا دینا۔ وَاِذَا دُعُوْا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ (النور ۔۶)

(۱۷) حق کے واضح ہو جانے کے بعد اور اسے حق جان لینے کے باوجود غرور اور خود پرستی کی وجہ سے اور جھوٹی عزت کے خیال سے اپنی غلط روش پر جمے رہنا۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ۔ (البقرہ۔ ۲۵)

(۱۸) اخلاق اور تقویٰ کے بجائے نسلی اور قومی امتیازات کو وجہ عزت و ذلت سمجھنا اور انہیں امتیازات کا سوال اٹھا کر امت میں نسلی گروہ بندی پیدا کرنا۔ يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَا اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ۔ (منافقون۔ ۲)

(۱۹) تقویٰ اور مغفرت کو ہیچ اور اپنے کو ان چیزوں سے بلند و برتر اور بے نیاز سمجھنا۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝ (منافقون ۔۱)

(۲۰) اپنی عقل و فہم کو معیار حق سمجھنا اور قرآن کے بیان کردہ حقائق کا مذاق اڑانا ان پہ نکتہ چینی کرنا۔ وَيَقُوْلَ ...... مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا۔ (منافقون ۔۱)

(۲۱) نماز اور اذان کا بلکہ تمام شعائر اسلامی کا مذاق اڑانا۔ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ

اَتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّ لَعِبًا۔ (مائدہ - ۸)

(۲۲) اللہ تعالیٰ کو، اُس کے رسول کو، اور اس کی آیات کو دل لگی کا سامان بنانا۔ قُلْ اَبِاللّٰهِ وَاٰيَاتِهٖ وَرَسُوْلِهٖ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِءُوْنَ۔ (توبہ - ۸)

(۲۳) مالدار مسلمانوں کے مخلصانہ انفاق فی سبیل اللہ پر ریاکاری کا الزام لگانا اور غریب مسلمانوں کے تھوڑے صدقات کی ہنسی اڑانا۔ اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ ......فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ۔ (توبہ - ۱۰)

(۲۴) خدا سے یہ دعا کرنا کہ اگر مجھے تو نے مال دیا تو تیری راہ میں خرچ کروں گا لیکن مالدار ہونے کے بعد اس عہد کو فراموش کر دینا اور راہِ خدا میں خرچ کرنے سے بخل کرنا فَلَمَّآ اٰتٰهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ۔ (توبہ - ۱۰)

(۲۵) اگر راہِ خدا میں کبھی کچھ خرچ کیا بھی تو قلبی کراہیت اور تنگ دلی کے ساتھ۔ وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ۔ (توبہ - ۷)

(۲۶) راہِ خدا میں صرف کرنے کو مفت کا تاوان اور لاحاصل خرچ سمجھنا۔ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا۔ (توبہ - ۱۲)

(۲۷) دوسرے مالدار مسلمانوں کو غریب مسلمانوں کی مدد کرنے سے روکنا تاکہ اسلامی جماعت میں بالآخر پراگندگی پیدا ہو جائے۔ هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا۔ (منافقون - ۱)

(۲۸) حرام خوری میں بے باک ہونا۔ وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ ...... وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ۔ (مائدہ - ۹)

(۲۹) لوگوں کو اچھے کاموں سے روکنا اور برائی کی تلقین کرنا۔ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ - (توبہ - ۹)

(۳۰) جماعت میں فحش اور بداخلاقی کی ترویج کرنا - اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا - (نور - ۲)

(۳۱) شیرازۂ ملت کو مذہبی فرقہ بندیوں کے ذریعہ درہم برہم کرنا - وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا الخ (توبہ - ۱۲)

(۳۲) اپنے آپ کو ظلم اور گناہ کے لیے وقف کر دینا - وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ - (مائدہ - ۹)

(۳۳) جھوٹ کا عادی ہونا اور لوگوں کو فریب دے کر اپنی مطلب براری کے لیے جھوٹی قسمیں کھانا - وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ اتَّخَذُوْا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً (منافقون - ۸)

(۳۴) کسی کے ساتھ بھی سچی وفاداری نہ کرنا اور پاس عہد سے سروکار ہی نہ رکھنا - اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ .... وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ - (حشر - ۲)

(۳۵) بغیر کسی کارنامہ کے سرانجام دیئے ہوئے محض جھوٹی شہرت کا حریص ہونا - وَيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا - (آل عمران - ۱۹)

(۳۶) بے حسی قلب کے باعث سچائی اور نیکی کی حقیقتوں کے ادراک سے عاجز ہونا - وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ (منافقون - ۱) فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا - (النساء - ۱۱)

(۳۷) بزدل ہونا۔ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ۔ (توبہ - ۷)

(۳۸) اعدائے اسلام سے در پردہ خوشامدانہ ربط ضبط رکھنا، صرف اس خوف سے کہ کہیں وہ کوئی گزند نہ پہنچا دیں۔ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰۤى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ۔ (مائدہ - ۸)

(۳۹) بزدلی کی وجہ سے ہر مصیبت کو خواہ اس کا رخ کسی کی طرف ہو، اپنے ہی لیے سمجھنا۔ وَيَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ۔ (منافقون - ۱)

(۴۰) اپنے مسلم ہونے پر توفیق الٰہی کا شکر گذار ہونے کے بجائے الٹا اللہ اور اس کے رسول اور عام امت مسلمہ پر احسان رکھنا۔ يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا (حجرات - ۲)

(۴۱) نماز کی ادائیگی اور پابندی کو گراں محسوس کرنا، محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں آنا، مگر اس طرح الکساتے ہوئے آنا جس سے صاف ظاہر ہو کہ بادلِ ناخواستہ آئے ہیں۔ وَاِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ[۱]۔ (نساء - ۲۱)

---

[۱] یہ آیت ایک بڑی حقیقت کی پردہ کشائی کر رہی ہے۔ اس میں منافقین کی علامت یہ نہیں بتائی گئی کہ وہ نماز کے لیے مسجدوں میں نہیں آتے۔ بلکہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ الکساتے ہوئے آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نماز، مومن اور کافر کے درمیان حد فاصل تھی۔ جو شخص موذن کی پکار پر مسجد میں نہ پہنچتا اس کے متعلق سمجھ لیا جاتا تھا کہ اسلام اسے قبول نہیں ہے اور اس بنا پر وہ جماعت سے خارج کر دیا جاتا تھا۔ لہٰذا اس زمانہ میں ہر اس شخص کو نماز کے وقت مسجد میں حاضر ہونا پڑتا تھا جو مسلمانوں کی جماعت میں شامل رہنا چاہتا ہو، عام اس سے کہ وہ مومن ہو یا منافق۔ منافقین اگرچہ دل سے نماز کو فرض نہیں سمجھتے تھے اور نہ اسے ادا کرنا چاہتے تھے مگر چونکہ انہیں اپنی منافقانہ اغراض کے لیے اس امر کی ضرورت تھی کہ اسلامی جماعت میں گھسے رہیں، اس لیے وہ نماز کے اوقات میں مجبوراً مسجد جاتے تھے۔ اس وقت مومن اور منافق کے درمیان تمیز صرف اسی طرح ہوتی تھی کہ مومن ایسے ذوق شوق کے ساتھ آتے تھے جیسے کہ وہ احساس فرض سے خود بخود کھنچے چلے آ رہے ہیں۔ اور منافقین اس طرح بادلِ ناخواستہ آتے تھے کہ جیسے زبردستی اپنے آپ کو کھینچے لا رہے ہیں۔ اب صورت معاملہ بالکل بدل گئی ہے۔ آج کسی منافق کو مسلمانوں کی جماعت میں شامل رہنے کے لیے نمائشی نماز کی بھی حاجت نہیں رہی، کیونکہ اس کے بغیر بھی وہ مسلمان سمجھا جا رہا ہے۔ لہٰذا آج نماز مومن اور کافر کے درمیان نہیں بلکہ مومن اور منافق کے درمیان حدِ فاصل بن گئی ہے۔ اب منافق کی کھلی ہوئی علامت یہ ہے کہ وہ اذان کی آواز سن کر ٹس سے مس نہ ہو، اور جب نماز کا وقت آئے تو وہ ادائے فرض کے لیے حرکت نہ کرے۔

(۴۲) ہلکے اور بے ضرر احکام شرعیہ پر تو بڑی تندہی سے عمل کرنا لیکن سخت اور ایثار طلب احکام سے روگردانی کرنا۔ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ قِیْلَ لَھُمْ کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ...... الخ (النساء۔ ۱۱)

(۴۳) جہاد کا نام سن کر کانپ اٹھنا اور میدان جہاد کی طرف رخ کرتے ہوئے شدت خوف سے بدحواس ہو جانا۔ رَاَیْتَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ یَّنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ نَظَرَ الْمَغْشِیِّ عَلَیْہِ مِنَ الْمَوْتِ۔ (محمد۔ ۳)

(۴۴) فریضہ جہاد کی ادائیگی کے وقت جبکہ عام امت اس فرض کو پورا کرنے کے لیے غنیم کے مقابل جا رہی ہو، ہر طرح کی استطاعت رکھنے کے باوجود امام وقت کے سامنے طرح طرح کے بہانے پیش کرنا اور پیچھے رہ جانے کی اجازت چاہنا۔ وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَۃٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَجَاھِدُوْا مَعَ رَسُوْلِہِ اسْتَاْذَنَکَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْھُمْ (توبہ۔ ۱۱)

(۴۵) جنگ کی ضرورت سورج کی طرح عیاں ہو لیکن مختلف تاویلوں سے، تاکہ اس آزمائش سے نجات مل جائے، اس ضرورت کا انکار کرنا۔ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنٰکُمْ (آل عمران۔ ۱۷)

(۴۶) جہاد کی ضرورت سے انکار تو نہ ہو لیکن اس کی تکلیفوں اور صعوبتوں کا تصور کر کے اُسے جنگی مصالح کے خلاف بتانا۔ خود بھی گھر بیٹھ رہنا اور دوسروں کو بھی تن آسانی اور آرام پسندی کی ترغیب دینا۔ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِی الْحَرِّ.......... (توبہ۔ ۱۱)

(۴۷) میدان جہاد میں، مصالح ملی اور اسلامی عزت وناموس کے بجائے اپنی جانوں ہی کی فکر میں رہنا...... وَطَآئِفَۃٌ قَدْ اَھَمَّتْھُمْ اَنْفُسُھُمْ...... یَقُوْلُوْنَ لَوْ کَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ مَّا قُتِلْنَا ھٰھُنَا۔ (آل عمران۔ ۱۶)

(۴۸) مسلمان ہونے کا مطلب یہ سمجھنا کہ اب کسی مصیبت سے دوچار ہونا نہ پڑے گا کیونکہ جب ہمیں رب السمٰوٰت والارض کے تنہا نام لیوا ہیں تو وہ ہم کو اپنے منکروں اور دشمنوں کے مقابلہ

میں مبتلائے مصیبت کیوں کرے گا۔ پھر جب کوئی ایسا موقع آپڑے کہ بظاہر مسلمانوں کو آدمی مضرت پہنچ رہی ہو تو خدا، اس کے رسول اور اس کے بھیجے ہوئے دینِ اسلام کی صداقت میں طرح طرح کے شک کرنا۔ وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا (احزاب ۔۲) يَظُنُّونَ بِاللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ (آل عمران ۔۱۶)

(۴۹) میدانِ جہاد سے امام اور لشکرِ اسلام کو چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہونا خواہ اپنی جان بچانے کی نیت سے، خواہ مسلمانوں کے حوصلے پست کرنے کی غرض سے۔ وَإِذْ قَالَت طَّائِفَةٌ مِّنْهُمْ يَا أَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوا...... إِن يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا ۔ (احزاب ۔۲)

(۵۰) شرکتِ جہاد کی سعادت سے محروم رہنے پر حزین و ملول ہونے کے بجائے مسرور ہونا۔
فَرِحَ الْمُخَلَّفُونَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلَافَ رَسُولِ اللَّهِ .... (توبہ ۔۱۰)

(۵۱) خود رکنے کے علاوہ دوسروں کو بھی میدانِ جنگ میں جانے سے روکنا۔ قَدْ يَعْلَمُ اللَّهُ الْمُعَوِّقِينَ مِنكُمْ وَالْقَائِلِينَ لِإِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ إِلَيْنَا .... (احزاب ۔۲)

(۵۲) راہِ حق میں جان دینے کی سعادت اور رفعتِ بلندی سے بے خبر ہونا۔ اسے مفت کا ضیاعِ جان سمجھنا۔ اور جس طرح کسی کی بد انجامی پر افسوس کیا جاتا ہے اُس طرح شہداء کی موت پر اظہارِ افسوس کرنا۔ الَّذِينَ قَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوا لَوْ أَطَاعُونَا مَا قُتِلُوا (آل عمران ۔۷)

(۵۳) ایمان کی قوت اور صبر و توکل علی اللہ کی کیفیت کا قدر شناس نہ ہونا۔ کفر و ایمان دونوں کو اثر، نفوذ اور ثبات کے لحاظ سے ایک جیسا سمجھنا۔ اس علم سے محروم اور اس یقین سے خالی ہونا کہ فتح و شکست کا مدار مادی اسباب پر نہیں بلکہ ایمان باللہ کی بخشی ہوئی قلبی استقامت پر ہے اور اپنے نصب العین کی خاطر عالمِ اسباب سے بالاتر ہو جانے میں ہے۔ اس حقیقت سے ناآشنا ہونا کہ حق پرست کی حمایت سے اگر دنیا جہان کے انسان منہ موڑ لیں تب بھی اس کے لیے غم و اضطراب کا کوئی موقع

نہیں کہ دشمن چو قوی است نگہبان قوی تراست . نفاق اسی ذوق یقین سے محرومی کا نام ہے - اِذْ يَقُوْلُ الْمُنَافِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَاۤءِ دِيْنُهُمْ - (انفال - ۷)

(۴۵) صرف اُس وقت جنگ کے لیے نکلنا جب یہ توقع ہو کہ نہ کوئی خطرناک صورت حال واقع ہو گی اور نہ راستہ میں زیادہ مشکلات اور مصائب پیش آئیں گی، بلکہ نہایت آسانی سے مال غنیمت لوٹ کر واپسی ہو جائے گی۔ لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ .... (توبہ - ۶)

(۵۵) خطرے کے وقت تو مسلمانوں کا ساتھ نہ دینا مگر جب برا وقت گذر جائے اور مسلمان میدان جنگ سے واپس آئیں تو نہایت مومنانہ صورت اور مخلصانہ لب و لہجہ کے ساتھ ان کا استقبال کرنا اور اپنے عدم شرکت کی جھوٹی مجبوریاں بیان کر کے معذرت خواہ ہونا اور محض زبانی - اور وہ بھی نمائشی - اظہار ہمدردی اور لمبی چوڑی قسموں سے لوگوں کو خوش رکھنے کی سعی کرنا - وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ..... وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (توبہ - ۶)

(۵۶) اگر کسی مجبوری کی وجہ سے جنگ میں شریک ہونے کی نوبت بھی آ جائے تو جماعت میں فتنہ انگیزیاں کرتے رہنا اور اس طرح اسے تقویت دینے کے بجائے اور کمزور کرنا - لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاَاَوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ (توبہ - ۷)

(۵۷) نظام تمدن کو اپنی اغراض کی خاطر برباد کرنا خصوصاً ایسے وقت کو غنیمت سمجھنا جبکہ اہل ایمان دشمنان دین کے مقابلہ میں مشغول ہوں - فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ - (محمد - ۳)

(۵۸) جہاد میں شریک ہونا بھی تو محض دنیوی فائدے اور حصول غنائم کے لالچ سے نہ کہ حق کو بلند کرنے اور باطل کو سرنگوں کرنے کی خاطر - وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ

تَكُنۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُ مَوَدَّةٌ يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا (نساء - ۱)

(۵۹) قربانیاں دینے کے وقت تو چھپ کر بیٹھ رہنا لیکن مال غنیمت، یا جو شے بھی عام مسلمانوں کی قربانیوں کے نتیجہ میں حاصل ہو، اُس میں حصہ بٹانے کے لیے اسلام کی فلاح و بہبود کا دم بھرتے اور ایمان کے نعرے لگاتے ہوئے آموجود ہونا۔ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ۔ (احزاب - ۲)

(۶۰) تقسیم غنائم کے وقت زیادہ سے زیادہ مال حاصل کرنے کی سعی کرنا اور اگر حسب خواہش حصہ نہ لگے تو بگڑ بیٹھنا اور اپنی کارگذاریوں کو دیکھنے کے بجائے امام جماعت پر بہتان لگانا۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَا اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ (توبہ - ۷)

(۶۱) ایسی پالیسی اختیار کرنا کہ جنگ کے اختتام پر بہر صورت اپنا دہان آز بھرے۔ اگر مسلمان غالب ہوں تو ان سے بھی مال غنیمت میں حصہ طلب کرے اور اگر دشمن غالب رہیں تو ان سے بھی صلہ ہاتھ آئے۔ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (نساء - ۲۰)

(۶۲) اسلام کی محبت کو اہل و عیال اور وطن کی محبت پر قربان کر دینا اور بوقت ضرورت دین کی خاطر ترک وطن یعنی ہجرت نہ کرنا اور غیر اسلامی طرز کی زندگی بسر کرنے پر قانع رہنا۔ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ...... قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا۔ (النساء - ۱۴) نیز وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ۔ (عنکبوت - ۱)

(جیسا کہ پہلے بالتشریح بتایا جا چکا ہے یہ آیت تمہید ہجرت کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے اور یہاں

منافق انہیں لوگوں کو کہا گیا ہے جو ہجرت کا حکم آنے کے بعد مکہ سے نہ نکلنے والے تھے اور آخر کار نہ نکلے)

(۶۳) کفر کی حکومت میں بغیر کسی واقعی مجبوری کے برضا و رغبت زندگی بسر کرنا اور اس کے ساتھ تعاون کرنا یہاں تک کہ مسلمانوں کے خلاف لڑائی تک میں اُس کا ساتھ دے جانا۔ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ الخ (النساء - ۱۴)

(اس آیت کے متعلق بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ اُن ضعیف الایمان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی جو اسلام لانے کے باوجود صرف اس وجہ سے کفارِ قریش کے زیرِ سیادت مکہ میں زندگی گذار رہے تھے کہ وطن کی کشش اور جلا وطنی کے مصائب کی ہولناک صورت ہجرت کرنے سے مانع تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بدر کے دن یہ لوگ بھی طوعاً یا کرہاً مسلمانوں سے لڑنے آئے اور مارے گئے)

(۶۴) ایسے مواقع سے دور رہنا جہاں حق و صداقت کا اعلان ہو رہا ہو۔ اور اگر وہاں پہلے سے موجود ہوں تو چپکے سے نظر بچا کر کھسک جانا۔ وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ .... نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا۔ (توبہ - ۱۷)

(۶۵) دل کا ایسا سخت اور سیاہ اور بے حس ہو جانا کہ قرآنی نصیحتوں کا کوئی اثر نہ ہو بلکہ انہیں قابلِ نفرت سمجھ کر ان سے اعراض کرنا۔ فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ۔ (مدثر - ۲)

(۶۶) جماعتی حیثیت سے باہم منتشر رہنا، دلوں کا ایک دوسرے سے پھٹا ہوا ہونا، اور بظاہر متحد معلوم ہونے کے باوجود باہم دگر کھنچے ہوئے رہنا۔ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى۔ (حشر - ۲)

یہ سرسٹھ نشانیاں ہیں جنہیں قرآن حکیم نے منافقین کے احوال بیان کرتے وقت ان کی امتیازی خصوصیات کی حیثیت سے پیش فرمایا ہے۔ یہ علامتیں تمام اقسام منافقین کے اعمال اور کیفیات

نفس پر حاوی ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر منافق میں یہ علامتیں ساری کی ساری موجود ہوں کسی منافق کے اندر ان میں سے دو چار ہوں گی تو دوسرے میں دس بیس ہو سکتی ہیں۔ اگر ایک منافق میں بعض علامتیں موجود ہوں گی تو دوسرے میں وہ نہ ہوں گی بلکہ ان کے علاوہ بعض دوسری ہوں گی۔ دراصل ان علامتوں کا وجود ہر صاحب نفاق کے ذاتی حالات اور اس کے انفرادی رجحاناتِ نفسانی پر منحصر ہے۔

ایک ضروری احتیاط | لیکن ان علامتوں کو سامنے رکھ کر بلا تامل ہر اس شخص کو منافق کا خطاب نہ دے دیجیے جس کے اندر ان علامتوں میں سے کوئی ایک علامت کسی وقت بھی نظر آجائے۔ منافقین کی جتنی صفات اوپر بیان ہوئی ہیں ان سب کا سرچشمہ انسان کی کمزوری نفس اور مادیات کی غیر معتدل محبت ہے۔ اور یہی کمزوریِ نفس اور غیر معتدل حبِ دنیا، گناہ کا بھی سرچشمہ ہے۔ اس لیے ایک سچے مسلمان سے بھی ان اعمال کا صدور ہر وقت ممکن ہے، کیونکہ انبیاء کو چھوڑ کر کوئی انسان بھی، خواہ وہ کیسا ہی راسخ الایمان کیوں نہ ہو، معصوم نہیں۔ نفس ہر شخص کے اندر ہے، اس لئے ایک مسلمان جہاں اچھے اعمال کرتا رہتا ہے وہاں گناہوں کا ارتکاب بھی اس سے ہو سکتا ہے اور ہوتا رہتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ کسی وقت ایک مسلمان بھی وہی حرکت کر بیٹھے جو منافق کی خصوصیات میں سے ہے۔ لہٰذا اس جگہ منافق اور گنہگار مسلمان، دونوں کی پوزیشن اور دونوں کا فرق اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

نفاق کی اس ساری بحث کو پڑھنے کے بعد آپ پر اب یہ امر تو مخفی نہ رہ گیا ہوگا کہ جب ایک منافق اسلامی تعلیمات یا ملی مصالح کے خلاف کوئی حرکت کامیابی کے ساتھ کر گزرتا ہے تو اس کے دل کو کیسی فرحت اور اس کے نفس کو کیسا سرور حاصل ہوتا ہے اور بجائے اس کے کہ اس کا ضمیر اپنی اس شنیع حرکت پر کسی قسم کی گرانی اور ناگواری کا احساس کرے الٹا اپنی کامیاب "سیاست" پر فخر کرتا ہے۔ لیکن ایک مسلمان ایسی کوئی حرکت کب اور کیوں کرتا ہے اور پھر اس کے سرزد ہو جانے کے بعد اس کے ضمیر کا حال کیا ہوتا ہے؟ قرآن حکیم اس کا یہ جواب دیتا ہے کہ:-

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ۔

اور جنت اُن متقیوں کے لیے ہے، جو اگر کبھی کوئی برا کام کر گذرتے ہیں یا اپنے نفس پر (گناہ کرکے) ظلم کر جاتے ہیں تو فوراً ہی انہیں اللہ کا خیال آجاتا ہے۔ پھر وہ اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔۔ اور اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کو معاف کرنے والا ہو۔ وہ اپنے برے فعل پر جانتے بوجھتے اصرار نہیں کرتے

ایسے ہی گناہگار مسلمانوں کے متعلق دوسری جگہ آتا ہے کہ:۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ۔ (التوبہ ۔ ۱۰۲)

اور (ان منافقوں کے علاوہ جہاد سے پیچھے رہ جانے والے) بعض دوسرے لوگ بھی ہیں جنہوں نے اپنے گناہوں کا (ایسے احساس ندامت کے ساتھ) اقرار کر لیا ہے۔ ان کے کچھ اچھے اعمال بھی ہیں۔ اور کچھ برے بھی۔ توقع ہے۔ کہ خدا ان کی توبہ قبول کرلے اور معاف کردے۔

ایک تیسری آیت بھی سامنے رکھیے:۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (النحل ۱۱۹)

جن لوگوں سے برے کام نادانی و جہالت کی وجہ سے سرزد ہو جاتے ہیں اور جو گناہ کرنے کے بعد توبہ کرتے اور اپنی اصلاح کر لیتے ہیں، ایسے لوگوں کے حق میں یقیناً تیرا پروردگار اس (توبہ اور اصلاح) کے بعد ضرور بخش دینے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

ان تینوں آیتوں پر غور کرنے سے چند باتیں نکلتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ مسلمان سے بھی گناہ سرزد ہو سکتا ہے، اور ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ گناہ کرتا ہے تو جہالت کی بنا پر یعنی کسی فوری جذبہ نفسانی سے مغلوب ہو کر۔ نہ کہ سوچ سمجھ کر۔ تیسری بات یہ کہ ارتکاب گناہ کے بعد فوراً ہی اس کا ضمیر مضطرب ہو جاتا ہے۔ ناگواری کے شدید احساسات سے اس کا حال متغیر ہو جاتا ہے۔ خدائے ذوالجلال کی صفت

عدل اس کی نگاہوں کے سامنے مجسم ہو کر کھڑی ہوتی ہے۔ اس کی جبینِ ایمانی پر عرقِ انفعال کے قطرے نمودار ہو جاتے ہیں۔ وہ بغیر کسی توقف کے اپنے گناہ کا اعتراف کر لیتا ہے، اور خدا سے مغفرت کا طالب ہوتا ہے، اور آئندہ کے لیے اپنی اصلاح کر لیتا ہے۔ چوتھی بات ــــ جسے اس تیسری بات کا سلبی پہلو کہنا چاہیئے ــــ یہ ہے کہ وہ اپنے کسی عمل بد پر قصداً جما نہیں رہتا یعنی یہ نہیں ہوتا کہ مسلسل اس برائی کو وہ کیے جائے اور اسے ترک کرنے کی نہ کوئی سعی کرے نہ اس کا قلب اس پر نفرت کرتا ہو۔

منافق ان تمام صفات سے عاری ہوتا ہے۔ وہ خلاف شرع حرکتوں کو کسی فوری جذبۂ نفس سے مغلوب ہو جانے کی وجہ سے نہیں کرتا بلکہ دراصل وہ پورے شعور اور ارادہ کے ساتھ شریعت کی خلاف ورزی کو اس کی پابندی پر قصداً ترجیح دیتا ہے، اور اس خلاف ورزی کو اپنی عادت بنا لیتا ہے۔ شریعت کی پابندی میں بظاہر جو تکلیفیں اور لذاتِ نفس سے محرومیاں ہیں ان کا موازنہ وہ ان فائدوں اور آسائشوں اور لذتوں سے کرتا ہے جو شریعت کی خلاف ورزی میں نظر آتی ہیں، پھر اس کا نفس یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس کو پہلی چیز قبول نہیں ہے اور صرف دوسری چیز ہی مطلوب ہے۔ اسی فیصلہ کی بنا پر جب وہ خدا کا قانون توڑتا ہے تو اُسے شرمندگی کے بجائے فرحت و مسرت ہوتی ہے اس کے دل میں خوفِ خدا کا شائبہ تک نہیں آتا۔ نہ استغفار اور توبہ کی طرف کبھی اس کا ذہن منتقل ہوتا ہے۔

یہ ہے بنیادی فرق ایک منافق میں اور ایک گنہگار مسلمان میں، اور یہی وہ نکتہ ہے جسے نہ سمجھنے کی وجہ سے خوارج نے مطلقاً ہر گناہ کبیرہ کے مرتکب کو کافر قرار دے دیا۔ پس مذکورۂ بالا صفات منافقین کو سامنے رکھ کر اپنی جماعت کے منافقوں کو چھانٹتے وقت ہمیں منافق اور گنہگار مسلمان کے اس نازک فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ جسم کے فاسد اجزاء کو کاٹتے ہوئے اُس کے صالح اجزاء بھی کاٹ کر پھینک دیئے جائیں۔

منافقین کے بارے میں شریعت کے احکام

منافقین کے بارے میں قرآن نے جو احکام صادر کیے ہیں ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصہ تو وہ ہے جو ان کی آخرت کے متعلق ہے یعنی یہ کہ مالک یوم الدین ان کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ دوسرا حصہ ان

کی دنیوی زندگی سے تعلق رکھتا ہے، یعنی یہ کہ عام مسلمان، انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے، ان کے ساتھ کیا رویّہ اختیار کریں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جس طرح آخری انجام کے اعتبار سے تمام مسلمانوں کے درجات یکساں نہیں ہیں بلکہ ان کے ایمان اور اعمال کے مراتب کے لحاظ سے انہیں مختلف مدارج عطا کیے جائیں گے، اسی طرح منافقین بھی سب ایک درجہ میں نہیں ہیں بلکہ ان کے مراتب نفاق کے اعتبار سے اُن کی سزاؤں کے بھی مختلف مدارج قرار دیئے جائیں گے۔ جس منافق کے اندر نفاق اپنی پوری شدت سے کارفرما ہوگا اُس کے عذاب کی کمیت اور کیفیت کچھ اور ہوگی، اور جس کے اندر نفاق کی معمولی اور نسبتاً ہلکی خصوصیات ہوں گی اُس کے عذاب کی نوعیت کچھ اور ہوگی۔ یہی فرق ان احکام میں بھی ملحوظ ہے جو عام مسلمانوں کو منافقوں کے بارے میں دیئے گئے ہیں۔ خود اصول جزاء کا بھی یہی تقاضا ہے کہ مختلف طبقات منافقین کے درمیان یہ فرق ملحوظ رکھا جائے اور قرآن کے بعض اشارات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً وہ لوگ جو خدا اور رسولِ خدا اور آیاتِ قرآن کے ساتھ تمسخر کرتے تھے، ان کے متعلق قرآن فرماتا ہے کہ :-

لَا تَعْتَذِرُوْا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ	منافقو! باتیں نہ بناؤ، یقیناً تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا۔
اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآئِفَةٍ مِّنْكُمْ نُعَذِّبْ طَآئِفَةً	اگر ہم تم میں سے ایک گروہ کو بخش بھی دیں تو دوسرے لوگوں کو
بِاَنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ۔ (توبہ ۔ ۸)	ضرور عذاب دیں گے کہ حقیقی اور شعوری مجرم وہی لوگ ہیں۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ نفاق جو جان بوجھ کر اختیار کیا جائے اس کا مقام اور ہے اور جو محض جہالت اور قلت اعتنا یا ضعف نفس کی بنا پر ہو اس کا مقام اور ہے اور کیا عجب ہے کہ رحمتِ الٰہی کا دائرہ کسی وقت میں وہاں تک بھی وسیع ہو جائے۔

منافقین کے طبقات اس نقطۂ نظر سے جب ہم عام منافقین کے حالات و صفات پر نگاہ ڈالتے ہیں اور ان کی کیفیات نفسی کا عمیق مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ لوگ تین مختلف طبقات میں بٹے دکھائی دیتے ہیں۔

ایک تو وہ افراد انسانی ہیں جو اسلام اور کفر دونوں کی حقیقت، دونوں کے نظریات اور دونوں کے حیاتی نصب العین سے بخوبی واقف ہیں، پھر اس واقفیت کے بعد ان کا دل اسلام سے پوری طرح برگشتہ اور کفر اور کافرانہ نظریات کا سچا عقیدت کیش ہے لیکن اس کے باوجود ان کے کچھ مصالح ہیں جو انہیں مجبور کیے ہوئے ہیں کہ اسلام سے علانیہ بے تعلقی کا اظہار نہ کریں بلکہ منافقت کے لباس میں اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے کی کوشش کریں۔ یہ منافقانہ طرزِ عمل خواہ کسی نے اپنی ذاتی اغراض اور مصلحتوں کی خاطر اختیار کیا ہو، یا کسی مسلک کفر کے اعتقادات اور نظریات کو مسلم عوام میں کامیابی کے ساتھ پھیلانے کے لیے چال کے طور پر اختیار کیا ہو، یا مسلمانوں کے نظام ملی میں اختلال برپا کرنے اور ان کے جماعتی رازوں کی جاسوسی کرنے اور درپردہ ان کی توتوں کو ناکارہ بنانے کے لیے سیاسی حربے کے طور پر اختیار کیا ہو، بہرحال اس قسم کے تمام منافقین ایک ہی طبقہ میں شمار ہوں گے۔

دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو گو حالت نفاق میں گرفتار ہیں۔ لیکن ان کا باطن اتنا زنگ آلود نہیں ہے جیسا کہ مقدم الذکر طبقہ کا ہے۔ ان کا نفاق یا تو ناواقفیت پر مبنی ہے یعنی ان کے سامنے اسلامی اور غیر اسلامی اصول و معتقدات اچھی طرح ایک دوسرے سے متمیز نہیں ہیں اور اس وجہ سے وہ نادانستہ کفر کی حالت میں مبتلا ہیں) یا پھر اُن کے نفس کی کمزوریوں نے انہیں منافقین کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ اگرچہ یہ لوگ کفر کی بہ نسبت اسلام سے قریب تر ہیں مگر ان کے اسلام میں اتنی قوت نہیں ہے کہ اپنے اصول اور مسلک کی خاطر، جسے وہ حق کہتے اور حق سمجھتے ہیں، ضرورت پڑنے پر اپنے مادی علائق، اپنی طبعی لذات اور اپنے دنیوی مصالح کو قربان کر سکیں۔

پہلا طبقہ نفاق کی آخری سرحد پر ہے جسے نفاق کا امام کہنا چاہیے۔ اور دوسرا طبقہ نفاق کی ابتدائی سرحد پر ہے بلکہ یوں کہیے کہ ایک قدم اس کا دائرہ اسلام میں ہے اور دوسرا حلقۂ نفاق میں۔ منافقین کے یہ دونوں طبقے عہد رسالت میں بھی تھے اور آج بھی ہیں۔

لیکن، جیسا کہ کہیں اوپر بیان کیا جا چکا ہے، اس وقت ایک تیسرا طبقہ بھی پیدا ہو گیا ہے جس کا نام ہم نے غیر شعوری منافق رکھا ہے۔ یہ طبقہ اپنے خیالات، مقاصد زندگی، اور طرز عمل کے اعتبار سے تو اسلام سے بالکل منحرف ہے، مگر اپنے آپ کو مسلمان کہنے پر نہ صرف مصر ہے، بلکہ اسلام کے نام پر جان دینے کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور بس مسلمانوں کو سربلند دیکھنے کے لئے مرا جاتا ہے۔ اس کے اندر اسلام اور مسلمانوں کے لیے ویسی ہی عصبیت اور جاہلی حمیت ہے جیسی ایک پیدائشی ہندو میں ہندویت اور ہندوؤں کے لیے، اور ایک پیدائشی سکھ میں سکھ مت اور سکھوں کے لیے ہوتی ہے۔

قرآن نے صرف دو ہی مقدم الذکر طبقوں کے حالات و عواقب سے بحث کی ہے لیکن اسلامی اصول و نظریات کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو بآسانی یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ یہ تیسرا طبقہ اپنی حالت میں طبقۂ دوم سے بہت قریب ہے اور اس کے احکام بھی ویسے ہی ہونے چاہئیں جیسے طبقۂ دوم کے احکام ہیں۔

اخروی انجام اب ان دونوں گروہوں کے بارے میں ان کے اختلاف مدارج کے لحاظ سے جو مختلف احکام بیان کیے گئے ہیں ان پر غور کیجئے۔ یہ احکام، جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، دو حصوں میں منقسم کیے جا سکتے ہیں۔ ایک تو وہ جو منافقین کے اخروی انجام اور جزا و سزا کے متعلق ہیں۔ دوسرا وہ جو ان کی دنیوی زندگی یعنی منافق اور مسلم کے دنیوی روابط سے متعلق ہیں۔ یہاں ہم قرآن سے دونوں طبقوں کے منافقوں سے متعلق احکام الگ الگ بیان کرتے ہیں پہلے اخروی نقطۂ نظر سے پھر دنیوی اور سیاسی زاویۂ نگاہ سے۔

طبقۂ اول پہلے طبقے کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے:۔

قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ (توبہ - ۷)

اے پیغمبر ان منافقوں سے کہدو کہ خواہ تم خوشی سے صدقہ دو یا زبردستی اور تنگ دلی سے (خدا کے ہاں) بہر حال (ہرگز) مقبول نہ ہوگا، کیونکہ تم لوگ فاسق ہو۔

آیت کے آخر میں اس نامقبولیت کی علت بھی بتادی ہے کہ یہ لوگ جذبۂ ایمانی کے تحت خرچ نہیں کرتے ہیں، کیونکہ ان کے دلوں میں ایمان کی روشنی کا تو گذر ہی نہیں ہے، وہاں تو فسق — جو ضدِ ایمان ہے — کی تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ اور صرف صدقہ ہی پر کیا منحصر ہے فسق کی اس حلقہ بگوشی کی وجہ سے ان کے سارے — بظاہر اچھے — اعمال اکارت ہو جائیں گے:۔

حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خَاسِرِيْنَ ۔ (مائدہ ۔ ۸) — ان منافقوں کے تمام اعمال ضائع ہو گئے اور وہ سراسر گھاٹے میں رہے۔

اور اس حبطِ عمل کا کیا نتیجہ ہوگا:۔

"اللہ تعالیٰ نے منافق مردوں اور منافق عورتوں اور کفار سب سے نارِ جہنم کا وعدہ کر رکھا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور یہی ان کے لئے کافی ہے۔ اور خدا نے ان پر لعنت کر دی ہے، اور ان کے لیے دائمی عذاب ہے۔ (توبہ ۔ ۹)

کفار اور منافقین دونوں کے لیے نارِ جہنم کی سزا تو ضرور ہے، لیکن خدا کہتا ہے کہ منافقین کا مقام کافروں کے مقابلہ میں بہت آگے ہے:۔

اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۔ (النساء ۔ ۲۱) — بے شک منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے۔

اور یہ "قید بامشقت" کی امتیازی سزا بالکل تقاضائے عدل ہے۔ تامل کرنے سے کفر کے مقابلہ میں جرمِ نفاق کی سنگینی بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ کافر کے اندر ساری کج رویوں اور گمراہیوں کے باوجود ضمیر ہوتا ہے اور اس ضمیر میں خودی اور خود داری کی روح ہوتی ہے۔ وہ اپنے مسلک کو حق سمجھ کر اس پر اڑ جاتا ہے اور اس کے خلاف ہر آواز کو باطل یقین کر کے اس کا دشمن بنتا ہے۔ مگر بدبخت اور ننگِ انسانیت منافق اس ایک خوبی سے بھی محروم ہوتا ہے۔ نفس پرستی کے سوا اس کا کوئی مسلک ہی نہیں ہوتا۔ وہ

مادیات کے عشق میں اپنے ضمیر کو بالکل پست، بے حس اور ذلیل بنالیتا ہے اور اس پوری تیاری کے ساتھ خدا کے حضور میں جاتا ہے کہ "درک اسفل" کے سوا کسی اور جگہ رہنے کے قابل ہی نہیں ٹھہرتا

یہ عذاب ان کے لئے لازمی ہے۔ اس قضائے مبرم کو کوئی شے ٹال نہیں سکتی۔ خدا کے نزدیک اپنے حبیب سے بڑھکر کوئی مقبول نہیں، لیکن اس کی دعائیں بھی یہاں کچھ نہیں کرسکتیں:-

"اے پیغمبر ان منافقوں کے لئے تم خواہ دعائے مغفرت کرو یا نہ کرو۔ تم چاہے ان کے لئے ستر مرتبہ بھی دعائے مغفرت کرو تب بھی خدا انہیں کبھی نہیں بخشنے کا" (توبہ - ۱۰)

طبقۂ دوم | دوسرے طبقہ کے انجام سے متعلق اللہ رب العالمین نے ہمارے سامنے کوئی واضح اور طے شدہ فیصلہ نہیں رکھا ہے۔ لیکن اتنا تو اس نے کھول کر کہہ دیا ہے کہ وہ دوزخ کا عذاب ضرور چکھیں گے۔ مثلاً ان ضعفاء کے بارے میں جو ہجرت نہ کرسکے تھے اور کفار کی طرف سے لڑتے ہوئے معرکہ بدر میں مارے گئے تھے، اس نے فرمادیا ہے کہ فَاُولٰئِكَ مَاوٰاهُمْ جَهَنَّمُ (پس اُن کا ٹھکانا جہنم ہے) اسی طرح جو لوگ غزوۂ تبوک میں جانے سے جی چرا رہے تھے اور جو پیچھے رہ گئے تھے ان کے بارے میں ارشاد خداوندی آیا کہ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا (اگر تم لڑائی کے لیے نہ نکلے تو اللہ تعالیٰ تمہیں دردناک عذاب دے گا) يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ۔ (یہ لوگ جہاد سے جی چرا کر خود اپنے کو ہلاک کر رہے ہیں) غرض اس طبقہ کو بھی دوزخ کی ہولناکیوں سے ضرور دوچار ہونا پڑے گا۔ اس ناگزیر انجام سے انہیں نہ تو یہ عذر بچا سکے گا کہ ہمیں ایمان کی صحیح کیفیت اور اس کے مقتضیات کا علم نہ تھا، اور نہ یہ عذر کچھ کام آسکے گا کہ ہم اسلام کے منکر یا بدخواہ اور دشمن نہ تھے۔ خدا کی عدالت دو ٹوک فیصلہ کرے گی اور اس ضعف ایمانی اور جہالت و بے خبری کا انجام بھی ظاہر ہو کر ہی رہے گا۔ ہاں طبقہ اولیٰ کے مقابلہ میں ان کی سزا بہرحال ہلکی ہوگی۔ ان کے لئے درک اسفل نہ ہوگا۔ نہ ان کے متعلق قرآن نے لعنت کی وعید سنائی ہے اور نہ ہی اس امر کا اعلان کیا ہے کہ وہ — طبقہ اولیٰ کی طرح — دوزخ میں ابد

تک رہیں گے۔ پھر ان کی سزاؤں کا اندازہ کیا ہے؟ اس کی صحیح تعیین کس طرح کی جائے؟ یہ سوال ہمارے طے کرنے کا نہیں۔ مالک یوم الدین کی حکمت، رحمت اور مشیئت ہی اسے طے کرے گی۔ بندوں کو تو بہرحال اس کی تمام صفات سے صرف اس کی صفت رحمت ہی کے دامن کو پکڑنا چاہیئے۔ رَبَّنَا وَسِعْتَ کُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا۔

اسلامی جماعت میں منافقین کی حیثیت | اُن کی اُخروی زندگی کا حشر تو آپ سن چکے۔ آیئے اب اس امر پر غور کریں کہ اہل ایمان کو ان منافقوں کے ساتھ دنیا میں کس طرح پیش آنا چاہیئے؟ اور ان کے ساتھ امت مسلمہ کے سیاسی، معاشرتی اور عمرانی تعلقات کی نوعیت کیا ہونی چاہئے؟ تو جیسا عرض کیا جا چکا ہے، اُخروی احکام کی طرح دنیوی احکام کے لحاظ سے بھی دونوں طبقوں کی نوعیت جداگانہ ہے۔

طبقۂ اوّل کی حیثیت | پہلے طبقہ کے بارے میں قرآن مجید کا بنیادی نقطۂ نظر یہ ہے کہ مومن تو اللہ کی پارٹی ہیں لیکن یہ منافق شیطان کی پارٹی ہیں، اُولٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ (مجادلہ-۳) اس لیے خواہ یہ لاکھ اظہار ایمان کریں، امت اسلامیہ —— یعنی حزب اللہ —— سے ان کا کوئی ربط نہیں، یہ کبھی بھی جماعت میں شمار نہ کیے جائیں:۔

وَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ إِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ	اور یہ منافق قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ وہ تمہاری
وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ۔ (توبہ)	جماعت میں ہیں حالانکہ وہ تم میں سے نہیں ہیں

بلکہ:۔

هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ۔ (منافقون-۱)	یہ منافق تمہارے دشمن ہیں، ان سے خبردار رہو۔

کیونکہ دشمن سے کبھی بھی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ بالخصوص ایسا دشمن جو دوست نما ہو۔ اُس کی خطرناکیوں کا پوچھنا ہی کیا۔ ایسے دشمنوں سے کھلے دشمنوں (کفار) کی بہ نسبت دو چند خبردار اور متنبہ رہنے کی ضرورت ہے۔ پھر اس "فَاحْذَرْهُمْ" کی عملی صورت یہ بتائی گئی ہے کہ:۔

فَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ أَوْلِيَاءَ	تو ان منافقوں میں سے اپنے ساتھی اور دوست

..... وَلَا تَتَّخِذُوا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ...... اور ان میں سے کسی کو نہ اپنا دوست سمجھو اور نہ مددگار۔ (النساء - ۱۲) نہ بناؤ

یعنی ان لوگوں سے کامل علیحدگی اختیار کرلینی چاہئے۔ انہیں اپنے معاشرتی، انتظامی، تعلیمی اور سیاسی معاملات سے بالکل دور رکھنا چاہئے اور ان کا مکمل بائیکاٹ کرکے اپنی جماعت سے الگ کر دینا چاہئے۔ اس بائیکاٹ میں کسی مداہنت کو راہ نہیں دی جاسکتی۔ خصوصاً سیاسی معاملات میں نہ تو ان سے کوئی مشورہ لیا جاسکتا ہے، نہ اپنی جماعت کے اسرار اور رموزِ مملکت سے انہیں آگاہ کیا جاسکتا ہے۔ اور کسی معاملہ میں ان حضرات کی قیادت و رہنمائی قبول کرنے کا تو تصور تک نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ آنحضرت کو بار بار متنبہ کرتا ہے کہ:۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِيْنَ وَالْمُنَافِقِيْنَ ۝ (الاحزاب - ۱) اے نبی! اللہ سے ڈرو اور ان کافروں اور منافقوں کی کسی بات کی پیروی نہ کرو۔

جب ایک مرتبہ کسی آزمائش میں ان کی منافقت، موقع پرستی اور سیہ باطنی بے نقاب ہوجائے تو حتی الوسع انہیں کسی جہاد میں عام مسلمانوں کے ساتھ نہ شریک کیا جائے، کیونکہ اگرچہ ان کی شرکت سے بظاہر مسلمانوں کی جمعیت بھاری اور ان کی قوت زیادہ نظر آئے گی، لیکن دراصل ان کی شرکت نظامِ اسلامی کے حق میں زہر ہوگی، اس لیے کہ وہ میدانِ جہاد میں بھی اپنی شرارتوں اور فتنہ انگیزیوں سے باز نہ آئیں گے اور اسلامی جماعت کی کمزوری اور پراگندگی ہی کا سبب بنیں گے۔ لَوْ خَرَجُوا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاَاوْضَعُوا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ۔ (التوبہ -) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کے بارے میں، جو غزوہ تبوک کے آلام و مصائب کا اندازہ کرکے گھر بیٹھ رہے تھے، حکم صادر کیا کہ۔

"اے نبی اگر اللہ تعالیٰ تمہیں زندہ و سلامت ان منافقوں کے کسی گروہ میں واپس لے جائے اور یہ آئندہ کسی موقع پر جنگ کے لئے نکلنے کی اجازت مانگیں تو ان سے کہنا کہ تم میرے ساتھ کبھی بھی جنگ

کے لیے نہ چلنے پاؤ گے اور نہ میرے ہمراہ کسی دشمن سے لڑنے پاؤ گے۔ تم نے پہلی مرتبہ (میرے ہمراہ جنگ کے لیے چلنے کے بجائے) گھر بیٹھ رہنے کو پسند کیا تو اب بھی پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ (توبہ ـ ۱۱)

اور یہ حکم اس وقت اور مؤکد اور ضروری ہو جاتا ہے جب مقابلہ آسان ہو، تکالیف کا اندیشہ کم ہو اور نتیجہ جنگ کے طور پر بہت کچھ فوائد حاصل ہونے کی توقع ہو۔ ایسے وقت میں منافق بڑی جانفروشی کا اظہار کرتا ہے، سراپا پیکر اخلاص بن جاتا ہے اور جنگ میں سب سے آگے آگے چلنے کی سعی کرتا ہے۔ ـــ حالانکہ یہی ایمان کا جھوٹا مدعی کڑی آزمائشوں اور سخت قربانیوں کے وقت، اس سے پہلے، ہزاروں حیلے بہانے کر کے گوشۂ عافیت میں روپوش ہو چکا ہوتا ہے ـــ سو امام وقت کو چاہئے کہ ایسے لوگوں کو ہرگز ساتھ نہ چلنے دے، جیسا کہ سفر حدیبیہ سے پیچھے رہ جانے والوں کی نسبت اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کو حکم دے دیا تھا کہ خیبر کی سہل الحصول غنائم کے لیے جب تم نکلنا تو ان لوگوں کو ہرگز ساتھ نہ لے جانا (قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا) خواہ وہ اپنی اسلامیت کا لاکھ مظاہرہ کریں۔ ہاں اگر حقیقت میں ان کے دل بدل جائیں اور وہ واقعی اپنے کو مخلص ثابت کرنا چاہتے ہوں اور اپنے اندر ایمانی قوت پیدا کر کے اسلام پر جان نثار کرنے کے آرزومند ہوں اور محض فائدے کے لیے جنگ میں نہ جانا چاہتے ہوں تو ان سے کہنا چاہیے کہ ابھی تو خاموش بیٹھو، تمہارے گذشتہ اعمال و اطوار تمہاری منافقت اور بزدلی کا فیصلہ دے چکے ہیں۔ اگر تم اس فیصلہ کو منسوخ کرانا اور اپنی سابق روش سے تائب ہو کر اپنے کمال ایمان اور خلوص اسلام کا ثبوت پیش کرنا اور اپنی پیشانی سے بزدلی و نفاق کا کلنگ مٹانا چاہتے ہو تو انتظار کرو ایک ویسی ہی سخت اور کڑی آزمائش کا جو عنقریب ایک قوی دشمن کے ساتھ مقابلہ کی شکل میں پیش آنے والی ہے۔ کیونکہ حقیقت تو اسی وقت واضح ہو گی۔ اس وقت، جبکہ قربانیوں کا اندیشہ کم اور متاع دنیوی کے حصول کا قرینہ غالب ہے، تمہاری صحیح جانچ کا کوئی موقع نہیں۔ قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى

قَوْمٍ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ یُسْلِمُوْنَ فَاِنْ تُطِیْعُوْا یُؤْتِكُمُ اللّٰهُ اَجْرًا حَسَنًا وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا كَمَا تَوَلَّیْتُمْ مِّنْ قَبْلُ یُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا۔ (فتح - ۲)

پھر ان سے الگ تھلگ رہنے میں اتنی شدید احتیاط برتنی چاہیے کہ اگر کبھی ان کی طرف سے بظاہر کسی نیک کام کی تحریک ہو تو بہتر یہ ہے کہ اس سے بھی تعاون نہ کیا جائے۔ اور اگر اس "نیک" تحریک کی تہ میں کوئی شیطنت جھلکتی نظر آ جائے تب تو اس کی تمام تر ظاہری خوبیوں اور چمک دمک کے باوجود اس کی علی الاعلان سخت مخالفت کرنی چاہیے۔ دیکھیے، مسجد کی حرمت مسلمان کی نگاہ میں کتنی زیادہ ہے اور اس کو بنانے اور آباد کرنے کی سعی کتنی مشکور اور محمود۔ مگر جب شیطان کے ایجنٹوں نے اسی مقدس اور محترم شے کو اپنا آلہ کار بنانا چاہا اور نیکی واحسان کے بڑے بڑے دعووں کے ساتھ مسجد قبا کے مقابلہ میں ایک اور مسجد بنا کر کھڑی کر دی (دعوی یہ تھا کہ کمزور اور بوڑھے مسلمانوں کو رات کے اندھیرے میں زیادہ دور نہ جانا پڑے حالانکہ نیت صرف یہ تھی کہ مسلمانوں کی جماعت میں جو اتحاد اور ائتلاف موجود ہے اسے انتشار سے بدل دیا جائے) تو اللہ تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ مٹی اور پتھر کی اس عمارت کو جسے یہ منافق مسجد کہتے ہیں نیکی کا مرکز نہ سمجھنا۔ یہ مسجد تو شر کا سرچشمہ ہے جس کی سوتیں عداوت حق کے جذبات سے پھوٹی ہیں، جس کی تعمیر غضب الٰہی کی سرزمین پر ہوئی ہے اور جس کا رُخ ٹھیک باب جہنم کی طرف ہے اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰی تَقْوٰی ...... اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰی شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ۔ (توبہ - ۱۳) اس لیے مسجد کے نام اور اس کے احترام و تقدس کے دھوکے میں نہ آؤ، تمہیں اس سے کسی قسم کا تعلق نہ ہونا چاہیے یہاں تک کہ اس میں تم کو کھڑا بھی نہ ہونا چاہیے لَا تَقُمْ فِیْهِ اَبَدًا۔

اس ترک موالات کی آخری حد یہ ہے کہ ایسے منافقوں کی نہ تو نماز جنازہ پڑھی جائے اور نہ ان کے لیے دعائے مغفرت کی جائے :-

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمۡ عَلٰى قَبۡرِهٖ ۔ (توبہ - ۱۱)

اور ان منافقوں میں سے اگر کوئی مر جائے تو کبھی اس کی نماز جنازہ نہ پڑھو اور نہ اس کی قبر پر دعائے مغفرت کرنے کے لیے کھڑے ہو۔

اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم منافقوں کی نماز جنازہ پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ عبداللہ ابن اُبی جیسے منافق کی بھی آپ نے نماز جنازہ پڑھی۔ اسی موقع پر یہ حکم آیا اور اس کے آنے کے بعد آپ نے کسی منافق کی نماز نہیں پڑھی۔

یہاں تک جو احکام بیان ہوئے ہیں وہ ان تمام منافقین کے حق میں نافذ ہوں گے جو اسلام اور کفر دونوں کی ماہیت سمجھنے کے بعد کفر کی پیروی اختیار کریں اور خفیہ یا علانیہ اسلام کے مقابلہ میں کفر کو تقویت دیں، اور اس کے باوجود اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے رہیں لیکن اس مقام سے آگے بڑھنے پر ایک سوال اور پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس عدم موالات کے باوجود بحیثیت ایک جماعت کے ان کے ساتھ ملت اسلامیہ کا سیاسی برتاؤ کس طرح کا ہوگا۔ کیا محض ان سے الگ تھلگ ہو رہنے اور انہیں اپنی جماعت سے عملاً خارج کر دینے ہی پر اکتفا کیا جائے گا یا کوئی اثباتی طرزِ عمل بھی اختیار کیا جائے گا؟ سو قرآنی احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لحاظ سے اس قسم کے منافقوں میں تفریق کی جائے گی۔ اگرچہ اپنی نفسانی خباثت اور اسلام دشمنی کے لحاظ سے تو یہ سب ایک ہی جماعت ہیں۔ لیکن جس طرح تمام کفار اپنے مشرکانہ عقائد اور کافرانہ اعمال کے لحاظ سے ایک ملت ہونے کے باوجود دو مختلف حیثیتیں رکھتے ہیں، یعنی بعض تو کھلے محارب قرار پاتے ہیں اور ان سے کسی قسم کا ربط و ضبط روا نہیں، اور بعض محارب اور مباح الدم نہیں ہوتے اور ان سے عام معاشرتی تعلقات رکھنے اور حسن سلوک سے پیش آنے کی اجازت ہے، اسی طرح ان درجہ اول کے منافقین میں بھی فرق مراتب ہے۔

ایک تو وہ ہیں جو اسلام دشمنی میں حد سے بڑھے ہوئے اور اپنی سرگرمیاں اسلام کی بیخ کنی کے

لیے وقف کیے ہوئے ہوں، اور دن رات مسلمانوں پر تباہی لانے کی گھات میں لگے رہتے ہ
اور کفر و کفار کی علی الاعلان وفادارانہ خدمات بجا لا رہے ہوں۔ ان کے متعلق شروع میں اللہ
نے صرف یہ تنبیہ نازل کی تھی کہ:۔

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنَافِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ	اگر یہ منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي	مدینہ میں جھوٹی افواہیں اڑانے والے اپنی حرکتوں
الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ	نہ آئے تو اے پیغمبر ہم تمہیں ان کے خلاف ایک دا
فِيْهَا اِلَّا قَلِيْلًا مَّلْعُوْنِيْنَ اَيْنَمَا ثُقِفُوْا	دیں گے پھر وہ مدینہ میں تمہارے پڑوس میں چند
اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا۔ (الاحزاب۔۸)	زیادہ ٹھیرنے نہیں پائیں گے، ہر طرف سے ان

پڑ رہی ہوگی اور جہاں ملیں گے پکڑے جائیں گے اور بری طرح قتل کیے جائیں گے۔

کچھ مدت گذرنے پر یہ تنبیہ اور تہدید، جو مستقبل سے متعلق تھی، حالیہ احکام کی صورت
یوں نازل ہوئی:۔

فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْا	اگر یہ فتنہ پرداز منافق تم سے کنارہ کش نہ رہ
اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْا اَيْدِيَهُمْ	تمہیں صلح و آشتی کا پیغام دیں اور نہ اپنے ہا
فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ	روکیں تو انہیں پکڑو اور قتل کرو، جہاں بھی
وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ	اور (منافقوں میں سے) یہی وہ گروہ ہے جن
سُلْطَانًا مُّبِيْنًا۔ (النساء۔۱۲)	ہم نے تمہارے لیے کھلی حجت دے دی ہے۔

دوسری جگہ فرمایا گیا:۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِيْنَ	اے نبی! کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور
وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ۔ (سورہ توبہ۔۱۱ نیز سورۂ تحریم ۲)	ساتھ سختی سے پیش آؤ۔

ان آیات میں منافقوں کی جو حیثیت بیان کی گئی ہے وہ ان کفار کی حیثیت سے یک سر مو بھی مختلف نہیں ہے جو ملت اسلام کے خلاف نبرد آزما ہوں پس ایک مسلمان کے لیے اس غیر مبہم فرمان الٰہی کی رو سے ضروری ہے کہ ہر اس شخص کے خلاف، جو معتبر قرائن کی بنا پر زیر بحث طبقہ منافقین میں شمار ہونے کے قابل ہو، اپنے سارے ذرائع سے اٹھ کھڑا ہو۔ امام جماعت پر فرض ہے کہ ان دجالوں کے خلاف اعلان جنگ کر دے، انہیں بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکے اور جماعت کو ایسے مہلک عناصر سے یکلخت پاک کر دے۔ اسی طرح عام مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ ان سے ہر طرح کے تعلقات منقطع کر لیں، ان کے خلاف ہر ممکن ذریعۂ مجاہدہ اختیار کریں اور ان کا سوسائٹی میں سانس لینا دوبھر کر دیں۔ خصوصاً جو بدقسمت مسلمان اپنا کوئی سیاسی مرکز اجتماع اور اپنا کوئی امیر نہ رکھتے ہوں ان کے لیے تو معاشرتی بائیکاٹ ہی ان زہریلے جانوروں سے بچنے کا واحد ذریعہ ہے لیکن اگر نام نہاد مسلمان ان منافقوں کے ساتھ اپنے وطنی، نسلی، خاندانی، معاشی اور معاشرتی تعلقات کا لحاظ کر کے، یا ان سے فائدے کی امیدیں رکھ کر، یا ان کی طاقت سے مرعوب ہو کر، مداہنت کو راہ دیں تو انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ کشتی کبھی بھی ساحل مراد پر نہیں پہنچ سکتی جس پر سوار ہونے والوں میں سے بعض لوگ اس میں سوراخ کر رہے ہوں اور دوسرے ان کا ہاتھ پکڑنے کے بجائے خاموشی سے طرح دیئے جا رہے ہوں۔ رب العزت کی قسم ایسی کشتی ڈوب کر رہے گی اور صرف سوراخ کرنے والے ہی اس کے ساتھ نہ ڈوبیں گے، بلکہ خاموشی سے تماشہ دیکھنے والے بھی موجوں کی نذر ہو جائیں گے۔ وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً۔

رہ گئے درجہ اول کے وہ منافق جو اسلام کے خلاف عملاً دشمنی نہ کرتے ہوں اور نہ اسلام کے دشمنوں کی اعانت کرتے ہوں، تو ان کے معاملہ میں اگرچہ بائیکاٹ اور عدم موالات کے اُن تمام احکام پر عمل کیا جائے گا جن کا اوپر ذکر ہوا، لیکن انہیں محارب نہیں قرار دیا جائے گا اور نہ

ان کے خلاف جہاد کیا جائے گا۔ جیسا کہ خود مذکورہ بالا آیات کے انداز بیان سے مستنبط ہوتا ہے۔ کیونکہ اُن منافقوں کے خلاف تلوار اٹھانے کا حکم دیتے ہوئے اس شرط کا سب سے پہلے تذکرہ کر دیا گیا ہے کہ لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ (اگر یہ منافق اپنی سرگرمیوں سے باز نہ آئے) اور فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْا اَيْدِيَهُمْ (اگر یہ تمہاری مخالفت نہ چھوڑیں اور تم سے صلح کے طالب نہ ہوں اور تمہارے مقابلہ سے اپنے ہاتھوں کو نہ روکیں)۔ اس کے علاوہ ایک مستقل آیت میں اسی طرح کے منافقوں کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ :-

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا (النساء-۹)	یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کے راز اللہ خوب جانتا ہے۔ پس اے پیغمبر ان سے کوئی تعرض نہ کرو، انہیں (ان کے انجام سے ڈرا کر) نصیحتیں کرو اور دل نشین پیرایہ میں انہیں سمجھاؤ۔

تبلیغ حق اور تذکیر و ہدایت تو رحمۃ للعالمین کا واحد مشن تھا جسے آپؐ نے پتھروں کی بارش اور تلواروں کے سایہ میں بھی فراموش نہ کیا، اس لیے ان منافقوں کو بھی سچائی کی طرف بلانے پر آپ ہمہ وقت مامور تھے۔ لیکن اس وعظ و پند اور ان کی نفاق پرستی سے صرفِ نظر کر لینے کا جو حکم دیا گیا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ کی حدود سے باہر ہیں یا لَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ کے حکم سے مستثنیٰ ہیں، یا لَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا کی عمومیت سے خارج ہیں۔ یہ ہیں تو بہر حال درجہ اول کے منافق، لہذا سوشل بائیکاٹ کے احکام و ہدایات کے سلسلے میں تو یہ سرگرم عناد و قتال منافقوں کے ساتھ برابر رکھے جائیں گے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ خُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ کی زد ان پر نہیں پڑتی۔ ورنہ باقی ہر حیثیت سے عام مسلمانوں کو اس قسم کے منافقوں سے عدم موالات کی اس پالیسی

پر عمل پیرا ہونا چاہیے جس کی توضیح سطور بالا میں کی جا چکی ہے۔ اگر مسلمان ایسا نہ کریں گے تو — خدا کی سنت کے مطابق — نفاق، کور باطنی اور بے ضمیری کا زنگ آہستہ آہستہ ان کے آئینۂ قلب پر بھی چڑھنے لگے گا اور ایک وقت آئے گا کہ ایمان کی ساری روشنی اس کے نیچے مستور ہو جائے گی۔

طبقۂ دوم کی حیثیت | اس کے بعد دوسرے طبقہ کو لیجئے جو ضعفاء اور جہلاء پر مشتمل ہے۔ ان کے بارے میں قرآن زیادہ تفصیلات نہیں پیش کرتا۔ لیکن ایک جامع اصول اس نے ایسا بیان کر دیا ہے جو ہر تفصیل طلب امر کے سلسلے میں رہنمائی کے لیے کافی ہے۔ جو لوگ ایمان کا دعویٰ تو کر چکے تھے لیکن جب ہجرت کا موقع آیا تو وہ قربانی کے راستہ میں پیچھے رہ گئے ان کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے کہ:-

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ط (انفال - ۱۰)	جو لوگ ایمان تو لائے لیکن انہوں نے ہجرت نہ کی ان کی ولایت سے تمہارا کوئی تعلق نہیں جب تک کہ وہ بھی تمہاری طرح ہجرت نہ کریں۔ ہاں اگر دین کے معاملہ میں وہ تم سے مدد کے طالب ہوں تو تم پر ان کی مدد فرض ہے بشرطیکہ مدد کسی ایسی قوم کے خلاف نہ ہو جس سے تمہارا کوئی معاہدہ ہو چکا ہو۔

اس آیت میں ان کی حیثیت بالکل بے نقاب کر دی گئی ہے۔ اس بارے میں تو یہ دوسرے پختہ کار منافقوں ہی کی سطح پر ہیں کہ یہ مسلمانوں کے اولیاء نہیں ہو سکتے۔ لیکن اس اشتراک کے اندر بھی اختلاف معنی کی جھلک موجود ہے اور آیت کے مختلف ٹکڑے صاف بتا رہے ہیں کہ اس عدم موالات میں اور اس قطع تعلقات میں جس کا طبقۂ اولیٰ کے منافقوں

رے میں حکم ہوا ہے، بہت کافی فرق ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ جماعت اسلامی میں شمار
ہیں ہوں گے، بعینہٖ اس طرح جس طرح کہ طبقہ اولیٰ کے منافقین جماعت کے ارکان
ہیں سمجھے جا سکتے لیکن اس طبقۂ منافقین کی طرح نہ تو ان پر سختی اور غلظت کی جائے گی،
ان سے قتال کیا جائے گا، نہ انہیں قتل اور گرفتار کیا جائے گا، بلکہ اگر اُن کفار کے خلاف
جن کے نرغہ میں یہ گھرے ہوئے ہوں، یہ امداد طلب کریں اور اُس امداد کے ذریعہ حلقۂ کفر
سے اپنے کو نجات دلانا اور حقیقی اسلامی زندگی بسر کرنے کے لیے آزاد ماحول پیدا کرنا چاہیں تو جماعت
سلامی پر ان کی اعانت فرض ہے، بشرطیکہ کافروں کی وہ قوم جس کے خلاف یہ ضعفاء ان
عانت مانگ رہے ہیں، ملت اسلامیہ کی معاہد قوم نہ ہو

اسی طرح عام انسانی سلوک اور حسن معاشرت کے لحاظ سے یہ لوگ بہت زیادہ توجہ اور
ہمدردی کے مستحق ہیں اور مسلمانوں کا اخلاقی فرض ہے کہ ان پاشکستہ اور کم ہمت انسانوں کو جو
یمان کی صبر آزما گھاٹیوں میں تھک کر بیٹھ جاتے ہیں، ہر ممکن سہارا دیں، انہیں ایمان کے مقتضیات
سے بار بار آگاہ کریں، وعظ و پند کے ذریعہ انہیں ان کی زندگی کا حقیقی مشن اور انسانیت کا فرض منصبی
د دلائیں، ضعف ایمان کے دینوی اور اخروی خسران سے ڈرائیں یہی حکمتِ عملی قرآن حکیم
نے ان کے متعلق اختیار کی تھی۔ اس نے کبھی بھی ان سے لڑنے بھڑنے یا انہیں قتل کرنے یا ان
سے یکسر تعلقات منقطع کر لینے کی تلقین نہیں فرمائی۔ بلکہ جب کبھی ان کو اس نے مخاطب کیا، ہر مرتبہ
نہیں عذابِ آخرت کی ہولناکیوں کو یاد دلا کر متنبہ کیا کہ اس حالت سے، جو حالت نفاق ہے، نکلو
ر پوری طرح شیوۂ تسلیم و رضا اختیار کرو ورنہ دوزخ کی سختیاں جھیلنے کے لئے آمادہ رہو۔ چنانچہ
ی آیت جس میں مکہ سے ہجرت نہ کرنے والے ضعفاء کا ذکر ہے، اس میں اُن کے انجام کے متعلق
رآن نے صرف اتنا ہی کہہ کر خاموشی اختیار کر لی کہ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ۔ اس کے

آگے اس نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن اسی جگہ اگر سچّے منافقوں کا تذکرہ ہوتا تو صرف اسی وعید پر اکتفا نہ کی جاتی بلکہ مسلمانوں کو حکم دیا جاتا کہ خُذُوهُمْ وَاقْتُلُوهُمْ (انہیں پکڑ پکڑ کر قتل کرو) جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ (کفار اور منافقین سے جہاد کرو اور ان پر سختی کرو)۔

اور یہ جو انہیں بار بار عذابِ قیامت سے ڈرایا جاتا تھا تو اس کی حکمت یہی تھی کہ جن کے دلوں میں ایمان کی روشنی ہو وہ کفر کی تاریکیوں سے پورے کے پورے باہر نکل آئیں اور ہمہ تن مسلم بن جائیں، اور ایمان میں جو خامی رہ گئی ہے، آخرت کے ہولناک تصوّر سے وہ دور ہو جائے یہی حکمتِ اصلاح و تبلیغ آج بھی سچے مسلمانوں کو اختیار کرنی چاہئے۔ ہاں یہ احتیاط ہے کہ مَا لَكُمْ مِنْ وَلَايَتِهِمْ مِنْ شَيْءٍ کا فرمان نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے، جو بے شمار حکمتوں اور دانائیوں کا حامل ہے۔ باوجود ہر طرح کی ہمدردی اور شدت اعتنا کے یہ لوگ اس کے سزاوار ہرگز نہیں ہیں کہ انہیں حزب اللہ کا رکن سمجھا جائے اور انہیں وہی جماعتی اور سیاسی حقوق دیئے جائیں جو حقیقی مسلمانوں کا حصہ ہیں۔ نہیں، نہ تو امت کے جماعتی حقوق سے یہ لوگ مستفید ہو سکتے ہیں، نہ انہیں نظم و نسق ملّی میں کسی طرح شریک و سہیم بنایا جا سکتا ہے، اور نہ اسلامی رموز و مصالح کے بارے میں ان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے، اور ان میں سے کسی کو ملّت کا قائد بنانے کا تو اس وقت تک تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ قومی و ملّی تباہی اور ہلاکت کے محضر نامہ پر دستخط نہ کر دیئے جائیں۔

طبقۂ سوم کی حیثیت | تیسرے طبقہ کا، جس کا نفاق دراصل جہالت اور ناواقفیت پر مبنی ہے، اس سے ذرا مختلف حکم ہے۔ اس طبقہ کے لوگ جو اسلام سے ناواقف ہونے کے باعث کافرانہ خیالات اور کافرانہ طرزِ زندگی رکھتے ہیں، اور اسی ناواقفیت کی وجہ سے اپنے آپ کو مسلمان

سمجھتے ہیں، ان کو محض ان کے ناموں اور ان کی پیدائش کا لحاظ کر کے مسلمان سمجھنا غلطی ہے یہ درا صل اس کے مستحق ہیں کہ ان کے سامنے اسلام اُسی طرح پیش کیا جائے جس طرح غیر مسلموں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ پہلے انہیں اسلام کے اصول و نظریات سے اچھی طرح باخبر کیا جائے اور واضح طور پر اسلامی صراط مستقیم اور غیر اسلامی سبیل الطاغوت کا فرق انہیں سمجھا دیا جائے، پھر اُن سے صاف صاف کہہ دیا جائے کہ یا تو اپنے دل و دماغ کو اسلام کے حوالے کر دو اور زندگی کی ہر منزل میں اسلام جو ہدایت دے اس پر بے چون و چرا عمل کرو، ورنہ اسلام سے علیحدگی کا کھلے طور پر اعلان کر دو اور اپنے نام بدل ڈالو۔ اگر وہ علم حاصل ہونے کے بعد اسلام قبول کریں تو جماعت اسلامی میں شمار کیے جائیں، اور اگر علانیہ اسلام سے نکل کر اپنے نام بدل لیں تو انہیں مرتد نہیں بلکہ کافر قرار دیا جائے، کیونکہ وہ مسلمان تھے ہی نہیں کہ ان کے بارے میں ارتداد کا لفظ استعمال کیا جا سکے۔ لیکن اگر اس وضوح حق کے بعد بھی وہ اپنی اسی دو رنگی پالیسی پر چلتے رہیں، اور ایک پاؤں کشتی اسلام میں اور دوسرا کشتی کفر میں رکھ کر زندگی کا سفر طے کرنے کی کوشش کریں تو اس صورت میں مسلمانوں کا فرض ہے کہ بلا کسی رو رعایت کے ان کا پاؤں پکڑ لیں اور کشتی اسلام سے بجبر اس کو نکال پھینکیں۔

اس طبقہ کے جو لوگ اسلام سے جاہل اور غیر اسلامی عقائد و اعمال کے پیرو ہونے کے باوجود محض قومی "تعلق کی وجہ سے مسلمانوں کی دنیوی ترقی اور سیاسی حقوق اور مادّی غلبہ کے لیے جد و جہد کرنے کے لیے اٹھتے ہیں، ان سے بھی مسلمانوں کو دھوکا نہ کھانا چاہیے۔ ان کی کسی سیاسی، یا عسکری، یا تعلیمی تحریک سے مسلمان اپنی حقیقی منزل مقصود کو کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ یہ ملت اسلام کے قائد بننے کے ہرگز اہل نہیں، بلکہ اس کے مستحق ہیں کہ پہلے ان کے سامنے اسلام پیش کیا جائے۔ جب تک یہ ایمان لا کر واقعی احکام اسلامی کے آگے سر نہ جھکا دیں،

ان کو قیادت تو در کنار، ملت کی صفِ آخر میں بھی بمشکل کھڑا رہنے دیا جا سکتا ہے۔

یہ ہے نفاق کی حقیقت اور یہ ہیں منافقین کی علامتیں اور ان کے احکام۔ ہر مسلمان، جو حقیقت میں مسلمان رہنا چاہتا ہو، اسے چاہیے کہ اپنے مقامی حالات اور اپنے گرد و پیش کے لوگوں پر نظر ڈال کر منافقوں کو پہچانے اور ان میں تمیز کرے اور ان مطالبات قرآنی سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے۔ اس بارے میں، ملک، نسل، قوم، وطن، خاندان اور خون کے تعلقات یا وقتی مصلحتیں اسے مداہنت پر آمادہ نہ کریں۔ جو لوگ کسی مصلحت یا کسی کمزوری کی بنا پر منافقین کے ان طبقوں میں سے کسی طبقہ کے ساتھ مداہنت برتیں گے وہ آخر کار خود اپنے ایمان کو خطرے میں ڈال دیں گے۔

ماہنامہ

پیغامِ حق

ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ کے افکار، عقائد اور پیغام کا علم

مرتبہ

سیّد محمد شاہ ایم۔ اے

و

غلام سرور فگار

ظفر منزل تاجپورہ لاہور

حیاتِ نو

تُو اے اسیرِ مکاں، لامکاں سے دُور نہیں

وہ جلوہ گاہ ترِے خاکداں سے دُور نہیں

وہ مرغزار کہ بیمِ خزاں نہیں جس میں

غمیں نہ ہو کہ ترِے آشیاں سے دُور نہیں

یہ ہے خلاصۂ علمِ قلندری کہ حیات

خدنگِ جستہ ہے لیکن کماں سے دُور نہیں

فضا تری مہ پرویں سے ہے ذرا آگے

قدم اُٹھا یہ مقام آسماں سے دُور نہیں

کہے نہ راہنما سے کہ چھوڑ دے مجھ کو!

یہ بات راہروِ نکتہ داں سے دور نہیں

اقبالؒ

سالانہ قیمت

عوام سے دو روپے بارہ آنے　　　　رؤسا سے پانچ روپے

فہرست مضامین

جلد ۴	مارچ ۱۹۴۱ء	عدد ۳

سید محمد شاہ ایم اے پرنٹر پبلشر کے اہتمام سے دین محمدی الیکٹرک پریس لاہور میں طبع ہو کر دفتر

سالہ "پیغام حق" ظفر منزل تاج پورہ لاہور سے شائع ہوا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سخنہائے گفتنی

بیا بمجلسِ اقبال و یک دو ساغر کش
اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

اقبال اکیڈیمی کے اغراض و مقاصد اب محتاجِ تشریح نہیں رہے گذشتہ ڈیڑھ سال کے اندر کارپردازوں نے جتنی سرگرمی سے کام کیا ہے اُس کا ثبوت رسالہ پیغامِ حق کی باقاعدہ اشاعت اور دیگر مطبوعات ہیں جو اس دوران میں اقبال اکیڈیمی کی جانب سے شائع ہوئیں۔ موجودہ جنگ کی وجہ سے کاغذ کی گرانی کا مسئلہ اتنا حوصلہ فرسا ہے کہ ناشرانِ کتب کے قدم اس وادی میں آگے نہیں بڑھتے اور اگر گذشتہ سالوں کے اعداد و شمار کا اس سال سے مقابلہ کیا جائے تو کتابوں کی اشاعت میں ایک معتدبہ کمی معلوم ہوگی۔ اس کے باوجود ایک ایسے ادارہ کی کوششیں یقیناً قابلِ داد ہیں جس نے اپنے ابتدائی مراحل ہی میں نہایت استقلال اور ثابت قدمی کے ساتھ اِن تمام موانعات کا مقابلہ کیا اور اپنے قارئینِ کرام تک ایسی مطبوعات پہنچائیں جن کی اس زمانہ میں اشد ضرورت ہے۔

سلسلۂ مطبوعات کا حسنِ آغاز یادِ اقبال سے ہوا یہ مجموعہ ان نظموں پر مشتمل ہے جو علامہ اقبالؒ کی وفات کے بعد لکھی گئی تھیں اِن کے جمع کرنے کا ایک مقصد تو یہ تھا جسے محرّرِ عرض القادر نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔

"کلامِ اقبال کو جو عالمگیر قبولیت سر محمد اقبال کی زندگی میں ہوئی اُس کی مثال ادبیات کی تاریخ میں کمیاب ہے اور جس فراخدلی کے ساتھ اُن کے ہمعصر شعراء نے اُن کی وفات کے بعد اُن کے کمال کا اعتراف کیا ہے وہ بالکل بے مثل ہے مجھے کوئی اور نظیر معلوم نہیں کہ کتنے شاعروں نے اپنے کسی ہمعصر کے کلام کی داد ایسی بے ساختگی سے دی ہو جیسی اقبال کے عہد کے شعراء نے دی ہے۔"

اس ادبی اہمیت کے علاوہ ہمارے پیشِ نظر یہ حقیقت بھی تھی کہ اسلام کا آغاز ایک زبردست المیہ سے ہوا تھا اس لئے ہمیں اس ادارہ کی ابتداء بھی اسی سنتِ ابراہیمی کی تقلید میں کرنی چاہئے۔ اقبالؒ نے اس حقیقت کو کتنے سادہ اور واضح الفاظ میں بیان کیا ہے ؎

غریب و سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم
نہایت اُس کی حسینؓ ابتدا ہے اسماعیلؑ

حاشاللہ ہماری غرض اس سے نہ شخصیت پرستی ہے نہ مرثیہ خوانی۔

اس مجموعہ کی قدردانی نہ صرف عام اربابِ ذوق نے کی بلکہ بہاولپور ریاست کے محکمۂ تعلیم نے اسے سکولوں کی لائبریریوں اور انعامی کتب کے طور پر منظور کیا۔ اس کے علاوہ پنجاب میں بھی محکمۂ تعلیم کے انبالہ ڈویژن میں یہ منظور ہو چکی ہے۔

اس سلسلہ کی دوسری کتاب "حیات محمد عبدہٗ" ہے جن اصحاب نے اِس کا مطالعہ کیا ہے اُن سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ ہندوستان کو مصر کے حالات سے ایک بڑی حد تک مماثلت ہے چونکہ محمد عبدہٗ علامہ جمال الدین افغانی کے شاگردِ رشید اور رفیق کار تھے اور اُن کے افکار اور کردار اپنے فاضل استاد کے آئینہ دار ہیں اس لئے اس کتاب کو شائع کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو لازم ہے کہ وہ بھی اُن اصلاحی اُمور سے واقفیت حاصل کریں جن کو اس قائد نے مصر میں رائج کرنا چاہا اور اُن مشکلات کا اندازہ کریں جو اُن کو قدم قدم پر پیش آئی تھیں۔

تیسری کتاب تعلیمات اقبال ہے جو پروفیسر محمد یوسف خاں سلیم چشتی بی اے پرنسپل اشاعتِ اسلام کالج لاہور کی تصنیف ہے "پیش لفظ" مولانا عبدالمجید خاں صاحب سالک بی اے مدیر روزنامہ انقلاب لاہور نے لکھا ہے فاضل پیش لفظ نویس نے بالکل صحیح کہا ہے "ضمیرِ اُمتاں را پاک ساختن، تو صرف مامور من اللہ کا کام ہوتا ہے لیکن یہ بھی سنتِ الٰہی ہے کہ وہ ہر زمانے میں روحِ عصر کے مطابق ایسے حکیم اور ہادی پیدا کر دیتا ہے جو "دلبری بے قاہری" سے کام لے کر پیغمبری کر جاتے ہیں۔"

اس کتاب میں تطہیر فکر کا وہ پہلو پروفیسر صاحب موصوف نے اختصار کے ساتھ ظاہر کیا ہے جس کے لیے اقبال نے اپنی زندگی کے تیس سال صرف کیے تھے اِس دَورِ الحاد میں اقبال کے افکار اور تعلیمات سے واقف ہونا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے ورنہ یہ سیلاب کفر و طغیان نہ معلوم کہاں سے کہاں تک بہا کر لے جائے گا۔ بقول ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری اقبال درحقیقت موجودہ دَور کا مسیحا ہے جس نے مسلمانوں کے جسد مُردہ میں پھر سے ایک رُوح پھونک دی ہے۔

اخبارات اور رسائل میں اس کتاب کے متعلق بہترین آرا شائع کی گئی ہیں۔ خاص طور پر مقدمہ کی جانب زیادہ توجہ دلائی گئی ہے جو بیس صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس مقدمہ میں پروفیسر صاحب نے مسلمانوں کی مذہبی، اخلاقی، معاشرتی اور تمدنی بدحالی اور زوال کے اسباب بیان کئے ہیں اور حقیقت میں یہی اقبال کا ذہنی پسِ منظر ہے۔

ان تین مطبوعات کے علاوہ رسالہ پیغام حق ہر ماہ اس ادارہ کے منادی کی حیثیت سے باقاعدہ شائع ہو رہا ہے۔

یہ سال گذشتہ کی کارگزاریاں تھیں اب لیجیے سالِ رواں کا عملی خاکہ بفضلِ ایزدی ہے کہ ادارہ کے کارپرداز بڑے باہمت ہیں اور جتنی زبردست رکاوٹیں راستے میں اُنہیں پیش آتی ہیں اُن کا جذبۂ عمل اتنا ہی زیادہ تیز گام ہوتا ہے۔ اس سال گذشتہ سال سے بھی زیادہ شاندار پروگرام اُن کے

پیشِ نظر ہے۔

سب سے پہلی چیز "اسرارِ خودی کی شرح" ہے جو اس وقت پریس میں ہے لیکچند دنوں میں شائع ہو جائے گی۔ اس کے بعد "پیغام حق کا اقبال نمبر" اپریل میں نکالا جائے گا جس کے اڑھائی سو سے زائد صفحات ہوں گے۔ کوشش کی جارہی ہے کہ یہ اقبال نمبر اُن تمام اقبال نمبروں سے بہتر ہو جو اس وقت تک شائع ہو چکے ہیں مئی میں پیغامِ حق کا "علمائے کرام نمبر" ہو گا اور جون میں "جمال الدین افغانی نمبر" اس کے علاوہ کم از کم تین کتابیں اور شائع کی جائیں گی۔

قارئین کرام خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ کوئی ادارہ ابتدا ہی میں اس سے بڑھ کر کیا کارہائے نمایاں دکھا سکتا ہے۔

اس وقت تمام دنیا میں علم و حکمت کا چرچا ہو رہا ہے لیکن افسوس ہے کہ حکمتِ فرعونی اور حکمتِ قرآنی میں تمیز کرنے والے بہت کم لوگ ہیں۔ ہمارا مقصد خدا کے بندوں کی ایسی جماعت پیدا کرنا ہے جو عشقِ محمدی کے نشہ سے سرشار ہو جس کا دامنِ دل اُس عشق کی وجہ سے صد چاک ہو چکا ہو اور جس کے ہر فرد کی نگاہیں اتنی تیز بیں ہوں کہ چشم زدن میں حکمتِ فرعونی اور حکمتِ قرآنی کی حقیقت اُس پر عیاں ہو جائے۔

یہ ایک بہت بڑا کام ہے۔ لیکن ہماری ہمتیں اس سے بھی زیادہ ملند ہیں۔ کیونکہ وہ کارسازِ حقیقی خود اس کام میں ہمارا سب سے بڑا معاون اور ناصر ہے ہم نے اُسی کے بھروسہ پر اس کام کو شروع کیا تھا اور اُسی سے یہ دعا بھی مانگتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے دلوں کو ہماری طرف متوجہ کر دے۔

اس سلسلہ میں ہماری یہ بھی کوشش تھی کہ اِن مقاصد کی تکمیل کے لیے اقبال اکیڈیمی

میں اُن تمام فاضل ادیبوں کو جمع کریں جنہوں نے اپنی زندگی کا کافی حصّہ علامہ اقبالؒ کی صحبت سے فیضیاب ہونے میں بسر کیا ہو یا دقتِ نظر سے اُن کی تصنیفات کا مطالعہ کیا ہو۔ گذشتہ سال گوناگون مصروفیتوں کی وجہ سے ہم ادھر زیادہ توجہ نہیں دے سکے۔

امسال یہ طے کیا گیا ہے کہ ہندوستان کے تمام ایسے فاضل ادیبوں کو دعوت شرکت دی جائے جو ادارہ کے لئے کتابیں لکھیں۔ لیکن ہم یہ مناسب نہیں سمجھتے کہ اُن کے متاعِ علم و دانش کو مالِ یغما سمجھ کر لوٹیں۔ بفضلہ اب ادارہ کی مالی حالت اس قابل ہو چکی ہے کہ وہ مصنفین کو واجبی معاوضہ دے سکے۔ کاروبار کی زیادتی اور اہلِ ذوق اور مصنفین کی سہولت کے خیال سے ہم اس کے لئے مجبور ہو گئے کہ ادارہ کے دفتر کو ایک گوشہ سے نکال کر شہر کے کسی مرکزی مقام پر تبدیل کریں چنانچہ بڑی تلاش کے بعد اسلامیہ کالج کے بالمقابل ریلوے روڈ پر دفتر کو منتقل کر دیا گیا ہے اس مقام پر وہ تمام اغراض پوری ہو سکتی ہیں جو کسی مرکزی ادارے کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ فاضل ادیبوں کے لئے یہ ایک زرّیں موقعہ ہے نہ صرف اُنہیں اس سے مالی نفع ہوگا۔ بلکہ اس ادارہ کے ذریعہ جہاں وہ اسلام کی خدمت کے فرض کو سر انجام دیں گے وہاں اُن کا اپنا ذہن بھی مزاولتِ کار کی وجہ سے جلا پائے گا۔ اور گمنامی کے گوشے سے نکل کر اُن کا نام ہندوستان کے طول و عرض میں شہرتِ دوام حاصل کرے گا۔ اہلِ ذوق سے یہ التماس ہے کہ اب اُنہیں تاج پورہ کے صبر آزما راستہ کو طے کرنا نہیں پڑے گا۔ اسلامیہ کالج سر راہ واقع ہے جہاں سے ہر آنے جانے والے کا گذر ہوتا ہے اور دفتر اقبال اکیڈیمی اور اسلامیہ کالج میں کوئی فاصلہ نہیں۔

نیز شائقین کتب کی سہولت کے لئے ہم نے "اسلامی کتب خانہ" کے نام سے ایک

کتب خانہ بھی کھول دیا ہے۔ ہندوستان کے تمام مشہور و معروف علمی، ادبی اور مذہبی اداروں کی مطبوعات اس سے دستیاب ہو سکیں گی۔ اس توسیع کار کا مقصد وحید یہ ہے کہ اہلِ ذوق کو جس قسم کی کتابوں کی ضرورت ہو ایک ہی جگہ سے اُن کو مل سکیں۔ اُمید ہے کہ قارئین کرام اس کے ذریعہ فائدہ اُٹھانے کی کوشش کریں گے۔

نگار

اقبال کے شاعرانہ تصورات

(جناب ماہر القادری)

مولانا حالی پانی پتی نے "مقدمہ شعر و شاعری" میں متعدد مثالوں کے ذریعہ اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ شاعری قوموں میں انقلاب پیدا کر سکتی ہے۔ حالی مرحوم نے سُنی سنائی باتیں لکھی تھیں، لیکن ہم نے اپنی آنکھوں سے شاعری کے پیدا کیے ہوئے انقلاب کو دیکھ لیا۔ آنے والے مورخ ذہن و فکر کے اس انقلاب کو طرح طرح سے بیان کریں گے، مگر اس داستان کا ہر عنوان "اقبال کی شاعری" ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ اقبال نے شاعری کے زمین و آسمان ہی بدل دیئے۔ اب تک شاعری "واہ" اور زیادہ سے زیادہ "آہ" تھی، لیکن اقبال نے شعر میں زندگی کو سمو کر خیال و فکر کا ایک ایسا نادر اور عجیب اسلوب پیش کیا، جس کی نظیر دُنیا کی شاعری میں مشکل ہی سے ملے گی۔

سنسار کی ریت اور دنیا کا دستور ہے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ مرنے والے، پیدا ہونے والوں کے لیے مثالیں اور نشانیاں چھوڑ جاتے ہیں۔ ہر ماضی (PAST.) اپنے مستقبل (FUTURE) کا نقشِ اوّل ہے۔ اقبال بھی دوسرے مفکر شاعروں سے متاثر ہوتا ہے، اور اُس کے یہاں بھی کہیں کہیں بہت پہلے کہی ہوئی باتوں کا اعادہ پایا جاتا ہے۔ لیکن تاثر و انفعال کی ان جھلکیوں کے باوجود اُس کے سوچنے، محسوس کرنے اور ظاہر کرنے کا طریقہ سب سے جُدا ہے۔ اقبال شعر و ادب کے اُس دور سے ہم کو نظر آتا ہے، جہاں سے رومی کے ایمان اور نطشہ کے الحاد کے راستے پھٹتے ہیں۔ وہ اپنی جگہ ایک منفرد اور جداگانہ مکتبۂ خیال کا بانی ہے۔ وہ فکر و خیال اور یقین و مشاہدہ کی اُن فضاؤں میں پرواز کرتا ہے، جہاں خود شعر و ادب کے قدم بھی ڈگمگانے لگتے ہیں، یقین کی اس بلندی پر پہونچ کر اقبال

محسوس کرتا ہے کہ وہ "ماورائے شاعری" کوئی چیز پیش کر رہا ہے، چنانچہ کہتا ہے:۔

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ

کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

وسکی اور شراب پر تنگالی میں ڈوبا ہوا یورپ "رازِ درونِ میخانہ" کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

اقبال اور زندگی | شاعروں کا بہت بڑا گروہ "التباسِ حواس" (Illusion) کے مرض میں مبتلا ہے:۔ "التباسِ حواس" نفس کی ایک ناقص کیفیت کا نام ہے، یعنی کسی شے کا جس طرح وہ موجود ہو، اُس کے خلاف محسوس ہونا، مثلاً رسّی کے ٹکڑے کو سانپ اور درخت کو بھوت یا چھلاوہ سمجھ لینا۔ تو ہمارے بہت سے شاعر آشیانوں میں بیٹھ کر جگنو کی چمک کو برقِ بے اماں اور ہر بگولے کو صیاد سمجھتے ہیں یہاں تک کہ چمکتے ہوئے تارے بھی اُن کی بیکسی کا منہ چڑاتے ہیں، اور نسیم صبح کی اٹھکیلیاں اُن سے مذاق کرتی ہیں۔ اقبال بھی فکر و خیال کا آشیانہ رکھتا ہے، لیکن وہ برق و صیاد سے نہیں ڈرتا، اندیشہ و خوف سے اُس کے دل و دماغ پاک ہیں، اس لئے دوسرے شاعروں کی طرح "التباسِ حواس" کی بیماری اُس کے پاس بھی پھٹکنے نہیں پاتی، اُس کا تو یہ عقیدہ ہے کہ:۔

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

اقبال خطرات میں کودنے سے نہیں ڈرتا، بلکہ خطرات کو اُلٹی دعوت دیتا ہے، اس لئے وہ ہر خطرے اور مشکل کو اُس کی صحیح شکل میں دیکھتا ہے۔ اور اُس کا نفس، ادھورے تصورات اور ناقص محسوسات سے متاثر نہیں ہوتا۔ یہ ہی سبب ہے کہ اُس کی شاعری زندگی سے اتنی قریب ہو جاتی ہے، کہ اقبال کے تخیل اور زندگی میں خطِ فاصل کھینچنا مشکل ہو جاتا ہے کون کہہ سکتا ہے کہ اقبال کا خیال زندگی کے قریب پہنچ گیا، یا زندگی خود اُس کے قریب آگئی! لیکن تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے ہم تو اتنا کہہ سکتے ہیں کہ کچھ اقبال بڑھا ہوگا، کچھ زندگی نے اقدام کیا ہوگا، یہاں تک

کہ اقبال کا "جذبِ باطن" بیساختہ پکار اٹھا:۔

تو نے یہ کیا غضب کیا، مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

شعر کا یہی وہ مقام ہے جس کو "جز دیست از پیغمبری" کہا گیا ہے۔ برنارڈ شا، میکسم گورکی اور چیخوف کے افسانوں میں کھوئے ہوئے دماغ اُس کی صحیح اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔

فلسفۂ غم و نشاط عام طور پر شاعروں کے یہاں غم اور نشاط، (PAIN PLEASURE) کے جذبات مختلف شکلوں اور صورتوں میں پائے جاتے ہیں۔ المیہ شاعری، ہجر کی لمبی اور بھیانک راتوں، آہ و فریاد، شورِ فغاں، اشکِ خونیں اور ایسے ہی بہت سے عنوانات سے عبارت ہے۔ اُردو شاعری میں تو مایوسی و غم کی یہ تان گورِ غریباں کے گڑھوں اور غاروں پر آکر ٹوٹتی ہے۔ چنانچہ اُردو کے ایک شاعر نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ:۔

رہیں ہم تا کجے دیدار کے اُمیدواروں میں
نہیں آئیں گے وہ تختے دیئے جائیں مزاروں میں

جذبۂ غم اپنی جگہ ایک حقیقت رکھتا ہے، اور ہم فکر و خیال کی اس نزاکت سے ناآشنا نہیں ہیں کہ نزع کی ہچکی اور گورِ غریباں کے استعاروں میں غم کی کیفیات بیان کی گئی ہیں، مگر یہ داستانیں نفسِ انسانی کو منفعل بناتی چلی جاتی ہیں، یہاں تک کہ:۔

بات کرتا ہوں آہ ہوتی ہے۔

اقبال چونکہ زندگی کا پیامبر ہے، اس لئے نزع کی ہچکیوں، دم واپسیں اور پتلیوں کی آخری گردش کے تصورات سے بہت بلند ہے۔ وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان نہیں دیتا، اُس کے یہاں ماتم کرنے والوں کی بھیڑ نظر نہیں آتی، اس کے سرہانے سوگواروں کے غمگین چہرے

دکھائی نہیں دیتے، اُس کا تو یہ عقیدہ ہے کہ :۔

آزاد کی دولت دلِ روشن نفسِ گرم محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ غمناک

وہ آہِ سرد کے بجائے نفسِ گرم کی چنگاریاں دیکھنا چاہتا ہے، جب ہی تو اُس نے کہا تھا کہ :۔

اقبال کے نفس سے ہے لالہ کی آگ تیز ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

وصل و مسرت | طربیہ شاعری میں عام طور پر وصل کی کیفیات اور محبوب کے حُسن و جمال کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔ نازک خیال شاعروں نے معشوق کے سر کے بالوں سے لے کر پیر کے ناخنوں تک ایک ایک چیز کو موضوع بنا کر ایسی ایسی باتیں کہی ہیں کہ بُوڑھے آدمی کے بدن میں جھرجھری پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وصل و قربت کی شرح و تفسیر میں تو آپ کو شاعری کی دُنیا میں چُوڑیوں اور چھاگلوں تک کی آوازیں سُنائی دیں گی۔ خیام نیشاپوری جیسا فلسفی شاعر بھی نوخیز چھوکروں کے جُھرمٹ میں شراب پینے کی صلاح دیتا ہے :۔

گر بادہ خوری تو با خرد منداں خور یا با صنمے لالہ رُخے خنداں خور

بسیار مخور، ورد مکن، فاش مساز اندک خور و گہ گہ خور و پنہاں خور

غالب کے کمالِ ادب کا کون کافر مُنکر ہو سکتا ہے۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ غالب، علامہ اقبال کے تخیل کا "نقشِ اوّل" تھا۔ اگر غالب پیدا نہ ہوتا تو کم از کم اُردو شاعری کی منزل میں اقبال کا تخیل ان محشر آفرینیوں کی جُرأت نہ کرتا، ہاں تو یہی منکر غالب کہتا ہے :۔

نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں

جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

نشاط و طرب کے یہ تمام جذبات اپنی جگہ مُسلّم! اور میں اور آپ کسی نہ کسی حد تک ان رنگینیوں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ لیکن ان مضامین کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ایک بزمِ طرب جمی ہوئی ہے،

پریوشوں کا جھرمٹ ہے، ساغروں کی کھنک اور بربط وعود کے نغموں سے فضا گونج رہی ہے اور ان لذتوں میں ہم بھی شریک ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ سرخوشی کی یہ کیفیت، اور عیش ونشاط کی ترنگ تھوڑی دیر کے لیے زندگی سی پیدا کر دیتی ہے۔ مگر اس زندگی کی نمود حباب جیسی ہے کہ سطح آب پر نمودار ہوا اور ٹوٹ کر پانی میں گھل مِل گیا۔

اقبال دنیا کے رحجان اور زمانہ کی طبیعت سے اچھی طرح واقف ہے، وہ جانتا ہے کہ طبیعت "حدیثِ بادۂ وشاہد" کی خوگر ہو چکی ہیں، اور سامعہ کو نغمۂ بربط وچنگ کی چاٹ پڑ چکی ہے۔ اس لئے وہ کہتا ہے :۔

حدیثِ بادۂ ومیناو جام آتی نہیں مجھ کو نہ کر خاراشگافوں سے تقاضا شیشہ بازی کا

اقبال کا تخیل "شیشہ باز" نہیں "خاراشگاف ہے" اور اُس کا تصور "بربط نواز" نہیں بلکہ "مجاہد" ہے۔ اقبال شاعری کو "افیون" بناکر پیش کرنا نہیں چاہتا کہ تھوڑی دیر کے لیے نشاط آمیز غنودگی طاری ہو جائے، وہ تو شعر کے پردے میں نشتر چبھوتا ہے کہ زندگی "اضطرابِ پیہم" ہی کا نام ہے۔

اوپر کہا جا چکا ہے کہ طربیہ شاعری کو پڑھ کر آدمی اپنے کو ایک آراستہ اور مُرتب بزمِ طرب میں بیٹھا ہوا محسوس کرتا ہے، لیکن اقبال کی شاعری کے مُطالعہ کے بعد تخیل اُس مقام پر پہونچ جاتا ہے جہاں قیصر وکسریٰ کے تخت وتاج فرشِ راہ ہوتے ہیں۔ اقبال کی شاعری کا یہ نشاط انگیز پہلو، زندگی کی بنیادوں پر قایم ہے، یا یُوں کہو کہ زندگی اسی تصور کے سہارے قائم رہ سکتی ہے۔

دوسرے لوگ اپنے خالی پیالوں کو لئے ہوئے شراب کی بھیک مانگتے ہیں، لیکن اقبال کی بے نیازی اور آنا دمنشی کا یہ عالم ہے کہ :۔

گدائے میکدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

ایک طرف محتاجی ہے اور دوسری طرف بے نیازی اور استغنار! اور ہاں! استغنا بھی ایسا جوں

اور ناکاروں کا استغنا نہیں ہے، بلکہ اُس مردِ میدان کا استغنا ہے جو اپنی کوشش پیہم اور جہد مسلسل کی بدولت چشمۂ حیواں پر پہونچ چکا ہے۔ یہی وہ مسائل ہیں جن کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے قدرت نے ایک ایسے "برہمن زادے" کو منتخب فرمایا جو "رمز آشنائے رُوم و تبریز" تھا۔ اپنے مقام اور منصب کا کچھ اتا پتا پاکر ہی تو اقبال نے کہا تھا:۔

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمے بینی   برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

نظریۂ محبت | محبت تو شاعری کا موضوع بلکہ شاعری کی جان ہے۔ محبت کے موضوع پر کیا کچھ نہیں کہا گیا۔ شاعروں کی دُنیائے حُسن و محبت بہت رنگین ہے۔ وہی زلف و رُخسار، شوخی و غمزہ، نرگس چشم اور حنا آلود ہتھیلیاں، لیکن اقبال کا عشق لالہ و گل اور زلف و رخسار کا عشق نہیں ہے، اس میدان میں بھی وہ دنیا کے تمام شاعروں سے بچ کر نئی راہ نکلتا ہے:۔

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق، صبرِ حُسینؑ بھی ہے عشق

معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

دوسرے شاعروں کا عشق ناکام، ذلیل، پست ہمت، بے بال و پر اور بیکس و فلاکت زدہ ہے، لیکن اقبال کا عشق نانِ جویں کھا کر خیبر کُشائی کرتا ہے:۔

عشق با نانِ جویں خیبر کُشاد

دوسرے شاعروں کے عشق میں رقابتیں ہیں، ہولناکیاں ہیں، تاک جھانک ہے، لیکن اقبال کے عشق کی پاکیزگی اور بلندی کا یہ عالم ہے کہ:۔

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا   عشق تمام مصطفےٰ عقل تمام بولہب

عشق و محبت کے موضوع میں دُنیا کے دو چار شاعر ہی مشکل سے اقبال کے حریف ہوں گے۔

فلسفۂ خودی | نفس کی ایک حالت عرفان ہے، جس میں انقباض و انبساط کی کیفیت شامل

ہوتی ہے، اور دُوسری حالت وقوف (Cognition.) ہے، جس میں انسان کو محض اطلاع ہوتی ہے۔ انبساط، انقباض یا ارادہ کی کوئی کیفیت اُس پر طاری نہیں ہوتی۔ عرفانِ نفس کو نفسیاتی اصطلاح میں "انانیت" (Egoistic feeling.) کہتے ہیں۔ اقبال اسی "عرفانِ نفس" کو "خودی" کے نام سے پکارتا ہے۔ اور یہی فلسفۂ خودی، اُس کی شاعری میں اس طرح سمایا ہوا ہے، جیسے شراب میں مستی، پھولوں میں مہک اور ستاروں میں روشنی!

اقبالؒ انسان کی خودی کو اُبھارنا چاہتا ہے یہاں تک کہ:۔

خُدا بندے سے خود پُوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

وہ انسان کے اس جوہر خودی کو کسی قیمت پر فروخت کرنا نہیں چاہتا۔

مقام بندگی دے کر، نہ لُوں شانِ خداوندی

اقبال کی "خودی" کی راہ میں جو چیز بھی حایل ہوتی ہے، وہ اُس کا دشمن ہے۔ وہ تمام دواعیات ومُحرکات جو "جذبۂ خودی" کو اُبھرنے سے روکتے ہیں، اقبال ان کے خلاف جہاد کرتا ہے، بالکل نڈر ہو کر کہتا ہے:۔

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری — اے کُشتۂ سلطانیُ وُ مُلائیُ و پیری

اقبال ملوکیت (Imperialism) کا دشمن ہے۔ اور وہ اس لئے کہ ملوکیت کی فضا اور ماحول میں انسان کی خودی اُبھر نہیں سکتی۔ اور ملوکیت کا تو تخت ہی "انسانی خودی" کی لاش پر بچھتا ہے۔ یہ ملوکیت اور ہوسِ جہانگیری کی ہی تو شعبدہ کاریاں تھیں کہ فاتح خیبر کے نورِ نظر، فاطمہ کے لال اور محمدؐ عربی کی آنکھوں کی ٹھنڈک کو کربلا کے تپتے میدان میں ذبح کر دیا گیا۔

اقبال لاقانونیت اور نراج (Lawlessness.) نہیں چاہتا۔ اُس کی "خودی" ایک ایسے قانون اور حکومت کی پابند ہو کر رہنا چاہتی ہے، جس میں ایک کمزور وضعیف بڑھیا

خلیفۂ وقت کا گریبان تھام کر اپنا حق طلب کر سکے، کہتا ہے:-

خلافت بر مقامِ ما گواہی است　　حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است

ملوکیت ہمہ مکراست و نیرنگ　　خلافت، حفظ ناموسِ الٰہی است

اقبال کی "خودی" سلطان و امیر کے شکوہ و طمطراق کی پروا نہیں کرتی، اُس کا عقیدہ یہ ہے کہ:-

مردِ حق ہوتا ہے جب مرعوبِ سلطان و امیر　　سینۂ افلاک سے اُٹھتی ہے آہِ درد ناک

سچّی بات کڑوی ہوتی ہے، اقبال کو بھی ان "تلخ نوائیوں" کا کچھ نہ کچھ صلہ ملا۔

اسی خطا پہ عتابِ ملوک ہے مجھ پر　　کہ جانتا ہوں آلِ سکندری کیا ہے

شیوہ ہائے خانقہی! ملوکیت کے بعد وہ "ملّائیت" اور "صوفیت" کا دشمن ہے۔ لیکن جن ملّاؤں اور صوفیوں کے خلاف وہ جہاد کرتا ہے، اُس سے ریاکار، بد باطن اور کاہل و مُردار، خوار صوفی اور درویش مُراد ہیں:-

یہی شیخِ حرم ہے جو چُرا کر بیچ کھاتا ہے　　گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اُویسؓ و چادرِ زہراؓ

ایسے "شیخِ حرم" کی کوئی مردِ معقول حمایت نہیں کرسکتا، خواہ اُس کے نسب نامہ پر قرنِ اول کے ہاشمیوں اور قریشیوں کی مُہریں ہی کیوں نہ لگی ہوں۔

ملوکیت کی طرح یہ خانذانی "مُلّائیت" اور "صوفیت" بھی "خودی" کی راہ میں بڑی بھاری رکاوٹ ہے جس طرح عیسائی مذہب میں "پاپائیت" نے معجزات و تصرّفات، عشائے ربانی اور تقدّس و تزکیہ کی آڑ میں، انسانیت کو ذلیل کر رکھا تھا۔ ایک زمانہ سے مسلمانوں پر "خانقاہیں" بھی اسی طرح مسلط ہیں۔ اقبال سے مسلمانوں کے "جذبۂ خودی" کی یہ تباہی نہیں دیکھی جاتی:-

سکھا دیئے ہیں اُسے شیوہ ہائے خانقہی

فقیہہِ شہر کو صُوفی نے کر دیا ہے خراب

اقبالؔ مسلمان کو قرآن پڑھنے کی دعوت دیتا ہے، لیکن ساتھ ہی جتاتا ہے کہ ان صوفیوں اور مُلّاؤں نے جو تیری عقل و فکر پر اپنے ذاتی عقاید و رجحانات کے پہرے بٹھا دیئے ہیں، اُن کے سبب سے حکمتِ قرآنی سے تو محروم ہے:۔

بہ بندِ صوفی و مُلّا اسیری — حیات از حکمتِ قرآں نہ گیری

بہ آیاتش ترا کارے جز این نیست — کہ از یٰسینِ اُو آساں بمیری

اقبالؔ کی "خودی" بندوں اور انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کی پابند ہو کر رہنا نہیں چاہتی۔ وہ خلافتِ الٰہی کی تلاش میں ہے! شروع سے آخر تک اقبالؒ کا یہی درس اور یہی پیام ہے۔ اور یہی "پیام" اقبال کو دنیا میں اُس وقت تک زندہ رکھے گا، جب تک کہ ایک حق شناس بھی دنیا میں موجود ہے۔

اسرارِ خودی

خودی کی تربیت کے مرحلے

(غلام سرور فگار)

(۶)

یہ ایک امر واضح ہے کہ دیگر قوتوں کی طرح خودی کا جوہر بھی تربیت کا محتاج ہے، اگر اس کی تربیت کی جانب توجہ نہ دی جائے تو یہ انسان کے وجود میں انفرادیت پیدا کرنے کا باعث نہیں ہو سکتی اور نہ اُس کی تحریک سے ایسے افعال سرزد ہوتے ہیں جو اپنی نوعیت میں امتیازی خصوصیت کے حامل ہوں اس لئے یہ از بس ضروری ہے کہ خودی کی تربیت سے غفلت نہ برتی جائے تاکہ قدرت کا یہ عطیۂ عظیم بے کار نہ پڑا رہے۔

اقبال نے خودی کی تربیت کے تین مرحلے مقرر کئے ہیں پہلا اطاعت دوسرا ضبطِ نفس اور تیسرا نیابتِ الٰہی۔ پہلے مرحلے کی بابت آغازِ کلام اس طرح کیا ہے۔

خدمت و محنت شعارِ اُشتر است صبر و استقلال کارِ اُشتر است

کلام مجید کی اس آیت کے مطابق اَفَلَا یَنظُرُونَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ اقبال رح نے بھی اونٹ کو محنت و مشقت اور صبر و استقلال کا نمونہ پیش کیا ہے کہ عرب جیسے تپتے ریگستانوں میں جہاں کی بادِ صرصر سے وہاں کے شہروں کے در و دیوار اور بیابانوں کے مجر و شجر بھی پناہ مانگتے ہیں اگر کوئی چیز گرمی اور تپش کا مقابلہ کر سکتی ہے تو وہ صرف اونٹ ہے جو بھوکا پیاسا بغیر سوئے اور آرام کئے

رات دن انتہائی صبر و استقلال کے ساتھ کسی نامعلوم منزل کی جانب گامزن رہتا ہے۔ پیام مشرق میں اقبالؒ نے حُدی یعنی نغمۂ ساربان حجاز کے عنوان سے جو اشعار لکھے ہیں ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اقبالؒ کے خیال میں اونٹ کو کتنی اہمیت حاصل ہے۔ اُس کو "کلۂ ابرِ رواں" "کشتیٔ بے بادباں" اور "خضرِ راہ داں" کے مختلف خطابات سے مخاطب کرنے کے بعد اِسی حقیقتِ صبر و استقلال کو کتنے دلکش پیرایہ میں ادا کیا ہے۔

سوز تو اندر زمام
سازِ تو اندر خرام
بے خورش و تشنہ کام
پا بہ سفر صبح و شام
خستہ شوی از مقام
تیز ترک گام زن منزلِ ما دور نیست
شام تو اندر یمن
صبح تو اندر قرن
ریگ درشتِ وطن
پائے ترا یاسمن
اے چو غزالِ ختن
تیز ترک گام زن منزلِ ما دور نیست

یہ اُونٹ اپنے سوار کا بے حد اطاعت گزار ہوتا ہے سوار جس طرف اُس کی مہار موڑتا ہے معمولی سے اشارے پر اُدھر کو ہو لیتا ہے اور جب تک رُکنے کا اشارہ نہیں پاتا اونٹ اپنا یہی فرض سمجھتا ہے کہ

رات دن رواں رہے۔

توہم از بار فرائض سرمتاب	برخوری از عندہٗ حسن المآب
در اطاعت کوش اے غفلت شعار	می شود از جبر پیدا اختیار

مسلمانوں کو مخاطب کر کے اقبالؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح اُونٹ اپنے فرائض کی بجاآوری میں پے در پے مصروف رہتا ہے تجھے بھی چاہئے کہ خدا اور اُس کے رسول محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے احکامات کی تعمیل میں مصروف رہے اس میں کچھ شک نہیں کہ انسان پر جب کوئی پابندی عائد ہوتی ہے تو وہ ابتدا میں اُس کو محسوس کرتا ہے اور جبراً و قہراً اُس کی تعمیل کرتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ جبر ہی اختیار کا پہلا زینہ ہے جب تک مومن اس درجہ سے آگے نہیں بڑھتا اس مقام پر نہیں پہنچ سکتا جہاں خدا اپنے بندے سے یہ دریافت کرنے پر مجبور ہو کہ اب بتا تیری کیا رضا ہے تاکہ میں اُس کے مطابق دنیا کے کاروبار کی تشکیل کروں۔ حضرت بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ پہلے تیس سال تک میں نے خدا کی اتنی اطاعت کی کہ اُس کے ہر اشارے پر چلتا رہا اور اب تیس سال سے جو کچھ میں کہتا ہوں خدا اُس کی تعمیل کرتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے۔ الایمان بین الجبر و الاختیار۔ جبر کے لئے اطاعت پذیری سب سے پہلی شرط ہے جس کے بغیر اعلیٰ اور سچی حریت حاصل نہیں ہو سکتی اور مسلم کے تو معنی ہی بندۂ تسلیم و رضا ہے جب اونٹ جیسے حیوانِ مطلق کی زندگی کا جزو لاینفک صبر و استقلال اور اطاعت و فرمانبرداری ایسی بلند پایہ خصوصیات ہو سکتی ہیں تو کیا وجہ ہے کہ مسلمان جس کی تمام تر زندگی کا مقصد وحید یہی ہے۔ اس سے عاری ہو جائے۔ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ مسلمان کو چاہئے کہ اپنی زندگی کے ہر لمحہ اور ہر پہلو میں وہ اپنے فرائض کی بجاآوری میں لگا رہے اور صحیح معنوں میں اپنے آپ کو عبداللہ اور عبدالرسول ثابت کرے اُس کی اس اطاعت گزاری کا اُسے خدا سے وہی اجر ملے گا۔ جو اس سے قبل اُن مسلمانوں کو مل چکا ہے جنہوں نے اپنی زندگیاں اطاعت حق میں صرف کر دی تھیں۔

ناکس از فرماں پذیری کس شود آتش ار باشد ز طغیاں خس شود

انساں کی طبیعت میں خواہ کتنی ہی سرکشی کا مادّہ کیوں نہ ہو جب وہ اطاعت کو اپنی زندگی کا شیوہ بنا لیتا ہے تو اُس کے اندر وہ تمام خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں جو ایک مردِ مومن کی شانِ امتیازی کا باعث ہوتی ہیں۔ اسلام قبول کرنے سے قبل حضرت عمرؓ کی سرکشی کا علم ہر اسلامی تاریخ جاننے والے کو ہے۔ لیکن جب انہوں نے خدا اور اُس کے رسول حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور فرمانبرداری کو قبول کر لیا تو وہ شمعِ جمال نبوی کے ایسے پروانے نکلے کہ جان و مال کی قربانی تک سے کبھی دریغ نہ کیا۔ خورونوش لباس و وضع اور نشست و برخاست کے جملہ آداب میں تقلید نبوی کے شعار کو ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھا۔ روم و ایران پر قابض ہونے کے بعد بھی رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی تقلید اور اُن کے احکام کی تعمیل میں فقر و فاقہ کی زندگی اختیار کئے رہے ایک مرتبہ آپ کی بیٹی حضرت حفصہؓ نے کہا کہ اب خدا نے ہم کو فارغ البالی عطا کی ہے اس لئے آپ کو چاہیئے کہ اچھے کپڑوں اور اچھی غذا سے پرہیز نہ کریں حضرت عمرؓ نے جواب دیا۔ جانِ پدر! تم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عسرت اور تنگ حالی کو بھول گئیں۔ خدا کی قسم میں اپنے آقا کے نقشِ قدم پر چلوں گا۔

اکثروں کو اس کی اُمید نہیں تھی کہ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی حضرت عمرؓ کے اندر سے سرکشی اور غصّے کا مادہ جاتا رہے گا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس حقیقت کو عالم آشکار کر دیا کہ خدا اور اس کے رسول حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی مکمل اطاعت نے اُن کی سرکشی کی آگ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فرو کر دیا ہے اور اب اُن کا شمار صحابۂ کرام میں ہوتا ہے۔

ہر کہ تسخیرِ مہ و پرویں کند خویش را زنجیریِ آئیں کند

اقبالؒ مختلف تمثیلات سے اِس کو ثابت کرتے ہیں کہ کسی مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے اولیں شرط یہ ہے کہ کسی قانون اور قاعدہ کی پابندی کی جائے چنانچہ جب تک ہوا غنچے کے اندر قید

نہ ہو خوشبو دار نہیں ہو سکتی۔ نیز مقید ہونے ہی سے تو آہو کے شکم میں نافہ کی صورت اختیار کرتی ہے، ستارے آسمان پر کسی نظامِ قدرت کے ماتحت منزل کی جانب جا رہے ہیں، سبزہ کو نباتاتی قاعدے پر قائم رہنے ہی سے شادابی، سرسبزی اور بالیدگی حاصل ہے، لالہ مسلسل جلنے پر کاربند ہے اس لئے اس کی رگوں میں سرخ خون دوڑ رہا ہے اور قطرے اور ذرّے جب تک آئین وصل کے پابند ہیں دریا اور صحرا بن جاتے ہیں۔ جب کہ دنیا کی ہر چیز کا قیام کسی قانون اور قاعدہ کی پابندی پر منحصر ہے تو کیا وجہ ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو جملہ قیود سے آزاد سمجھیں اور اُن قیود کی سختی کے گلہ مند ہوں۔ اقبالؒ اس کی تاکید کرتے ہیں کہ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے عمل کے لئے جو حدود مقرر کی ہیں مسلمانوں کو چاہیئے کہ اُن کے اندر رہیں اور اپنے اقوال اور اعمال میں اُن سے متجاوز نہ ہوں۔

خودی کی تربیت کا دوسرا مرحلہ ضبطِ نفس ہے چنانچہ اقبالؒ اس کے متعلق فرماتے ہیں:۔

نفس تو مثلِ شتر خود پرور است — خود پرست و خود سوار و خود سر است

مرد شو آور زمامِ اُو بکف — تا شوی گوہر اگر باشی خزف

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں — مے شود فرماں پذیر دیگراں

انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے نفس پر قابو پائے تاکہ جو اعمالِ حسنہ اس سے سرزد ہوں اُن کا خراجِ تحسین اس کی ذات کو ملے ضبطِ نفس انسان کا ایک ذاتی جوہر ہے جو اُس کی زندگی کو جلا دیتا ہے۔ جو شخص اس کے خلاف عمل پیرا ہوتا ہے اس کا حشر یہ ہوتا ہے کہ اُس کے نفس کو دوسرے لوگ قابو میں لے آتے ہیں اور اُسے بادلِ خواستہ یا ناخواستہ دوسروں کے اشاروں پر چلنا پڑتا ہے انسانی زندگی کی یہ روش اتنی قابلِ افسوس ہوتی ہے کہ اس کی اپنی ذات صفر کے برابر رہ جاتی ہے۔

طرحِ تعمیرِ تو از گِل ریختند — با محبت خوف را آمیختند

خوفِ دنیا، خوفِ عقبیٰ، خوفِ جاں — خوفِ آلامِ زمین و آسماں

حُبِّ مال و دولت و حُبِّ وطن حُبِّ خویش و اقربا و حُبِّ زن
امتزاجِ ما و طیں تن پرور است کشتۂ فحشا ہلاکِ منکر است

اگرچہ خدا نے انسان کو مٹی سے بنایا۔ لیکن مٹی کے اس پتلے کی طبیعت میں کئی لطیف جوہر بھی رکھ دیئے حسب محبت کے جوہر سے اس کو سرفراز کیا تو اس کے ساتھ ہی خوف کی بھی آمیزش کر دی لیکن افسوس کہ ان عطیاتِ ربّانی کی غرض و غایت کو انسان نے کما حقہٗ نہ سمجھا اور اُس نے اس محبت اور خوف کی بنا مادّی خواہشات پر رکھ دی اور اپنے نفس کو اتنی آزادی دے دی کہ جن اشیاء کو اپنے دنیاوی رشتوں کے قائم رکھنے کے لئے وہ ضروری سمجھا اور اپنے ذاتی جاہ و جلال کے لئے اُن کو جزو لاینفک خیال کیا اُن سے شغف رکھنے لگا اور اُن کے حصول کے لئے سرگرداں رہنے لگا۔ اور اُن موانعات سے اس کا دل خائف ہونے لگا جن کی بابت اُسے یہ کھٹکا ہوا کہ ممکن ہے یہ میری اس کامیابی کو ناکامیابی میں بدلنے کا باعث ہوں حالانکہ خدا نے کلام مجید میں اس کی تصریح اس طرح پر کر دی تھی۔

اِنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ وَّزِیْنَۃٌ وَّتَفَاخُرٌ بَیْنَکُمْ وَتَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ اس آیت میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ دنیا کی زندگی کھیل اور بیہودگی اور آرائش ہے اور آپس میں خود ستائی ہے اور مال اور اولاد میں زیادہ طلبی ہے چنانچہ جو لوگ حقیقی غرض سے ناواقف ہوتے ہیں اُن کی محبت اور خوف دونوں اسی دنیا تک محدود رہتے ہیں۔ دنیا کے ایک ایک تنکے کو وہ سانپ سمجھ کر اس سے خوف کھاتے ہیں عقبیٰ پر اگر انہیں یقین آجاتا ہے تو اُس سے اس لئے خائف ہوتے ہیں کہ اعمالِ صالحہ کی پونجی سے اُن کا دامن خالی ہوتا ہے اور اپنی جان کے چلے جانے کا ڈر تو اُنہیں رات دن چین نہیں لینے دیتا۔ رہا جذبۂ محبّت سو اس کی کیفیت یہ ہے کہ دنیا کے کرشموں نے ان کے دامنِ دل کو اپنی طرف یہاں تک کھینچ لیا کہ وہ اُنہیں کا ہو کر

رہ گیا اور اس بات کو بھول گیا۔

تا عصائے لا الٰہ داری بدست ہر طلسم خوف را خواہی شکست

ہر کہ حق باشد چو جاں اندر تنش خم نگردد پیشِ باطل گردنش

خوف را در سینۂ او راہ نیست خاطرش مرعوبِ غیر اللہ نیست

ہر کہ در اقلیم لا آباد شد فارغ از بندِ زن و اولاد شد

می کند از ماسوی قطعِ نظر می نہد سا طور بر حلقِ پسر

جس شخص کا یہ ایمان ہو کہ ماسوا اللہ سب کچھ باطل ہے اور اس کے دل و جاں میں حق ہی حق سما جائے تو نہ وہ دنیا کی کسی چیز سے خائف ہوتا ہے اور نہ اس کی محبت سے اُس کا دل معمور ہوتا ہے مال و دولت، اعزہ و اقربا فرزند و زن اور وطن غرض جملہ اشیاء خدا کی محبت کے مقابلہ میں اُسے ہیچ معلوم ہوتی ہیں اور وہ اس حقیقت کو پا لیتا ہے کہ محبت کرنے اور خائف ہونے کے قابل اگر کوئی ذات ہے تو وہ خدائے برتر و توانا کی ہے یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب کہ محبت کا حقیقی جذبہ اُس کی نظروں کے سامنے سے مغائرت کے باریک سے باریک پردے بھی اٹھا دیتا ہے اور وہ اپنے آپ کو بلا ارادہ اس کے لئے ہر وقت آمادہ پاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی طرح اپنی اولاد تک کو محبت حق میں قربان کر دے یہ اُس مردِ مومن کی تعریف ہے جس پر خدا اور اس کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو بجا ناز تھا چنانچہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہ! ایمان کیا چیز ہے؟ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تک بندہ خدا اور اس کے رسولؐ کو اہل و عیال، زر و مال اور تمام خلق خدا سے زیادہ عزیز نہ رکھے ایماندار نہیں کہلا سکتا اور ایک دوسری جگہ فرمایا راس الحکمۃِ مخافۃ اللہ یعنی پاکدامنی ورع اور تقویٰ خوفِ خدا کے ثمرات ہیں۔

با یکے مثلِ ہجوم لشکر است جاں بچشمِ اُو چو باد ارزاں تر است

جس کسی کے دل میں سوائے خدا کے نہ کسی کا خوف ہو اور نہ محبت وہ اپنے کو تنہا نہیں سمجھتا اور جب اس کا خدا اس کے ساتھ ہو تو وہ اپنے ساتھ ایک عظیم الشان لشکر ہر وقت دیکھتا ہے جو باطل کی تمام قوتوں کو سرنگوں کر سکتا ہے جب کبھی ایسا موقع آتا ہے کہ وہ باطل کے مقابلہ میں ڈٹ جائے تو دنیا کی کوئی طاقت اُس کو اس عزم سے روک نہیں سکتی اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے دل میں یقین کامل ہوتا ہے کہ میں جس سے محبت کرتا ہوں وہ میرے ساتھ ہے اور اس کی یہ صفت ہے لَا غَالِبَ اِلَّا هُوَ۔ یہ جان جو مجھے اس دنیا میں زندہ رکھتی ہے یہ بھی اُسی کی دی ہوئی ہے اس لئے اگر اس کو اُسی کی محبت میں صرف کر دیا جائے تو یہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہوگا۔

نفس کی اصلاح کے لئے اقبالؒ ارکانِ اسلام پر سختی کے ساتھ عمل کرنے کی ہدایت کرتے ہیں اور اُن کے خیال میں لَا اِلٰهَ کے مفہوم کی غرض و غایت اس وقت تک پوری نہیں ہوتی اور نہ نفسِ انسانی میں جذبۂ ضبط مستقل طور پر اثر انداز ہوتا ہے جب تک نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی طرف رجوع نہ کیا جائے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

لَا اِلٰهَ باشد صدف گوہر نماز قلبِ مسلم را حجِ اصغر نماز

در کفِ مسلم مثالِ خنجر است قاتلِ فحشا و بغی و منکر است

روزہ بر جوع و عطش شبخوں زند خیبرِ تن پروری را بشکند

مومناں را فطرت افروز است حج ہجرت آموز و وطن سوز است حج

طاعتے سرمایۂ جمعیتے ربطِ اوراقِ کتابِ ملّتے

حُبِّ دولت را فنا سازد زکوٰۃ ہم مساوات آشنا سازد زکوٰۃ

دل ز حَتّٰی تُنْفِقُوْا محکم کند زر فزاید الفتِ زر کم کند

ایں ہمہ اسبابِ استحکامِ تُست پختۂ محکم اگر اسلام تُست

اہلِ قوت شو زِ وِردِ یا قوی

تا سوارِ اُشترِ خاکی شوی

دنیا میں کئی اور قومیں بھی گذری ہیں جن کا ایمان توحید پر تھا مسلمانوں میں اور اُن میں یہ فرق ہے کہ اُن کی توحید اُس سیپی کی طرح تھی جس میں موتی نہ ہو اور مسلمانوں کی توحید کی سیپی میں نماز کی حیثیت بمنزلہ موتی کے ہے اور جو مسلمان حضور قلب سے نماز ادا کرتا ہے اُسے حج اصغر کا ثواب ملتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر قسم کے کفر و طغیان سے محفوظ رہنے کا یہ ایک زبردست حربہ ہے اور جملہ گمراہیوں کا واحد علاج ہے۔ روزہ جہاں انسان کے اندر قوتِ ضبط پیدا کرتا ہے وہاں خواہشاتِ نفسانی پر اُس کو قادر کرتا ہے رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ۔ یعنی روزہ سپر ہے نیز فرمایا کہ شیطان آدمی کے اندر اس طرح چلتا ہے جس طرح خون اُس کے بدن میں رواں ہے اس لئے شیطان کا راستہ بھوک پیاس سے بند کرو۔ حج مومن کی فطرت کو پرکھنے کا ایک معیار ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اُس کو اپنے وطن، گھر بار، اہل و عیال اور مال و دولت سے کہاں تک محبت ہے۔ کیا وہ خدا اور اس کے رسولؐ کے حکم کی تعمیل میں ان سب چیزوں کو چھوڑنے کے لئے تیار ہو سکتا ہے حج نفسِ انسانی کے اندر ایک زبردست انقلاب پیدا کرتا ہے اور زکوٰۃ کا فریضہ نفس کے اندر سے حُبِّ دولت کو کم کرتا ہے۔

سطورِ بالا سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ ضبطِ نفس کے لئے اس کی بڑی ضرورت ہے کہ انسان محبت اور خوف کے معاملہ میں سوائے خدا کے کسی طرف راجع نہ ہو نیز ضبطِ نفس کی تربیت کے لئے ارکانِ اسلام پر کاربند ہو کیونکہ انہی پر عمل پیرا ہونے سے اصلاحِ نفس ہو سکتی ہے جب نفس کی اصلاح ہو جائے تو یقیناً انسان اس قابل ہو سکتا ہے کہ جو افعال اُس سے سرزد ہوں اُن سے جہاں خدا کی رضاجوئی ہو وہاں اس کے جوہرِ خودی کو بھی ترقی ہو

موت اور حیات اقبالؒ کے کلام میں

(ڈاکٹر رضی الدین صدیقی پروفیسر ریاضیات جامعہ عثمانیہ)

اقبالؒ نے اپنی بیمار قوم کی حالت پر نظر ڈال کر معلوم کر لیا کہ جو کہنہ امراض قوم کو اندر ہی اندر کھائے جا رہے ہیں اُن میں ایک خطرناک مرض موت کا وہ ڈر ہے جو ہر کس و ناکس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔ یہ "خوفِ مرگ" وہ بلا ہے، اگر یہ کسی قوم کو لگ جائے تو وہ قوم غیرت اور آزادی کی موت پر بے عزتی اور غلامی کو ترجیح دیتی ہے اور پھر وہ پستی اور ذلت کے سب سے گہرے گڑھے میں گر جاتی ہے جہاں اُس کو اغیار کی ٹھوکروں کے سوا کچھ نصیب نہیں ہوتا۔ اقبالؒ نے اس خوف و ہراس کے خلاف مسلسل جہاد کیا اور بار بار یہ نکتہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر ہم بحیثیت ایک قوم زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں موت سے ذرہ بھی نہیں ڈرنا چاہئے۔ انفرادی اور اجتماعی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے۔ کہ وہی شخص یا وہی گروہ کچھ نمایاں کام کر گیا ہے جس کا دل موت کے خوف سے خالی تھا۔ اقبالؒ ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ ہمارے اسلاف نے مشرق و مغرب پر اپنا سکہ بٹھا دیا، اور انسانی تہذیب و تمدن کے ہر شعبے میں حیرت انگیز ترقیاں کیں تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ خوف کے احساس سے پاک تھے اور اپنی مہموں میں سر کو ہتھیلی پر لئے پھرتے تھے یا اب یہ حال ہے کہ موت کے اندیشہ سے ہمارا دل کانپتا رہتا ہے اور ہمارا جسم ہلدی کی طرح زرد ہو جاتا ہے۔ اس خوف سے ہم اس قدر مغلوب ہو گئے ہیں کہ ہمارے مرشدانِ خود بین قوم کو اپنی بے بسی کی طرف توجہ دلانے کے بجائے فتویٰ دے رہے ہیں کہ یہ زمانہ ہی ایسا ہے کہ اس میں تلوار کی ضرورت نہیں رہی۔ جناب شیخ سے اقبالؒ عرض

کرتے ہیں کہ مسجد میں آپ کا یہ وعظ غیر ضروری ہے کیونکہ ؎

تیغ و تفنگ دستِ مسلمان میں ہے کہاں ہو بھی تو دل ہیں موت کی لذّت سے بے خبر
کافر کی موت سے بھی لرزتا ہو جس کا دل کہتا ہے کون اُسے کہ مسلماں کی موت مر

اقبالؒ متعدد موقعوں پر مختلف پیرایوں میں یہ نکتہ سمجھاتے ہیں کہ موت کا ڈر صرف اُن لوگوں کو ہو سکتا ہے جو اس کو فنائے کامل سمجھتے ہیں اور آخرت پر یقین نہیں رکھتے لیکن جو لوگ موت کو آئندہ زندگی کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں اُنہیں مرنے کی کچھ پرواہ نہیں ہوتی۔ دنیائے اسلام کا سب سے بڑا فتنہ یہی ہے کہ جن کی حیات اور موت خدا کے لئے ہونی چاہئے تھی۔ وہ یا تو مال و زر کی محبت میں گرفتار ہیں، یا موت کے خوف سے پریشان ؎

آں کہ بود اللہ اُو را ساز و برگ فتنۂ اُو حبِ مال و ترسِ مرگ
ہمچو کافر از اجل ترسندۂ سینہ اش فارغ ز قلبِ زندۂ
مرگ را چوں کافراں داند ہلاک آتش اُو کم بہا مانند خاک

غرض اقبالؒ کو جب یقین ہو جاتا ہے کہ موت کے خوف کا یہ زہر ہمارے خون میں سرایت کر چکا ہے تو اس کے اثر کو زائل کرنے کے لئے وہ مختلف تریاق استعمال کرتے ہیں اور ہر طرح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ موت سے ہمیں کوئی ڈر نہیں ہونا چاہئے۔

اس ضمن میں وہ سب سے پہلے موت کے عالمگیر اور اٹل ہونے کی طرف ہماری توجہ مبذول کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ جب موت سے کسی طرح مفر نہیں تو پھر اس سے ڈرنا بے سُود ہی نہیں بلکہ خلاف عقل بھی ہے۔ جو چیز آج نہیں تو کل آنے والی ہے اس سے بھاگ کر کہاں جائیں۔ ہر جاندار کے لئے موت کا ایک دن مقرر ہے اور کائنات کی ہر شے کبھی نہ کبھی فنا ہو گی ؎

تہِ گردوں مقام دلپذیر است ولیکن ہر دم اش زود میر است

بدوشِ شام نعشِ آفتابے — کواکب را کفن از ماہتابے
پرو کہسار چوں ریگِ روانے — دگرگوں می شود دریا بآنے
فنا را بادہ، ہر جام کردند — چہ بے دردانہ اورا عام کردند
تماشاگاہِ مرگ ناگہاں را — جہانِ ماہ و انجم نام کردند

موت کے ہمہ گیر اور دنیا کے دو روزہ ہونے کے لئے ذیل کے اشعار میں نفیس تشبیہیں دی ہیں ؎

زندگی انساں کی ہے مانندِ مرغِ خوش نوا — شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا اُڑ گیا
آہ! کیا آئے، ریاضِ دہر میں ہم کیا گئے — زندگی کی شاخ سے پھوٹے کھلے مرجھا گئے
اے ہوس! خوں رو کہ ہے یہ زندگی بے اعتبار — یہ شرارے کا تبسم یہ خسِ آتش سوار
آہ! یہ دنیا یہ ماتم خانۂ برنا و پیر — آدمی ہے کس طلسمِ دوش و فردا میں اسیر
کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت — گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت
کلبۂ افلاس میں، دولت کے کاشانے میں موت — دشت و در میں، شہر میں، گلشن میں، ویرانے میں موت
موت ہے ہنگامہ آرا قلزمِ خاموش میں — ڈوب جاتے ہیں سفینے موت کی آغوش میں

جب یہ معلوم ہو گیا کہ نسیمِ موت کی یورش کبھی نہیں ٹل سکتی اور موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے تو پھر اس کا ڈر ہی کیا اور اس سے بھاگ کر کہاں جائیں۔ اس حیثیت پر پہنچ جانے کے بعد اقبالؒ اب اس راز کا انکشاف کرنا چاہتے ہیں کہ خدا نے اس کائنات کو فانی بنایا ہی کیوں اور انسان کو اس رنج و غم میں مبتلا ہونے پر مجبور کیوں کیا۔ باری تعالیٰ خود غیر فانی ہے۔ تو پھر اُس کی قدرت سے کیا بعید تھا کہ وہ اِس دُنیا کو اور اس کے ساتھ انسان کو بھی غیر فانی بناتا۔ اس مطلب کو ایک پھول کی زبانی وہ اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

مرا سوزے گُلِ افسردۂ گفت — نمودِ ما چو پروازِ شرار است

دلم بر محنتِ نقش آفریں سوخت کہ نقشِ کلکِ او ناپائیدار است

اس کا جواب ایک دوسری رباعی میں وہ اس طرح دیتے ہیں کہ یہ دنیا اور آدمیت کی ابھی ناتمام ہیں۔ یہ پختہ اُسی وقت ہوتے ہیں جب موت کی آگ ہیں سے ہو کر نکلتے ہیں۔ موت کا سوہان ہمارے اس ناتمام پیکر کو درست کر دیتا ہے ؎

جہانِ ما کہ جز انگارہ نیست اسیرِ انقلابِ صبح و شام است
ز سوہانِ قضا سموارہ گردد ہنوز ایں پیکرِ گِل ناتمام است

رنج و غم انسانی فطرت کی تکمیل کے لئے ضروری ہیں۔ کوئی نقش اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک اُس کے رنگ میں خونِ جگر کی آمیزش نہ ہو وہ بلبل ہی کیا ہے جس نے کبھی خزاں نہ دیکھی ہو، وہ نغمہ ہی کیا جس میں نالہ کی چاشنی نہیں۔ غم کے داغوں سے ہمارے سینے منوّر ہوتے ہیں اور آہوں کی صیقل سے ہمارے دلوں کا زنگ دور ہوتا ہے۔ جو کلیاں کانٹوں کی خلش سے بالکل ناواقف ہوں اور جن عاشقوں نے کبھی ہجر کی کُلفت نہ سہی ہو وہ زندگی کی لذّت سے محروم ہیں اور زندگی کا راز اُن کی نظروں سے پوشیدہ ہے۔ غم کے اس نکتہ کو اقبالؒ نے جن شعروں میں بیان کیا ہے وہ فلسفیانہ معنویت اور لطافت کے لحاظ سے بہترین شمار کئے جا سکتے ہیں۔ یہ وہ شعر ہیں جو ہر زبان کے لئے مایۂ ناز ہیں ؎

گو سراپا کیفِ عشرت ہے شرابِ زندگی اشک بھی رکھتا ہے دامن میں سحابِ زندگی
موجِ غم پر رقص کرتا ہے حبابِ زندگی ہے الم کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی

(اس شعر میں ایک طرف الم تو غم کو تعبیر کرتا ہے اور دوسری طرف قرآن شریف کے سورۂ الم کی طرف اشارہ کرتا ہے)

ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گُل ہی نہیں جو خزاں نادیدہ ہو بلبل وہ بلبل ہی نہیں

غم جوانی کو جگا دیتا ہے لطف خواب سے ساز یہ بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

طائرِ دل کے لیے غم شہپر پرواز ہے راز ہے انساں کا دل غم انکشافِ راز ہے

غم نہیں، غم روح کا اک نغمۂ خاموش ہے جو سرودِ بربطِ ہستی سے ہم آغوش ہے

ہاتھ جس گلچیں کا ہے محفوظ نوکِ خار سے عشق جس کا بے خبر ہے لذتِ آزار ہے

کلفتِ غم گرچہ اس کے روز و شب سے دور ہے زندگی کا راز اس کی آنکھ سے مستور ہے

اقبالؒ بار بار یہی سکھاتے ہیں کہ انسان کو اس دنیا میں حضر سے بڑھ کر سفر میں لذت ملتی ہے اور وصل سے بڑھ کر فراق میں۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق وصل میں مرگِ آرزو ہجر میں لذتِ طلب

انتہا یہ ہے کہ اُن کے نزدیک حسن کا کمال بھی اسی میں ہے کہ وہ زوال پذیر ہو۔ اس نکتہ کو انہوں نے خدا اور حسن کے مابین ایک مکالمہ کی شکل میں پیش کیا ہے ؎

خدا سے حُسن نے اک روز یہ سوال کیا جہاں میں تو نے مجھے کیوں نہ لازوال کیا

ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا شبِ درازِ عدم کا فسانہ ہے دنیا

ہوئی ہے رنگِ تغیّر سے جب نمود اس کی وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی

غرض اسی طرح وہ سمجھاتے ہیں کہ موت ہو یا رنج و غم اُن کی شکایت کے لیے ہماری زبان نہیں کھُل سکتی کیونکہ اس گلستان میں نئے سرے سے بہار آنے کے لیے ضروری ہے کہ خزاں نے اُن کے پھولوں اور پھلوں کو پامال کیا ہو۔ غم کی حقیقت کو آشکار کر دینے کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ ظاہر بیں انسان جس کو موت کہتے ہیں وہ دراصل فنا نہیں بلکہ آئندہ زندگی کا پیش خیمہ ہے۔ لوگ جس کو زندگی کی شام سمجھتے ہیں وہ دراصل اس کی دائمی صبح ہے ؎

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

موت کی منزل سے گزرنے کے بعد انسان کو وہ زندگی حاصل ہوتی ہے جو خضر کو اپنی عمر دراز میں بھی نصیب نہیں۔ دنیا کی بے ثباتی ایک سطحی منظر ہے جس کی تہ میں وہی زندگی کی روح کارفرما ہے۔ نقشِ حیات ہر مرتبہ مٹنے کے بعد ایک نئی شان سے ابھرتا ہے۔ فنا اور عدم کی اس کثرت میں صرف زندگی کی وحدت جلوہ گر ہے ؎

دمادم رواں ہے یمِ زندگی ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی
فریبِ نظر ہے سکون و ثبات تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
اُلجھ کر سلجھنے میں لذت اسے تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے
اُتر کر جہانِ مکافات میں رہی زندگی موت کی گھات میں
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات

"حیاتِ بعد الموت" فلسفۂ اسلام کا ایک بنیادی عقیدہ ہے۔ اقبالؒ کے مرشدِ معنوی مولانائے روم بھی اپنی مثنوی میں جا بجا مسئلہ ارتقاء کا ذکر کر کے بتلاتے ہیں کہ انسان ہر فنا کے بعد ارتقا کا ایک نیا درجہ طے کرتا ہے اور پہلے سے بہتر حالت میں نمودار ہوتا ہے ؎

تو ازاں روزے کہ در ہست آمدی آتشے یا خاک یا بادے بُدی
گر بداں حالت ترا بودے بقا کے رسیدے مر ترا ایں ارتقا
از مبدل ہستیِ اوّل نماند ہستیِ دیگر بجائے او نشاند
ایں بقاہا از فناہا یافتی از فنا پس رُو چرا برتافتی

زاں فنا ہا چہ زیاں بودت کہ تو بر بقا چسپیدۂ اے بے نوا

صد ہزاراں حشر دیدی اے عنود تاکنوں در لحظہ از بدوِ وجود

در فنا ہا ایں بقا ہا دیدۂ بر بقائے جسم چوں چسپیدۂ

میں نے اپنے اُس لیکچر میں جو لاہور کی کلچرل ایسوسی ایشن میں دیا گیا اور جو رسالے "اسلامک کلچر" بابت جنوری ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا ہے تفصیل سے بتلایا ہے کہ ارتقا کا سائنسی نظریہ مسلمانوں کے لئے کوئی نئی چیز نہیں بلکہ جاحظ اور ابن مسکویہ نے دسویں صدی عیسویں میں پرندوں کے مطالعہ کے بعد اس نظریہ کی تشکیل کی تھی۔ تصوّف اور علم کلام میں حیات بعد الموت کے ثبوت میں اس کو دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے چنانچہ حضرت اکبرؔ نے بھی اس استدلال سے کام لیا ہے جب وہ کہتے ہیں ؎

عبث ہے نظمِ بلیغ فطرت جو رخ نہ ہو حسنِ مدعا کا حدیثِ محشر اگر غلط ہے تو کیا نتیجہ ہے ارتقا کا

اقبالؒ اس نکتے سے اچھی طرح واقف ہیں اور متعدد و جدا فریں تشبیہوں کے ذریعہ ثابت کرتے ہیں کہ ہر جام فنا میں شرابِ زندگی کی مستی بھری ہوئی ہے وہ ایک ستارہ کے ٹمٹمانے کو کانپنے سے تعبیر کرتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں کہ کیا تجھے قمر کا خوف ہے یا سحر کا خطرہ لگا ہوا ہے تو جو یہ تمام رات کانپتے ہوئے گزارتا ہے تو شاید تجھے مآلِ حسن کی خبر مل گئی ہے کہ جب چاند نکلے گا یا سحر ہوگی تو تیری ہستی نابود ہو جائے گی پھر اس چمکنے والے مسافر کو سمجھاتے ہیں کہ اس دنیا کا آئین یہی ہے کلی کی موت میں پھول کی آفرینش کا راز پوشیدہ ہے اور لاکھوں ستاروں کے فنا ہونے سے ایک آفتاب کی ولادت واقع ہوتی ہے ؎

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر فنا کی نیند مے زندگی کی مستی ہے

وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے

شام کے سناٹے میں دریائے راوی کے کنارے وہ عالمِ خیال میں محو کھڑے ہوئے ہیں تنے میں ایک کشتی تیزی

ہے اور تھوڑی دیر کے بعد نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے اُن کا حکمت
سے کس قدر گہرا نتیجہ اخذ کرتا ہے۔

ابد کے بحر میں پیدا یونہیں نہاں یونہیں　　رواں ہے یونہیں
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا　　شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا

ایک ندی کو دیکھئے جب اُس کی چادر پہاڑ کی بلندی سے وادی کی چٹانوں پر گرتی ہے تو بظاہر
اُس کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے اور پانی کی مسلسل رَو کی بجائے آبشار کے قریب بکھری ہوئی بوندوں کی
ایک دنیا نظر آتی ہے لیکن آبشار سے تھوڑی دُور آگے وادی میں بڑھیں تو پھر وہی ندی بہتی ہوئی
دکھائی دیتی ہے۔ زندگی کی لہر بھی اسی طرح رواں ہے جس پر ان انسانی حادثات کا کوئی اثر نہیں
ہو سکتا ؎

گر کے رفعت سے ہجومِ نوعِ انساں بن گئی　　ایک اصلیت میں ہے نہرِ رواںِ زندگی
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں　　جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں

یہ ہمارا جسمِ خاکی ہمارے روح کی چنگاری کے لئے عارضی محل ہے تو ہمیں نالہ و فریاد کرنے
کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ ؎

ٹوٹا جس کا مقدّر ہو یہ وہ گوہر نہیں　　زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں

حفظِ زندگی کی خواہش ہر جاندار کی فطرت میں ودیعت کر دی گئی ہے اور کشمکشِ حیات
دنیا کا عام اصول ہے اس سے معلوم ہوا کہ خود قدرت کو بھی زندگی بہت محبوب ہے پس اگر موت
کے ہاتھوں سے نقشِ حیات مٹ سکتا تو قدرت اس کو کائنات میں اس طرح عام نہ کر دیتی۔ موت کا
اس طرح عالمگیر اور ارزاں ہونا ہی خود اس بات کی دلیل ہے کہ زندگی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں　　ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں

موت کے رازِ نہاں کو سمجھنے کے لئے ایک اور مثال پر غور کیجئے۔ ساحلِ دریا پر کھڑے ہوئے ہم ہوا اور پانی کے اُس مسلسل کھیل کو دیکھتے ہیں جس سے بلبلے پیدا ہوتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں۔ موجِ مضطر حباب کی تعمیر بھی کرتی ہے اور پھر بڑی بے دردی سے اُس نقش کو مٹا کر اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے۔ نقش کی یہ ناپائیداری اس بات کا ثبوت ہے کہ ہواؤں میں ان بلبلوں کو پیدا کرنے کی قوت ہے اگر یہ قوتِ تعمیر اس میں موجود نہ ہوتی تو وہ اس کو توڑنے میں اس قدر بے پروا کبھی نہیں ہوتی۔ قدرت ایک کائنات کو فنا کرتی ہے تو دوسری کائنات پیدا بھی کر سکتی ہے۔

ایک اچھا شاعر اپنے شعر سے خوش نہیں ہوتا تو اُسے چھوڑ کر دوسرا شعر کہتا ہے، ایک بڑا مصنف اپنے مضمون میں اس وقت تک کانٹ چھانٹ کرتا رہتا ہے جب تک وہ اُس کے دلخواہ معیار پر پورا نہ اُترے، کوئی تعمیر جب تک اچھی طرح تکمیل نہیں ہونے پاتی مصوّر اُس کو بدلتا رہتا ہے پھر قدرت جو سب سے بڑی آرٹسٹ ہے اپنے نامکمّل نقش سے کس طرح مطمئن ہو سکتی ہے۔ موت کی اس قدر لطیف توجیہہ اقبالؒ کے سوا شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے ہاں ملے۔ اگر قدرت اس پیکرِ خاکی کو فنا کرتی ہے تو اس لئے کہ وہ ایک خوب تر پیکر بنانے کی آرزو مند ہے ؎

فطرتِ ہستی شہیدِ آرزو رہتی نہ ہو خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو؟

طبعی سائنس میں انسان ایک نہایت ہی حقیر ہستی ہے جس کی اس کائنات میں کوئی اہمیت نہیں لیکن مذہب یہ سکھلاتا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور یہ ساری کائنات اسی کے لئے پیدا کی گئی ہے اگر یہ صحیح ہے تو ان ستاروں پر غور کیجئے جو کروڑوں برس سے منوّر ہیں جن کی عمر کا حساب لگاتے ہوئے ہماری عقل چکرا جاتی ہے ان کا مقابلہ انسان سے کیجئے جس کی نظر ان ستاروں سے بھی آگے ہمیشہ نُہ افلاک رہتی ہے جس کی وسعتِ فطرت میں آسمان ایک نقطہ سے زیادہ نہیں، جس کی زندگی کا مقصد فرشتوں سے بھی زیادہ پاکیزہ ہے جس کے دم سے محفلِ قدرت میں روشنی ہے جس نے اُس بارِ امانت

کو اٹھایا جس کے متحمل زمین اور آسمان بھی نہیں ہو سکے۔ اگر ستاروں کی زندگی اس قدر طویل ہے تو انسان جس کا ناخن سارِ ہستی کو چھیڑتا ہے کیا وہ ایک لحظہ میں فنا ہو جائے گا؟ کیا وہ ان چمکدار ذرّوں سے بھی کم قیمت ہے کہ ستارے تو اتنے عرصہ تک چمکتے رہیں اور انسان کی ہستی ایک لمحہ میں فنا ہو جائے ؎

شعلہ یہ کمتر ہے گردوں کے شراروں سے بھی کیا؟ کم بہا ہے آفتاب اپنے ستاروں سے بھی کیا؟

پھول کے ایک بیج کی حقیقت پر غور کیجئے اس کو مٹی میں دبا دیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ سردیٔ مرقد سے افسردہ نہیں ہوتا۔ خاک میں رہنے کے بعد بھی اُس کا سوز کم نہیں ہو جاتا۔ زیرِ خاک بھی وہ نشوونما کے واسطے بے تاب رہتا ہے اس کی ہستی میں زندگی کا جو شعلہ پنہاں ہے وہ مٹی کے اس انبار سے نہیں دب سکتا۔ خود نمائی، اور خود افزائی کے لئے وہ یہاں تک مجبور ہے کہ آخر کار بیج کا یہ دانہ گلِ نغمہ کی شکل میں نمودار ہو جاتا ہے ؎

پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ
ہے لحد اس قوّتِ آشفتہ کی شیرازہ بند ڈالتی ہے گردنِ گردوں میں جو اپنی کمند
موت تجدیدِ فراقِ زندگی کا نام ہے خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے
خوگرِ پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں موت اس گلشن میں جز سنجیدنِ پر کچھ نہیں

رات کے وقت ساری کائنات اس طرح مراقبے میں ہوتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے ہر چیز پر موت کا جادو چل گیا ہے لیکن جب صبح ہوتی ہے تو اس دنیا کا ذرّہ ذرّہ نئی زندگی لئے بیدار ہوتا ہے پس اگر ہر شام کے بعد صبح کا ہونا لازمی ہے تو پھر ہماری شبِ عدم کی صبح کیوں نہ ہو؟ کس قدر روح پرور شعر ہے ؎

یہ اگر آئینِ ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح مرقدِ انسان کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

غرض ہم قدرت کے کسی مظہر پر غور کریں ہمیں زندگی ہی زندگی نظر آئے گی۔ موت صرف ایک عارضی

حادثہ ہے جس کی دہلیز سے گذر کر ہم زندگی کی ایک دوسری منزل میں قدم رکھتے ہیں۔ یہ دنیا ہمارے امتحان وترقی کا ایک زینہ ہے آسمان کے نوپردوں کے آگے بھی بہت سے دور ہیں جن سے ہم کو گزرنا پڑے گا۔ یہ نشیمن خاکی ہو یا عالم آخرت دونوں ہماری زندگی کی جولانگاہ ہیں ؎

وہ فرائض کا تسلسل نام ہے جس کا حیات ــــ جلوہ گاہیں اس کی ہیں لاکھوں جہانِ بے ثبات

مختلف ہر منزلِ ہستی کی رسم و راہ ہے ــــ آخرت بھی زندگی کی ایک جولانگاہ ہے

انسان کا حلقۂ فکر اس قدر تنگ نہیں کہ وہ اس جسمِ خاکی کو ہماری حقیقی ہستی کے لئے ناگزیر سمجھے اس دنیا میں ہمارا کام ختم نہیں ہو جاتا بلکہ یہ تو عشق کی پہلی منزل ہے۔ اس سے آگے ابھی بہت سی منزلیں طے کرنی ہیں۔ ذیل کی نظم زبان اور خیالات کے لحاظ سے تخلیقی آرٹ کی ایک بہترین مثال ہے ؎

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ــــ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں ــــ یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر ــــ چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم ــــ مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا ــــ ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

اسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا ــــ کہ تیرے زمین و مکاں اور بھی ہیں

اس کے علاوہ افراد مٹ سکتے ہیں لیکن نسل و قوم باقی رہتی ہے۔ بادِ نسیم کی روح افزونیوں کی بدولت کلی شاخِ گل سے چٹکتی ہے لیکن ابھی پوری طرح کھلنے بھی نہیں پاتی کہ گلچیں کے ظالم ہاتھوں اُس کا خون ہو جاتا ہے اور بوئے گل کی طرح اُس کو چمن سے باہر نکل جانا پڑتا ہے۔ قمری کے آشیاں پر بجلی گر پڑتی ہے۔ بلبل صیاد کے دام میں پھنس جاتی ہے لیکن بہار کی رونق کم نہیں ہوتی۔ ہزار عنادل جانور اپنی اپنی بولی بول کر اُڑ جاتے ہیں لیکن یہ چمن اُسی طرح قائم رہتا ہے ؎

فصلِ گل از نسترن باقی تر است　　از گل و سرو و سمن باقی تر است

کانِ گوہر پروے گوہر گرے　　کم نگردد از شکستِ گوہرے

صبح از مشرق ز مغرب شام رفت　　جام صد روز از خمِ ایام رفت

بادہ ہا خوردند و صہبا باقی است　　دوش ہا خوں گشت و فردا باقی است

ہم چناں از فرد ہائے بے سپر　　ہست تقویم اُمم پایندہ تر

در سفر یاراست و صحبت قائم است　　فرد رہ گیر است و ملت قائم است

اُمتِ مرحومہ خدا کی ایک نشانی ہے اور اغیار اس نورِ الٰہی کو بجھانے کے درپے ہیں لیکن باری تعالےٰ نے اس کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے اور جب تک کہ تخلیقِ عالم کے مقصد کی تکمیل نہ ہو جائے اور صداقت اور توحید کا پرچم ساری دنیا پر نہ لہرانے لگے یہ اُمت اسی طرح زندہ رہے گی ؎

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے　　نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے　　پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

کشتیِ حق کا زمانے میں سہارا تو ہے　　عصرِ نو رات ہے دھندلا سا ستارہ تو ہے

چشمِ اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری　　ہے ابھی محفلِ ہستی کو ضرورت تیری

زندہ رکھتی ہے زمانے کو حرارت تیری　　کوکبِ قسمتِ امکاں ہے خلافت تیری

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے

نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

یہی وجہ ہے کہ اگرچہ آسمان ہمارے ساتھ ہمیشہ برسرپیکار رہا اور ہمارے سر پر وہ وہ مصیبتیں نازل کیں جو یونان اور روما نے بھی نہیں دیکھیں اور جن کے باعث سطوتِ مسلم خاک و خوں میں تڑپنے لگی لیکن ہم اس امتحان سے کبھی نہیں گھبرائے ہر مشکل کا مقابلہ کیا اور ابراہیم خلیل اللہ کی طرح آگ کو بھی اپنے لئے گلزار

بنا لیا۔ پھر اگرچہ مصر و بابل مٹ گئے نہ صفحہ دہر پر اُن کا نشان باقی ہے اور نہ دفتر ہستی میں اُن کی داستان لیکن مسلم کی اذان کی آواز فضائے عالم میں اب بھی اسی طرح گونجتی ہے ؎

از تہِ آتش براندازیم گُل ! نارِ ہر نمرود را سازیم گُل !
شعلہ ہائے انقلابِ روزگار چوں بباغِ ما رسد گردد بہار
رومیاں را گرم بازاری نماند آں جہاں گیری جہانداری نماند
شیشۂ ساسانیاں در خوں نشست رونقِ خمخانۂ یونان شکست
مصر ہم در امتحان ناکام ماند استخوانِ او تہِ اہرام ماند
در جہاں بانگِ اذاں بود است و ہست ملتِ اسلامیاں بود است و ہست

اجل کا ہاتھ ہماری قوم کو نہیں چھو سکتا اور چونکہ قوم کی ہستی میں ہی افراد کو حقیقی زندگی نصیب ہوتی ہے اس لئے قوم کی خاطر قربان ہو جانے میں کسی قسم کی جھجک نہیں ہونی چاہیئے۔

ایک سچے عاشق کو موت سے کوئی ڈر نہیں کیونکہ اگرچہ موت ہر چیز پر غالب آتی ہے لیکن عشق پر غالب نہیں آتی، "ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما" کی اس قدیم حقیقت کو اقبالؒ نے عشق اور موت کے فرشتوں کی اچانک ملاقات کے لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے عشق کا فرشتہ جنت کی سیر کو جا رہا تھا کہ راستے میں موت کے فرشتے سے اُس کی مٹ بھیڑ ہوگئی ہے دونوں ایک دوسرے سے بالکل نا واقف ہیں۔ فرشتۂ موت کی کریہہ صورت کو دیکھ کر عشق کا فرشتہ پوچھتا ہے کہ تو کون ہے؟ وہ جواب دیتا ہے کہ میں اجل ہوں، رختِ ہستی کے پُرزے اُڑاتا اور زندگی کی چنگاری کو بجھاتا ہوں۔ میری آنکھ میں جادوئے نیستی اور میرے اشارے میں پیامِ فنا ہے۔ لیکن دنیا میں ایک ہستی ایسی ہے کہ وہ آگ ہے اور میں اُس کے سامنے پارا ہوں ؎

سنی عشق نے گفتگو جب قضا کی ہنسی اُس کے لب پر ہوئی آشکارا

گری اس تبسم کی بجلی اجل پر اندھیرے کا ہو نور میں کیا گذارا
بقا کو جو دیکھا فنا ہو گئی وہ قضا تھی شکارِ قضا ہو گئی وہ

عشق اور موت کے فرشتوں کی ایک اور ملاقات کا ذکر میں نے ایک جرمن نظم میں پڑھا تھا اور چونکہ یہ ایک بے حد اچھوتا مضمون ہے اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کو مختصر طور پر یہاں بیان کردوں۔ عشق کا فرشتہ اپنی پیہم محنت سے تھک کر ترکش کو کمر سے کھولے ہوئے آرام کر رہا ہے اور جامِ شراب کے پینے میں مشغول ہے موت کا فرشتہ اپنی تیر و کمان کو لئے ہوئے شکار کی فکر میں ادھر سے گزرتا ہے عشق کا فرشتہ آواز دیتا ہے دوست تم اس قدر جلدی میں کہاں چلے۔ اہل جہاں کو تھوڑی مہلت اور مل جائے تو تمہارا کیا بگڑ جائے گا۔ آؤ کچھ دیر آرام کر لو اور چند جام تم بھی نوش کر لو۔ موت کا فرشتہ بھی اپنی ترکش کو کھول کر رکھ دیتا ہے اور دونوں خوب پی کر مدہوش ہو جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس مدہوشی اور غفلت سے چونکتے ہیں اور گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تاکہ اپنی اپنی مہم پر روانہ ہوں۔ جلدی سے تیر اور کمان سمیٹ کر اپنے اپنے راستہ پر نکل جاتے ہیں لیکن بہت دیر نہیں گزرتی کہ دونوں حیرت کے مارے مبہوت ہو جاتے ہیں۔ عشق کا فرشتہ دیکھتا ہے کہ جس نوجوان پر اس نے تیر چلایا تھا وہ عشق و محبت کے سمندر سے کھیلنے کی بجائے موت کا شکار ہو جاتا ہے اسی طرح موت کا فرشتہ یہ دیکھ کر دنگ ہو جاتا ہے کہ جس بوڑھے کو نشانۂ اجل بنانا چاہتا تھا وہ مرنے کی بجائے عشق و ہوس کے فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے اس وقت اُن فرشتوں کو احساس ہوتا ہے کہ اُن کے تیر بدل گئے ہیں موت کے چند تیر فرشتۂ عشق کی ترکش میں ہیں اور عشق کے چند تیر فرشتہ موت کی ترکش میں۔ شاعر نے اس لطیف پیرایہ میں جوانی کی موت اور بڑھاپے کی عاشقی دونوں کی توجیہہ کی ہے۔

اقبالؒ بتاتے ہیں کہ موت کا فرشتہ اگرچہ ہمارے جسم سے جان نکال لیتا ہے لیکن ہمارے وجود کے مرکز تک اُس کی رسائی نہیں ہوتی ہمارا زندہ دل قبر میں بھی بے قرار رہتا ہے۔ سے

لحد میں بھی یہی غیب و حضور رہتا ہے اگر ہو زندہ تو دل ناصبور رہتا ہے
فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا ترے وجود کے مرکز سے دُور رہتا ہے

اس جسمِ خاکی کے مرجانے سے جان نہیں مرتی۔ دل حلقۂ بود و عدم سے آزاد ہے ؎

چہ غم داری حیاتِ دم بدم نیست کہ دل در حلقۂ بود و عدم نیست
مخور اے کم نظر اندیشۂ مرگ اگر دم رفت دل باقی است غم نیست

دنیا کی ساری چیزیں فنا ہو جائیں لیکن جوہرِ انسان کی حقیقت کچھ اور ہے اس کو فنا ممکن نہیں ہے ؎

سر بر کیقباد اکلیلِ جم خاک کلیسا و تبستان و حرم خاک
ولیکن من ندانم گوہرم چیست نگاہم برتر از گردوں، تنم خاک

سحر کے وقت شاعر کے حساس دل میں ہر جاندار اور بے جان چیز سے پیام قبول کرنے کی قابلیت بڑھ جاتی ہے وہ صبح کے تاروں کو اپنا دردِ دل سنانے کے لئے فضائے دشت میں گھوم رہا ہے راکھ کے ایک ڈھیر سے اُس کو کچھ سرگوشیوں کی آواز سنائی دیتی ہے راکھ بادِ صبا سے کہہ رہی ہے کہ "کبھی میں بھی بھڑکتی ہوئی آگ تھی جس سے رہرو اپنے جسم کے لئے گرمی حاصل کرتے تھے لیکن اس صحرا کی ہوا اُس نے میری چنگاریوں کو ٹھنڈا کر دیا تو آہستہ چل تاکہ میرے یہ افسردہ ذرّے بکھر نہ جائیں۔ ورنہ جس قافلے کے سوز و گداز کی میں نشانی ہوں اُس کی یاد بھی باقی نہ رہے گی" یہ سن کر شاعر کو اپنی حالت یاد آتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اُس کی ہستی بھی خاک سے زیادہ نہیں اور وہ بھی اس رہگزر میں پڑا ہوا ہے بادِ حوادث کی تباہ کاریوں کے خیال سے اُس کی آنکھ سے بے اختیار آنسو بہنے لگتے ہیں۔ اتنے میں اُس کے کان میں دل کی یہ آواز پہنچتی ہے کہ تو اس مشتِ خاک کی تباہی پر کیوں افسوس کرتا ہے۔ ابد اور ازل میرے ہی رہینِ منت ہیں اور میری کوئی انتہا نہیں ہے ؎

بگوشِ من رسید از دل سرودے که جوئے روزگار از چشمه سارم
ازل تاب و تبِ دیرینۂ ما ابد از ذوق و شوقِ انتظارم
میندیش از کفِ خاکے میندیش بجان تو که من پایاں ندارم

من کی دنیا میں فنا کا گزر نہیں۔ انسان موت کے غم میں اسی لئے گھلا جارہا ہے کہ وہ اپنی
نیت کو پیکرِ خاکی پر منطبق کرتا ہے۔ جب تک ہم اپنی حقیقت سے واقف نہ ہوجائیں اس
رُ سے نجات ممکن نہیں ؎

تری نجات غمِ مرگ سے نہیں ممکن کہ تو خودی کو سمجھتا ہے پیکر خاکی

انسان اگر اپنی خودی کی نگہداشت کرے تو مرنے کے باوجود زندہ رہتا ہے۔ یہ چاند ستارے اور
ت فنا ہوجائیں گے لیکن خودی کا نشہ وہ ہے جو ابد تک نہیں اُترے گا ؎

مہ و ستارہ مثالِ شرارہ یک دو نفس مئے خودی کا ابد تک سرور رہتا ہے

خودی جب پختہ ہوجائے تو موت سے پاک ہوتی ہے جس نے اپنی خودی کو مستحکم کرلیا اُسے
، والی موت کا کوئی ڈر نہیں ہوتا۔

ازاں مرگے کہ می آید چہ باک است خودی چوں پختہ شد از مرگ پاک است

اقبال نے بارہا یہ نکتہ سمجھایا ہے کہ انسان کی تمام برائیوں کی جڑ خوف اور خصوصاً موت کا خوف
۔۔ خوف اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والی ناامیدی کو وہ "اُم الخبائث" کہتے ہیں۔ ڈر سے کانپنے
لے اور نڈر دلوں کا انہوں نے اکثر مقابلہ کیا ہے، اور بتلایا ہے کہ نڈر انسان شیر کو بھی بکری سمجھ
س کے مقابلے کے لئے تیار ہوجاتا ہے اور ڈرپوک شخص ہرن سے بھی ایسے بھاگتا ہے گویا شیر اس
، تعاقب میں ہے اگر ہمارے دل میں خوف کا کوئی شائبہ نہیں تو سمندر کو بھی ہم صحرا کی طرح بے کھٹکے
ر سکتے ہیں لیکن اگر ہم خوف و ہراس سے مغلوب ہیں تو سمندر کی ہر موج میں ہم کو مگرمچھ دکھائی دیتا ہے ؎

دل بے باک را ضرغام رنگ است دلِ ترسندہ را آہو پلنگ است
اگر بیمے نداری بحر صحرا است اگر ترسی بہر موجش نہنگ است

شہنشاہِ عالمگیر کی بے باکی تاریخ ہند میں مشہور ہے۔ موت کو وہ خاطر میں نہ لاتا تھا چنانچہ ایک مرتبہ محاصرہ گولکنڈہ کے زمانے میں جب ظہر کی نماز کا وقت آیا تو فصیل کے سامنے مغل فوج صف باندھ کر نماز میں مشغول ہو گئی۔ قلعہ کی دیوار سے قطب شاہی تیر اندازنے یکے بعد دیگرے کئی اماموں کو نشانۂ اجل بنایا تو پہلی صف میں سے کوئی دوسرا شخص امامت کے لئے بڑھنے سے جھجکنے لگا عالمگیر جو اُسی صف میں کھڑا تھا فوراً آگے بڑھ گیا اور حضورِ قلب کے ساتھ امامت کرنے لگا یہ جوش اور نڈرپن بھی ایک خصوصیت تھی جس کے باعث ہمارے اسلاف نے جہانگیری کی۔ اقبالؒ اسی بے خوف زندگی کی طرف ہمیں واپس لانا چاہتے ہیں۔ وہ خداوند کریم کا وعدہ یاد دلاتے ہیں کہ اللہ پر بھروسہ کرنے والوں کے لئے کوئی ڈر نہیں۔ جس کے دل میں ایمان کی قوت ہو وہ حضرت موسیٰؑ کی طرح فرعون سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے موت کا ڈر عمل کا دشمن ہے یہ ڈر ہماری زندگی کے قافلے پر چھاپا مارتا ہے اس سے ہمارے محکم ارادے بھی متزلزل ہو جاتے ہیں اور ہماری بلند ہمت اندیشوں سے گھر جاتی ہے۔ جب اس ڈر کا بیج ہماری طبیعت میں بویا جاتا ہے تو زندگی کی نشوونما رک جاتی ہے اس سے ہمارے دلوں میں لرزہ اور ہمارے ہاتھوں میں رعشہ پڑ جاتا ہے ہمارے پاؤں سے طاقتِ رفتار اور ہمارے دماغ سے فکر کی قوت سلب ہو جاتی ہے جب دشمن ہم کو خوف زدہ دیکھتے ہیں تو شاخِ گل کی طرح توڑ کر ہم کو باغ سے پھینک دیتے ہیں۔ اُن کی تلوار زیادہ قوت کے ساتھ ہمارے سر پر پڑتی ہے اور اُن کی نگاہ خنجر کی طرح ہمارے سینہ میں گھس جاتی ہے۔ ہمارے دل کی تمام بُرائیاں خوف کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ مکاری، کینہ اور جھوٹ خوف کی فضا میں پرورش پاتے ہیں، خوف کے دامن میں ریاکاری اور فتنے پلتے

ہیں جس کسی نے دین الٰہی کی رمز کو پہچانا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اصل شرک خوف میں مضمر ہے اسی لئے جو شخص شرک سے پاک ہونا چاہتا ہے اُس کو چاہیئے کہ خوف غیر اللہ اور خصوصاً خوف مرگ کو دل سے دُور کردے ۔شانِ قلندری یہی ہے کہ ہم غم زندگی سے بے نیاز ہو جائیں ورنہ یہ غم ہماری جان کو زہر کی طرح کھا جاتا ہے ؎

دمِ زندگی رمِ زندگی غمِ زندگی سمِ زندگی　　غمِ رم نہ کر سمِ غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری

جو دل رمزِ حقیقت سے آگاہ ہے اس کو موت کی کچھ پروا نہیں ہوتی کیونکہ وہ جانتا ہے کہ رات کی یہ خاموشی ہنگامۂ فردا کو اپنی آغوش میں لیئے ہوئے ہے ؎

موت کی لیکن دلِ دانا کو کچھ پروا نہیں　　شب کی خاموشی میں جز ہنگامۂ فردا نہیں

مردِ حق کی نشانی یہ ہے کہ موت کا ہنسی خوشی استقبال کرے اس کا ثبوت اقبالؒ نے خود اپنی مثال سے بھی دیا ہے مرتے وقت اپنا یہ شعر اُن کی زبان پر تھا ؎

نشانِ مردِ حق دیگر چہ گویم　　جو مرگ آید تبسّم برلبِ اُوست

حجِ بیت اللہ سے فارغ ہو کر ایک قافلہ مدینۂ منورہ کی زیارت کو جا رہا تھا کہ وہ راستے میں رہزنوں کا شکار ہو جاتا ہے ایک زائر کے سوا باقی تمام شریکِ قافلہ قتل ہو جاتے ہیں ۔اس مردِ صادق کے تاثرات آپ بھی سن لیجئے جو اس حادثے کے باوجود تنِ تنہا یثرب کی طرف چلا جاتا ہے ؎

قافلہ لوٹا گیا صحرا میں اور منزل ہے دور　　اس بیاباں یعنی بحرِ خشک کا ساحل ہے دُور
اُس بخاری نوجواں نے کس خوشی سے جان دی　　موت کے زہراب میں پائی ہے اس نے زندگی
خنجرِ رہزن اُسے گویا ہلالِ عید تھا　　ہائے یثرب دل میں، لب پر نعرۂ توحید تھا
خوف کہتا ہے کہ یثرب کی طرف تنہا نہ چل　　شوق کہتا ہے کہ تو مسلم ہے بے باکانہ چل
خوفِ جاں رکھتا نہیں کچھ دشتِ پیمائے حجاز　　ہجرتِ مدفونِ یثرب میں یہی پنہاں ہے راز

گو سلامت محمل شاہی کی ہمراہی میں ہے عشق کی لذت مگر خطروں کی جانکاہی میں ہے

آہ یہ عقلِ زیاں اندیش کیا چالاک ہے اور تاثر آدمی کا کس قدر بے باک ہے

کوئی قوم اُس وقت تک زندہ نہیں رہتی اور معرکۂ حیات میں نہیں پہنچتی جب تک کم از کم اس کے ممتاز ترین افراد میں جانثاری اور سرفروشی کا جذبہ اس قدر نہ ہو کہ وہ قوم کی خاطر ہر قسم کے ایثار و قربانی کے لئے تیار رہیں۔ اقبالؒ کے نزدیک ساری داستانِ حرم صرف اس قدر ہے کہ اس کا دیباچہ تذکرۂ اسماعیلؑ ہے جو خدا کی بارگاہ میں اوس کے حکم پر اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار تھے اور اس کا خاتمہ ذکرِ حسینؓ ہے جنہوں نے حق و صداقت کے لئے سب کچھ نثار کر دیا ؎

غریب و سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسماعیل

قوم کے پودے کی آبیاری دریا کے پانی سے نہیں بلکہ اُس خون سے ہوتی ہے جو شہیدوں کے سینہ سے نکلتا ہے، ملت کی آبرو اُس پیالے میں جھلکتی ہے جس میں خونِ شہدا بھرا ہوا ہے یہ خون قدر و قیمت میں حرم سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ اس لئے اقبالؒ شہیدوں کی تربت پر لالہ کے پھول نچھاور کرتے ہیں ؎

سرِ خاکِ شہیدے برگ ہائے لالہ می پاشم کہ خونش با نہالِ ملتِ ما سازگار آمد

عرب کی ایک لڑکی فاطمہ طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوتی ہے تو اُس بےتیغ و سپر جہاد کرنے والی کو وہ "آبروئے اُمتِ مرحومہ" کا لقب دیتے ہیں۔ اگرچہ فاطمہ کے غم میں اُن کی آنکھ آنسو بہا رہی ہے لیکن اُن کے نالۂ ماتم میں نغمۂ عشرت بھی موجود ہے کیونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ جس باغ کو خزاں نے اُجاڑ دیا تھا اور جس کے متعلق یہ سمجھ لیا تھا کہ اس میں اب کوئی پھول کھل نہیں سکتا اس میں ایسی کلی بھی موجود تھی۔ جس راکھ کو مدت...........

سے افسردہ سمجھا جا رہا تھا اس میں ابھی ایسی چنگاریاں بھی باقی ہیں، جن بادلوں کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ وہ مدت ہوئی برس چکے اُن میں ابھی بجلیاں سو رہی ہیں ؎

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں ۔ بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

زندگی اور موت کی حقیقت جاوید نامہ میں سلطان ٹیپو کی زبانی دریائے کاویری کو سنائی ہے ۔ زندگی اصل حقیقت ہے، موت ایک فریب اور دھوکا ہے ۔ غلام کی موت کے خوف سے زندگی حرام ہو جاتی ہے لیکن بندہ آزاد کے لئے موت ایک لمحہ سے زیادہ نہیں۔ موت سے اُس کو نئی زندگی ملتی ہے اگرچہ ہر موت مومن کے لئے خوش آئند ہے لیکن حسین ابن علی کی موت کچھ اَور ہی شان رکھتی ہے ؎

ہر زماں میرد غلام از بیم مرگ ۔ زندگی اُو را حرام از بیم مرگ

بندۂ آزاد را شانے دگر ۔ مرگ اُو را می دہد جانے دگر

اُو خود اندیش است مرگ اندیش نیست ۔ مرگِ آزاداں ز آنے بیش نیست

گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر ۔ مرگِ پورِ مرتضیٰ چیزے دگر

جنگِ شاہانِ جہاں غارت گری است ۔ جنگِ مومن سنتِ پیغمبری است

کس نداند جز شہید ایں نکتہ را ۔ کو بخونِ خود خرید ایں نکتہ را

غرض موت صرف بے غیرتی کی زندگی کا نام ہے ۔ عزت اور آبرو کی زندگی میں سر کھونا ہی بقائے دوام سے کم نہیں ۔ شیر کی زندگی کا اک لمحہ بکری کی عمر کے سو سال سے زیادہ ہے ۔ سمندر کی موجوں سے ایک گھڑی مقابلہ کرنا اور اُس کے مقابلے میں فنا ہو جانا ہزار برس ساحل پر آرام کی زندگی سے خوشتر ہے ۔

زندگی چاہے مختصر ہو لیکن کام کی ہو، خضر کو اپنی عمر دراز میں زندگی کی کوئی لذت حاصل نہیں لیکن پروانہ کو ایک پل بھر شمع کے گرد طواف کرنے میں حقیقی سرور نصیب ہوتا ہے ؎

شنیدم در عدم پروانہ مے گفت | دمے از زندگی تاب و تبم بخش
پریشاں کن سحر خاکسترم را | ولیکن سوز و ساز یک شبم بخش

اس طرح اگرچہ ہماری دنیوی زندگی صرف ایک دو لمحے رہے گی لیکن ہمیں تب و تاب جاودانہ حاصل ہوگا۔ کام زیادہ اور وقت تھوڑا ہے۔ فرصت عمل دم بھر سے زیادہ نہیں اس لئے جو کچھ کرنا ہے ابھی کرنا چاہیئے۔ نپولین کے مزار پر کھڑے ہوئے اقبالؒ سوچتے ہیں کہ اگرچہ اب یہ آرام سے سو رہا ہے لیکن ایک وقت وہ تھا کہ اس نے دنیا میں ہلچل مچا دی تھی۔ اس مزار پر کھڑے ہوئے وہ موت کا راز کھول کر بیان کرتے ہیں اور ہمارے لئے زندگی اور عمل کا پیغام چھوڑ جاتے ہیں ؎

راز ہے، راز ہے تقدیر جہانِ تگ و تاز | جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوشِ کردار سے شمشیر سکندر کا طلوع | کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز
جوشِ کردار سے تیمور کا سیل ہمہ گیر | سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز
صفِ جنگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر | جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز
ہے مگر فرصتِ کردار نفس یا دو نفس | عوضِ یک دو نفس قبر کی شب ہائے دراز

"عاقبت منزل ما وادیٔ خاموشاں است
حالیا غلغلہ در گنبدِ افلاک انداز"

(اُردو)

اقبال اور قرآن

(سید صبغۃ اللہ بختیاری شیخ التفسیر جامعۂ دار السلام عمر آباد مدراس)

علامہ اقبال قدس سرہ العزیز کی شخصیت تعریف و تعارف سے بے نیاز ہے۔ نہ صرف ہندوستان کا اسلامی طبقہ بلکہ اسلامی دنیا اور یورپ و امریکہ کے علمی حلقوں میں بھی موصوف کو ایک خاص شہرت حاصل ہے۔ یہاں تک کہ بعض مغربی فضلاء و مصنفین نے اقبال پر کتابیں بھی لکھی ہیں تاہم وہ صحیح حقیقت جو اقبال کے پیام سے متعلق ہے ابھی تک منصۂ شہود پر جلوہ گر نہیں ہوئی۔ علامہ کی زندگی ہی میں ان کے متعلق مختلف معلومات پر نظر ڈالی گئی ہے۔ اور انتقال کے بعد سے تو اس موضوع کی طرف بہت زیادہ توجہ کی جا رہی ہے، ملک کے اخباروں، رسالوں کے صفحات اس سے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ علمی مجلسوں، مدرسوں، اسکولوں اور کالجوں سے گزر کر اسلامی دار العلوموں میں آج تک اقبال کا چرچا ہو رہا ہے۔ چند خاص اداروں کو چھوڑ کر عام طور پر جو چیزیں اقبالیات پر ہماری نظر سے گذری ہیں۔ ان میں اقبال اور اس کے تجدیدی پیام کو بالکل غیر حقیقی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ بعض رسالے اس عمومیت سے مبرا ہیں، اور کلام اقبال کی تشریح خود اقبال کے نظریہ کے مطابق اسلامی انداز میں کر رہے ہیں کہ درحقیقت یہی سچی ترجمانی ہے۔ علامہ مرحوم کے پیش کئے ہوئے فلسفیانہ حقائق کو سمجھنے کے لئے اسلامیات سے واقفیت کی سخت ضرورت ہے۔ اسلامی علوم تفسیر، حدیث اور تصوف و کلام اور حکمائے اسلام

اور علمِ فلسفہ جاننے کی حاجت ہے گویا اقبال اور اس کے مجددانہ کارناموں کو سمجھنے کے لئے لازمی ہے کہ شیخ محی الدین ابن عربی، امام فخر الدین رازی، امام حجۃ الاسلام غزالی، عارف سنائی، اور مولانا جلال الدین رومی وغیرہم کے نظریات پیش نظر ہوں۔ اور افسوس کہ آج کل اسلام اور اسلامیات سے بے گانگی نے ان اکابر کے علوم کے استفادہ سے محروم کر دیا ہے۔ علوم اسلامی کے علاوہ علومِ جدید کی کافی واقفیت ہو۔ موجودہ سیاسی، عمرانی، اور اجتماعی تحریکات سے آشنائی ہو۔ مغرب کے مادہ پرستانہ رجحانات، تہذیبی و ثقافتی میلانات سے بہ درجۂ اتم تعارف ہونا چاہئے اور نہ صرف معلومات کی حد تک یہ تعارف ہو بلکہ اسلامی انداز فکر و تحقیق سے ان پر حکیمانہ تبصرہ بھی کیا جا سکتا ہو۔

اس جامعیت کے ساتھ مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہو سکے گا کہ اقبال نے کیا کام کیا ہے اور کیا اسلامی پیام نوع انسانی کو دیا ہے ؎

خرد افزود مرا درسِ حکیمانِ فرنگ
سینہ افروخت مرا صحبتِ صاحب نظراں

اکثر و بیشتر آج کل اہل زمانہ کو جو الجھنیں اقبالیات کے سمجھنے میں پیش آ رہی ہیں اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ نگاہیں کوتاہ بیں ہو گئی ہیں۔ اسلامیات کے محققانہ مطالعہ سے عاری ہیں بعض تو "درس حکیماں فرنگ" کے محض عالم ہیں مگر "صحبت صاحب نظراں" سے ناآشنائے محض ہیں جب تک یہ دونوں باتیں جمع نہ ہوں گی۔ اقبالیات کا روشن پہلو سمجھ میں نہ آ سکے گا۔

اقبال و رومی حضرت اقبال مرحوم نے اپنی آخری کتاب "ارمغان حجاز" میں خود ہی اپنے متعلق آخری فیصلہ کر دیا ہے۔ ؎

چو رومی در حرم دادم اذاں من — ازو راموختم اسرارِ جاں من
بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن او — بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں من

لہٰذا کم از کم اقبال کے فلسفہ کے مرکزی توجہ کو سمجھنے کے واسطے مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق محققانہ مطالعہ کی شدید ضرورت ہے۔ اور معلوم کر لینا چاہیئے کہ "عصر کہن" کا وہ کون فتنہ تھا جس کو مولانائے روم نے مٹایا تھا اس لیئے اس پر مختصر سا عرض کر دینا ضروری ہے۔

اہل اسلام کے وسطی دور میں جب ایرانیوں کے تخیلات، یونانیوں کے توہمات اور دوسری عجمی قوموں کے علوم و فنون "عقلیات" کے نام سے شائع ہونے لگے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک "طبقہ" ان علوم کو پڑھ کر "ذہنی ارتداد" یا "معنوی تحریف" میں مبتلا ہو گیا اور دوسرا طبقہ ان حضرات کا تھا جس نے اس افراط و تفریط کو دیکھ کر اپنا ایمان سلامت رکھنے کے لیئے یہ صورت سوچی کہ ان علوم سے اپنی آنکھیں بند کر لو اور کانوں میں انگلیاں ٹھونس لو۔ البتہ ایک طبقہ ایسا ضرور پیدا ہوا جس نے علوم و فنون کو حاصل کر کے انہیں کے مزعومہ "عقلی تعبیر" سے اسلام کو پیش کرنا شروع کر دیا اور "تکلم بالفلسفہ" گویا انتہائی سعادت خیال کی جانے لگی یہاں تک کہ پھر اللہ تعالیٰ نے فضل و کرم سے، صدیق اکبر کی نسل سے ایک "صدیق زماں" کو بھیج دیا جس نے مدتوں کی قیل و قال اور درسی زندگی کے بعد شمس تبریزی سے "اشراق نوری" حاصل کیا اور اپنے پرسوز تعبیرات سے اسلامیات کی ایسی حقیقی اور عمدہ تعبیر کی جس کو علمائے وقت نے "ہست قرآن در زبانِ پہلوی" کا خطاب دیا اور "فتنہ ثنویت" کی وجہ سے اعتزال، رفض اور خروج کے جو فتنے اٹھ کھڑے ہوئے تھے سب کا خاتمہ کر دیا اور تمام حقائق اسلامیہ کی پھر ایک مرتبہ تجدید ہو گئی زیادہ تفصیلی طور پر اگر سمجھنا ہو تو مولانا بدر الدین دریابادی کی مرتب کردہ کتاب "فیہ ما فیہ" کا مطالعہ کیا جائے جو مولانا رومی کے ملفوظات طیبات کا مجموعہ ہے اور علامہ شبلی کی تصنیف "سوانح مولانا روم" دیکھنی چاہیئے۔

اب اقبال کا پیام کیا ہے جس نے رومی کی طرح عصر رواں کے فتنوں کا مقابلہ کرنا شروع کر دیا ہے اس کا اندازہ ذیل کے اشعار سے لگ جائے گا۔ "اسرار خودی" میں علامہ نے کہا ہے۔

باز برخوانم زفیضِ پیرِ روم دفترِ سربستہ اسرارِ علوم

جاں او از شعلہ ہا سرمایہ دار من فروغِ یک نفس مثلِ شرار

پیرِ رومی خاک را اکسیر کرد از غبارم جلوہ ہا تعمیر کرد

موجم و در بحرِ او منزل کنم تا دُرِ تابندہ حاصل کنم

من کہ مستی ہا ز صہبایش کنم زندگانی از نفس ہایش کنم

بہ ہر حال علامہ مرحوم کا فلسفہ اور پیام "اسلامیات" کی وہی صدائے بازگشت ہے، جو مولانا رومی و دیگر حکمائے اسلام نے لگائی تھی، البتہ اس کو دورِ حاضر کے مذاق کے مطابق اقبالؒ نے ڈھالنے کی سعیِ بلیغ فرمائی۔ ہمیں سخت تعجب ہوتا ہے جب ہم اقبالیات پر ایسے مضامین پڑھتے ہیں جن میں اقبال کو اسلام سے علیحدہ کر کے "انسانیت" کا داعی سمجھا جاتا ہے حقیقت میں یہ اسلام سے ناواقفیت کی دلیل ہے اسلام موجودہ لٹریچر کا "مذہب" نہیں ہے بلکہ ایک انقلابی تحریک کا نام ہے۔ جس کا پروگرام قرآن عزیز ہے اور اس کا عملی نمونہ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی ہے اور اولین کوششوں سے انسانی دنیا کے لئے جو "بین الاقوامی پارٹی" اس پروگرام کے مطابق تیار ہوئی وہ صحابہؓ کرام کی جماعت ہے جب تک اسلام کو محدود معنی میں "مذہب" سمجھ کر جاہلی تصور کو باقی رکھا جائے گا۔ ہر اسلامی چیز ایک "فرقہ داریت" یا ایک "قومیت" کی چیز نظر آئے گی لہٰذا جن لوگوں نے مذہب کا یہ مفہوم لیا ہے وہ اسلام کے داعی اقبال کو بھی ایک فرقہ یا قوم کا داعی سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔

اسلام کا موضوع اصلاحِ "انسانیت" ہے وہ انسانیت سے بحث کرتا ہے اسی کی اصلاح اس کے پیشِ نظر ہے پس جو کوئی اسلامی اصلاح کا آوازہ بلند کرے گا۔ وہ انسانیت کی اصلاح کا داعی ہوگا۔

علامہ اقبالؒ نے ٹھیک ٹھیک اسی طرح جہادِ حق کیا ہے۔ جس طرح مولانا رومی نے فرمایا تھا۔ مولانا رومی نے ثنویت کے خلاف جہاد کیا تھا اور اقبالؒ نے اس دور کی ثنویت کے خلاف زبردست آواز بلند

کی ہے۔ اس دور کی "ثنویت" کیا ہے؟ اس کی تفصیلی کیفیت تو اب نہیں بتائی جا سکتی مگر اجمال ہی سے سمجھ لیا جائے۔

عہد حاضر میں علوم عقلیہ، سائنس، عمران وغیرہ نے ترقی حاصل کی ہے اور جو مذاہب غیر فطری تھے خواہ سماوی ادیان کی مسخ شدہ صورتیں ہوں یا غیر سماوی ملل شائستہ اور ظاہری طمطراق والی شکل ہو، بہرکیف جب مذہب اور موجودہ عقلی علوم کی کشمکش شروع ہوئی تو اہل مذاہب نے اس کو غنیمت جان لیا کہ کسی طرح مذہب کے مفہوم میں محدودیت پیدا کر دی جائے اور سیاست کے ساتھ اس کا دامن بندھا ہوا نہ ہو بلکہ "مذہب" اور "سیاست" دو علیحدہ علیحدہ راہیں قرار دے دی جائیں تاکہ ایک دوسرے کے "اجتماع" سے حیات انسانی کی ترقی رک نہ جائے۔ بے شک یہ "ثنویت" اسلام کے علاوہ دوسرے ادیان و ملل کے لئے کوئی مادی ترقی کا ذریعہ ثابت ہوئی ہو مگر مسلمانوں کی نفسیات تو بالکل اس کے برعکس ثابت ہوئی اور دوسروں نے اگرچہ اس "ثنویت" سے فائدہ اٹھایا مگر مسلمانوں نے اسی سے اپنی "حیات اجتماعیہ" کو خاک میں ملا دیا۔

مذکورہ بالا اصل سے جو فروعی چیزیں پیدا ہوئیں بے شمار ہیں مثلاً "وطنی قومیت" یا "نسلی قومیت" کا ایسا بھوت سر پر سوار ہوا کہ اس کے نشہ میں ہر ایک مسلمان سرشار نظر آ رہا ہے خود ہندوستان کے اندر کہیں "وطنی قومیت" کی بنیاد پر انسانوں کو جمع کیا جا رہا ہے تو کہیں اسلام کا نام لے کر عین اس کے مقاصد کے خلاف "قومیت" پیدا کی جا رہی ہے جو سرتاپا "نسلیت" کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے اگر ایک طرف ہندوستان کے اندر بسنے والوں کو "قوم واحد" فرض کیا جا رہا ہے تاکہ ان کی اسلامی خصوصیات برقرار نہ رہ سکیں تو دوسری طرف خود مسلمانوں میں یہ نامانوس صدا اٹھ رہی ہے کہ تمام مسلمان ایک قوم ہیں اور یہ "مسلمان قوم" کے نام سے جو ہندوستان میں انسانی گروہ پایا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس میں منکرین خدا اور منکرین معاد تک موجود ہیں یا چونکہ "مسلمان قوم" ہے جس میں شریک ہونے کے لئے محض سرکاری رجسٹر مردم شماری کا اندراج کافی ہے خواہ وہ اسلام کے اولین اصول بنیادی حقائق اور ابتدائی عقائد کے ہی خلاف کیوں نہ ہو غرض

"قومیت" کہ یہ دونوں تصورات اسلامی تعلیم کے خلاف ہیں اور اس کی علامہ اقبال نے اپنے کلام میں تردید کی ہے۔ البتہ "امت مسلمہ" کے لئے "قوم رسول ہاشمی" کی تعبیر استعمال کی ہے اس سے زیادہ کیا عرض کیا جائے "فتنۂ عصر رواں" یہی ہے جس کو اقبال نے مٹایا ہے۔ اقبال کا نام لے کر ایسے خیالات پھیلانا جو اس کے فلسفہ کی بنیاد کو ہلا دیتے ہیں بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک عرب شاعر نے کہا ہے۔ ؎

وکل یدّعی وصلاً للیلیٰ   ولیلیٰ لاتقر له بذاك

اللہ تعالیٰ علامہ مرحوم کو مغفرت فرمائے، ان کی قبر نور سے بھرے کہ اپنے کلام کے اندر اسلامی اصول کی ترجمانی ایک ایسے دل نشیں، دل آویز انداز اور اسلوب سے کی ہے جس سے موجودہ زمانے کی مادہ پرستانہ الحاد، بے دینی اور مغرب پرستی اور غیر اسلامی فکر و نظر کا استیصال ہو جاتا ہے جو موجودہ ملحدانہ طرز زندگی کو اسلامی تشکیل دینے میں ممد و معاون ہو رہا ہے اقبال کے کلام کا گہری نظر سے مطالعہ، امید ہے کہ "نظرا دلو" کو "حقائق اسلامیہ" سے بہت جلد بہرہ ور کرے گا۔

فلسفۂ اقبالؒ کی خصوصیات اقبال نے اپنے فلسفہ کی تعبیر کے لئے دو اصطلاحات استعمال کی ہے اس لئے ہم اس کی کچھ مختصر سی تشریح بھی کر دیتے ہیں، تاکہ "اقبالیات" سمجھنے والوں کے لئے آسانی ہو۔ "خودی" حقیقت میں انسان کے اندر ایک نورانی جوہر ہے انسان کی زندگی اور اس کے تمام لوازم و آثار سب کچھ خودی کے مظاہر ہیں انسان میں یکتائی، وحدت، اور انفرادیت خودی ہی کی بہ دولت پیدا ہوتی ہے خودی ہی کی وجہ سے "من" و "تو" میں تفریق و تمیز کی جا سکتی ہے۔ خودی ہی سے خودنگری، خودگری منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی ہیں۔ انسان کا اپنی فطرتِ سلیم پر قائم رہنا اپنے وجود کو ایسا استقلال و استحکام بخشنا جس کے باعث مادی حیات میں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی تمام ظاہری و باطنی قوتیں کام میں لائی جائیں اٹھنا، اٹھانا، اڑنا، اڑانا، دوڑنا، دوڑانا، جلنا، جلانا، مرنا، مارنا، اور پھر سب پر ہویدا و آشکارا ہو کر اپنی حقیقت سے روشناس کرانا یہ سب کچھ خودی کے نتائج ہیں الغرض وہ تمام قوائے فطریہ جو فاطر السموٰت

وَالْاَرض نے انسان کو عطا فرمائے ہیں ان کو صحیح طریقے کے ساتھ بر محل استعمال کرنا اور ان کی اس طور پر نگہداشت کرتے رہنا کہ کوئی قوت ضائع نہ ہو جائے۔ یہ سب خودی کے کرشمے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے متقین کے خصائص و لوازم میں ایک چیز بیان فرمائی ہے "مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ" "ہم نے جو کچھ دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں" تو اس آیت کریمہ کا مطلب محض انفاق مال ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں ہر قسم کی قوتیں اور طاقتیں آجاتی ہیں جانی، مالی، بدنی، تمام قوتوں کو اللہ تعالیٰ کے لئے وقف کر دینا اس میں داخل ہے اس کے لئے اقبال نے "خودی" کی تعبیر پیدا کی ہے۔

خودی کی پہلی منزل یہ مادی عالم ہے جہاں اس کی پرورش و تربیت کی جاتی ہے، دنیا میں انسان کے پیدا ہونے کا مقصد وحید یہی ہے کہ وہ اپنے خالق و خاطر کے منشا کے تحت سعیٔ تخلیق کرے اور اس کے لئے ان تمام فطری قوتوں اور صلاحیتوں سے کام لے جو اس کو ادائے "خلافت الٰہیہ" کے لئے عطا کی گئی ہیں اس زندگی کے بعد بھی "خودی" کی ایک منزل آتی ہے اگرچہ بیچ میں موت حائل ہے۔ جو مادی زندگی اور روحانی حیات کے درمیان صرف "وقفہ" سکون کا نام ہے لیکن اگر انسان نے اپنی مادی زندگی کو خودی سے مستحکم کر لیا تو اس کو روحانی زندگی میں کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا، یہی وجہ ہے کہ جس انسان کی خودی نا تربیت یافتہ ہوگی وہ موت کا صدمہ برداشت نہ کر سکے گا۔ پھر اس کے بعد جاودانی سرور اور سرمدی حیات سے محروم رہ جائے گا۔

خودی کے راستے میں مادیات اگرچہ سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوتی ہیں مگر اس کے حائل ہونے سے مردانہ وار مقابلہ کرنے کی قوتیں ابھرتی ہیں۔ اور مادیات کو اپنا خادم بنا لینے کا موقع مل جاتا ہے مادیات پر غالب آنے کے بعد زمانے پر بھی غلبہ حاصل کرنا ضروری ہے خود زمانہ پر غالب آ کر

اس کو مغلوب کرلیں اور زمانے کی رو جس طرف بہائے نہ بہہ جائیں بلکہ اس کی بجائے خود زمانے کے رخ کو موڑ دیں اور اس کے لئے پیہم کوششیں اور متواتر کاوشیں جاری رکھیں جب خودی کی حقیقت معلوم ہو چکی تو اب یہ بھی معلوم کرلینا چاہیئے کہ خودی کی تربیت، بقا و استحکام کس طرح حاصل ہو سکتے ہیں اس کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہے پہلی "اطاعت" یعنی "آئین فطرت" کی پابندی اور دستور الٰہی کی تابعداری اس آئین کی پابندی غلامی نہیں تمام دنیا کی غلامیوں سے نجاتِ کلی ہے دوسری بات "ضبط نفس" یعنی انسان کا نفس خود اس کے قبضہ میں رہے نہ کہ انسان اپنے نفس کے قبضہ میں چلا جائے کہ جدھر نفسانی خواہشات لے چلیں "شتر بے مہار بن" چلا جائے۔ اگر نفس پر قابو نہ پالیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نفس پر دوسروں کا غلبہ تسلط اور استیلا ہو جائے گا۔ اور اسی ضبط نفس کے لئے اسلامی ارکان نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج بہترین ذرائع ہیں۔ اور جب انسان ان کے ذریع[illegible] نفس حاصل کرلیتا ہے تو اس کا دل غیر اللہ کی غلامی سے آزاد ہو جاتا ہے اور غیر اللہ کی محبت سے نجات مل جاتی ہے نماز کیا ہے "صدف توحید" کا گوہر مومن کی معراج، اور قلبِ مومن کے لئے حجِ اصغر ہے مسلم کے ہاتھ میں ایک تیز خنجر کی طرح ہے جس سے بے حیائی اور بدکاری کا قلع قمع ہو جاتا ہے "روزہ" کیا ہے؟ بھوک اور پیاس کے لشکر کو شکست دیتا ہے تن پروری کے خیبر کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ زکوٰۃ مال کی محبت کو کم کرتی ہے مگر مال زیادہ کر دیتی ہے اور مساوات پیدا کر کے بنی نوع انسان کے ساتھ مواسات سکھاتی ہے حج کے باعث مسلم کو راہِ حق میں گھر بار چھوڑ کر نکل جانا آتا ہے، حج ہجرت آموز اور وطن سوزی کا سب سے بڑا سبب ہے۔

تیسری چیز نیابت و خلافت الٰہی ہے یعنی انسان اپنی خودی کی تربیت کرتے کرتے انسانیت کے مرتبہ کمال پر فائز ہو جاتا ہے تو اللہ کی زمین پر اللہ کا خلیفہ بن جاتا ہے، پھر اس کی علمی و عملی

قوت کے آگے تمام کائنات سربسجود ہوتی ہے اور نوامیس کائنات کی تسخیر سے کام لیتا ہے تمام دنیا میں خلیفۃ اللہ کے منصب پر کاربند رہ کر وہ خدا کی حاکمیت علی الاطلاق کا ڈنکہ بجا دیتا ہے چوں کہ اس مرتبہ پر پہنچ کر انسان کامل کو صرف اللہ ہی کی حکومت و حاکمیت کا بول بالا کرنا ہے اس لئے "صبغۃ اللہ" کے رنگ میں خود کو رنگ دینا چاہئے پھر دوسروں کو بھی اس رنگ میں رنگ دینے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس کے لئے جہاد کرنا پڑے گا۔ اگر جہاد کا مقصد اللہ کی حاکمیت و حکومت کے قیام کے علاوہ کسی غیر اللہ کی حاکمیت و حکومت کا قیام ہو تو یہ ایک بدترین فعل ہوگا۔

الحاصل خودی اور اس کی تربیت کے اسباب کی یہ مختصر سی کیفیت ہے اب "بے خودی" پر بھی ہم کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے ہم بتا چکے ہیں کہ خودی کا تعلق انفرادیت سے ہے اب بے خودی کو یوں سمجھ لیجئے کہ وہ "اجتماعیات" سے متعلق ہے یعنی فرد اپنی خودی کی تربیت کے بعد "جماعت" میں گم ہو جائے اور جب فرد کے اندر اس درجہ محویت و استغراق کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ جماعت کے لئے بالکل ظاہری و باطنی حیثیت سے "جماعتہ" ہی کے لئے مخصوص ہو جاتا ہے شخصی ہیئت کا اجتماعی ہیئت کے ساتھ وابستہ ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرد کی ذات بہت سی ایسی برائیوں سے محفوظ و مصئون ہو جاتی ہے جو انفرادی حالت میں اس سے دور نہ ہو سکتی تھیں، اور جب یہ ربط و ضبط کامل ہو جاتا ہے تو فرد اپنے وجود میں خود ایک جماعت کا سا حکم پیدا کر لیتا ہے اور ایک شخص واحد ہی وہ کام انجام دیتا ہے جو بڑی جماعت سے ہو سکتا ہے۔

جس طرح فرد کے لئے اپنی خودی کی تقویت کے واسطے چند چیزوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے اسی طرح جماعت کی تربیت ترقی، بقا اور استحکام کے لئے بھی اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ کوئی ایسی "شخصیت کبریٰ" موجود ہو جس کی وجہ سے مرکزیت پیدا ہو جائے اور جماعت کا

شیرازہ بکھرنے نہ پائے، یہ مرکزی شخصیت رسول و نبی کی ہوتی ہے، جس کی زندگی ایک زبردست عملی نمونہ اور بہترین اسوۂ ہوتی ہے۔ جو عقل و فہم کی زنگ آلودگیوں کو دور کرکے ان کو روشنی اور نورِ عشق سے دلوں کو باطنی امراض سے نجات دلاتی اور صفائی و تزکیہ سے ہم آغوش کردیتی ہے، جس کا انجام ایک آئین کی پابندی پر ہوتا ہے۔ اس آئین کے دو رکن ہیں، ایک توحید دوسرا رسالت توحید جماعت کی روح ہے جس کی وجہ سے دلوں میں یکسانی، دماغوں میں ہم آہنگی، جذبات میں وحدت پیدا ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام رذیل جذبات اور کینہ اور حسد، مایوسی، رنج، ڈر، کم ہمتی، کم تری اور سستی وغیرہ دور ہو جاتے ہیں اور عزائم میں بلندی، حوصلوں میں پختگی، خیالات میں برتری پیدا ہو جاتی ہے پھر توحید کی ضد شرک ہے جس کی وجہ سے تمام باطنی خرابیاں، روحانی بیماریاں پیدا ہونے لگتی ہیں بالآخر جماعت کی روح نکل جاتی ہے اور تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتّٰى (سورۂ حشر) کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا لازمی نتیجہ سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا۔ ظاہر ہو جاتا ہے۔

دوسرا رکن رسالت ہے، یہ وہ جلیل الشان منصب ہے جو کسی جلیل القدر انسان کو کسی اکتساب کے بغیر موہبت الٰہی کے طور پر عطا فرمایا جاتا ہے اور تمام فطری صلاحیتیں اپنی پوری پوری بلندیوں کے ساتھ اس انسان میں موجود ہوتی ہیں، اس منصب جلیل پر فائز ہو کر وہ عظیم المرتبت ہستی خدائے قدوس کے رسول اور پیغمبر کی حیثیت سے نوعِ انسانی کی ایسی عمدہ راہنمائی کرتی ہے جس سے انسانی دنیا غیر اللہ کی غلامی سے کامل آزاد ہو کر سچے خدا کی غلامی میں پابند ہو جاتی ہے یہ "غلامی" ہی حقیقت میں "حریت" ہے جس کے بعد صحیح اخوت، صالح مساوات، اور عمدہ ملکات پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر تمام انسانوں کی حیثیت ایک جماعت کی ہو جاتی ہے، یہ جلیل القدر منصب نبوت و رسالت رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکا۔ اب آپ کے بعد کوئی دوسرا رسول و نبی آنے والا نہیں البتہ "ملت محمدیہ" دنیا کی

قوموں اور ملتوں کے لئے اس رسول کے اسوہ پر چل کر نمونہ بن جائے گی، اور جس طرح رسول خاتم الرسل ہے اسی طرح امت محمدیہ خاتم الامم ہے اس کے بعد کوئی امت نہیں جو دنیا کی قوموں کی پیشوائی کے لائق ہو سکے اس جماعت کا کام قرآنی پیام یعنے آئین اور اسوۂ رسول پر کاربند ہوکر تمام قوموں پر شہادت دینا ہے کہ کون کون باطل پرستیوں میں مبتلا ہے اور کس طرح انسانیت کے شرف و امتیاز کو غیر اللہ کی پرستاری و عبودیت میں مٹا رہا ہے یہ "جماعت" جو درحقیقت شاہد علی الاقوام بن کر تمام قوموں سے چھانٹ کر بنائی گئی ہے بے زمانی اور بے مکانی ہوگی یعنی کوئی زماں و مکاں اس کی ترقیات کو محدود نہ کر سکیں گے مگر اس بے زمانیت و بے مکانیت کے باوجود وہ جس طرح زمان و مکاں میں ہوگی اس کو اپنے آئین کے مطابق ڈھال لے گی۔ ؎

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بگِل بھی ہے
انہیں پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کرلے
(بانگِ درا)

حاصل کلام یہ بے خودی کی حقیقت ہے کہ انفرادی تربیت و تکمیل کے بعد فرد صالح، جماعت صالحہ کا جزو بن جائے یہی چیز تفصیلی طور پر اسرار خودی اور رموز بے خودی میں علّامہ اقبال نے بتلائی ہے۔ اس حقیقت کو ذہن نشین کرلیا جائے تو اقبالیات کے فہم و ادراک میں کوئی دقت نہ ہوگی۔

اس قدر اقبال کی شخصیت اور ان کے اسلامی پیام کی نوعیت واضح کر دینے کے بعد اس کے اہم پہلو "قرآنیات" پر ہم کچھ عرض کریں گے۔

اقبال کا پیام جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے سراپا اسلام ہے اس لئے جس قدر زمانہ گذرتا گیا ان پر یہ رنگ زیادہ ہوتا گیا یہاں تک کہ اخیر زمانے میں "تدبر فی القرآن" ہی ایک مشغلہ رہ گیا تھا اور بالکل آخری عمر میں تو قرآن عزیز کی ایک نئی تفسیر انگریزی زبان میں لکھنے کا غایت درجہ کا شوق ہوگیا۔ مگر افسوس کہ یہ کارنامہ نہ ہو سکا۔ پھر بھی اقبال کے کلام سے تفسیر قرآن کے بے شمار نکات و معارف

مرتب کئے جاسکتے ہیں خاص طور پر اقبال سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ اقبال کا کلام قرآن سے الگ کرکے نہ پڑھیں بلکہ قرآنی علوم کے ساتھ پڑھتے جائیں اور محسوس کرتے جائیں کہ کس طرح انہوں نے حقائق قرآنی پیش کئے ہیں۔ چنانچہ اپنے متعلق اقبال کا کتنا اچھا فیصلہ ہے، یہی چیز اقبال پسندوں کی راہنما بن سکتی ہے۔ ؎

اگر تو سالکِ راہِ یقین ہے میرے اشعار میں ہیں کرنہ رہ جا
مری نظروں میں قرآن مبین ہے تری نظروں میں ہیں میری تصانیف
رہ قرآں میں گام اولیں ہے گذر جا تو مری بزم سخن سے
تو حاصل دولت دنیا و دیں ہے جو تو اس طرح قرآں تک پہنچ جائے
نظر کی آخری منزل ہے قرآن محیطِ کائنات دل ہے قرآن

ایک اور جگہ قرآن کے فہم کے تدبر کا کتنا اچھا معیار پیش کیا ہے۔

گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب

جب قرآن کے مقاصد کے لئے شرح صدر نہ ہو جائے محض امام رازی کی تفسیر مفاتیح الغیب کھول کر پڑھتے رہنا یا علامہ جار اللہ زمخشری کی تفسیر کشاف کی ورق گردانی کچھ کام نہیں دے سکتی چنانچہ آج ہم دیکھ رہے ہیں بہت سے لوگ محض کتابوں کے شغل میں لگے رہتے ہیں اور تفسیر قرآن کا وہ ذخیرہ جو ایک خاص ماحول یا خاص زمانے کی پیداوار ہے، ضروری سمجھ بیٹھے ہیں۔ حالانکہ قرآنی تعلیمات کو قال کے بجائے حال بنانے کی سخت ضرورت ہے دیکھئے تمام تفسیری ذخیرہ دیکھئے، متقدمین و متاخرین تمام کی تفسیریں دیکھئے مگر اس کو نہ بھول جائیے کہ یہ کائنات اور اس کی آفاقی و انفسی نشانیاں خود کتاب اللہ کی تفسیر کر رہی ہیں مگر ضرورت ہے کہ اس کو اس ذوق و وجدان کے ذریعہ سمجھا جائے جو سوز و گداز اور روح کی بے تابی سے پیدا ہوتا ہے، اور قرآن عزیز کو پڑھ کر ضرورت ہے کہ

اپنے حالات پر چسپاں کیا جائے اور اسی کی روشنی میں اپنی اصلاح کی جائے اور غور کیا جائے کہ "انتم الاعلون"
کا وعدہ کس شرط کے ساتھ مشروط ہے، اس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے ؎

اندکے گم شو بہ قرآں و خبر　　　　باز اے ناداں بخویش اندر نگر

در زماں آوارۂ بے چارۂ　　　　راہ حق گم کردۂ آوارۂ

غرض دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک قرآن و خبر یعنی حدیث میں گم ہو جائیں پھر ان دونوں سے
حاصل ہونے والے نور بصیرت سے اپنی حالت کا موازنہ کریں، اور ان اسباب و علل تک پہنچ جائیں جن کی وجہ سے
ہمیں ذلت، و نکبت، بے حیائی، بے چارگی اور آوارگی پیدا ہو گئی ہے۔ ایک مقام پر معانی قرآن کے متعلق
فرماتے ہیں کہ ہمارا ضمیر خود اس کی تفسیر مجسم ہے اور "اعتبار فی القرآن" کے لحاظ سے کہتے ہیں کہ ہمارے اندر ایک
"آتش نمرود" ہے۔ دوسرا "دل" ہے جو خلیل ہے "دل" اگر آتش نمرود سے جل نہ جائے تو سمجھو کہ مقام خلت" پر فائز ہو
چکا ہے اس حقیقت کی ترجمانی حضرات صوفیائے کرام کی بھی فرماتے ہیں۔ ؎

ز رازی معنیٔ قرآن چہ پرسی　　　　ضمیر ما بہ آیاتش دلیل است

خرد آتش فروزد دل بسوزد　　　　ہمیں تفسیر نمرود و خلیل است

غرض یہ ہے کہ علامہ نے عجیب دلچسپ اور عمدہ انداز میں قرآن حکیم کے اسرار فاش کئے ہیں اور
"اعتبارات" کے وہ لطائف پیش کئے جن کو پڑھ کر روح میں بالیدگی اور ذہن میں تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔
اس قدر عرض کرنے کا مقصد یہی تھا کہ "قرآنی حقائق" میں ترجمانی اقبال نے کی ہے آپ اس کا اس مقصد
کے علاوہ دوسرے نقطۂ نظر سے نہ دیکھئے۔ ؎

من اے میر امم داد از تو خواہم　　　　مرا یاراں غزل خوانے شمردند

اس مختصر سی گذارش کا حاصل یہ تھا کہ محض "غزل خوانی" کی حد تک اس ترجمان حقیقت کو
نہ محدود نہ سمجھئے وہ تو فطرت کے رازہائے سربستہ کو کھولنے والا ہے۔

اقوالِ زرّیں

اقوال حضرت ابوبکرؓ

(جناب شیخ عبدالمالک صاحب کرنال شاپ لاہور)

(۱) عبادت۔ ایک پیشہ ہے، دوکان اُس کی خلوت ہے راس المال اُس کا تقویٰ ہے اور نفع اُس کی جنت۔

(۲) گناہ سے توبہ کرنا واجب ہے مگر گناہ سے بچنا واجب تر ہے۔

(۳) زبان کو شکوہ سے روک خوشی کی زندگانی عطا ہو گی۔

(۴) جہادِ کفار جہادِ اصغر ہے اور جہادِ نفس جہادِ اکبر۔

(۵) خوفِ الٰہی بقدر علم ہوتا ہے اور خدا سے بے خوفی بقدر جہالت۔

(۶) خلقت سے تکلیف دور کر کے خود تکلیف اٹھا لینا حقیقی سخاوت ہے

(۷) اخلاص یہ ہے کہ اعمال کا عوض نہ چاہے۔ دنیا کو آخرت کے لئے اور آخرت کو اللہ کے لئے چھوڑ دے۔

(۸) وہ علماء حق تعالیٰ کے دشمن ہیں جو امراء کے پاس جائیں اور وہ امراء حق تعالیٰ کے دوست ہیں جو علماء کے پاس جائیں۔

(۹) بڑی عقلمندی تقویٰ ہے اور بڑی حماقت فجور سب سے بڑا صدق امانتداری ہے اور سب سے بڑا کذب خیانت ہے۔

(۱۰) شریف جب علم پڑھتا ہے متواضع ہو جاتا ہے اور ذلیل خصلت جب پڑھتا ہے تو متکبر ہو جاتا ہے۔

(۱۱) بُزدل کی ہم نشینی سے تنہائی بدرجہا بہتر ہے۔ اور تنہائی سے صحبت علماء بدرجہا بہتر ہے۔

(۱۲) جس پر نصیحت اثر نہ کرے وہ جانے کہ میرا دل ایمان سے خالی ہے۔

(۱۳) آنکھ کا کاسہ دل کا دروازہ ہے کہ قلب کی تمام آفتیں اسی راستہ سے آتی ہیں۔ اور شہوت و لذات پیدا ہوتی ہیں۔ آنکھ بند کر لے تمام آفتوں سے محفوظ ہو جائے گا۔

اقوالِ یحییٰ برمکیؒ

(جناب شیخ عبدالمالک صاحب کرنال شاپ لاہور)

(۱) میں نے ایسا کوئی شخص نہیں دیکھا ہے کہ گفتگو کرنے سے پہلے جس کی ہیبت مجھ پر چھا گئی ہو البتہ اگر وہ شخص فصیح ہے تو میرے دل میں اُس کی عظمت ہوتی ہے ورنہ وہ میری نظروں سے گر جاتا ہے۔

(۲) جو لوگ دولتِ دُنیا کے طالب ہیں اگر وہ زمانہ کی سختیاں نہ اٹھا سکیں تو پھر اپنے مقصد میں ناکامیاب ہونے کی شکایت نہ کریں۔

(۳) عمر کے کسی حصّے میں بھی عورت کو اس کی مرضی پر نہ چھوڑنا چاہیئے۔

(۴) دو شخصوں کو کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں غرق کر دینا چاہیئے ایک تو ایسے دولت مند کو جو اپنی دولت میں مستحق لوگوں کو شریک نہ کرے۔ دوسرے ایسے مفلس کو جو باوجود افلاس کے خدا کی عبادت نہ کرے

(۵) راستی سے نیکی کی۔ مطالعے سے علم کی۔ نیک روی سے حُسن کی۔ نیک طریق سے خاندانی کی ناپ تول سے غلّہ کی۔ پھیرنے سے گھوڑے کی غور و پرداخت سے جانوروں کی اور سادہ لباس سے عورت کی عصمت کی حفاظت ہوتی ہے۔

(۶) قوانینِ قدرت سے انحراف کرنے والا سزا سے کبھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔

(۷) نفسانی خواہشوں کو ترقی دینے والا ہرگز کسی قسم کی ترقی کا بوجھ اپنے کندھوں پر نہیں اُٹھا سکتا۔

(۸) چھ شخص محسنوں کے احسان کی وقعت اور پرواہ نہیں کرتے:۔

(۱) فارغ التحصیل شاگرد اپنے استاد کی۔ (۲) اہل وعیال والی اولاد اپنی ماں کی (۳) خواہشاتِ نفسانی سے سیر آدمی عورت کی۔ (۴) اہل غرض ایسے شخص کی جس سے غرض حاصل ہو گئی ہو۔ (۵) طوفان سے بچا ہوا آدمی کشتی کا۔ (۶) صحت کے بعد مریض طبیب کا۔

اقوال حضرت عثمان

(از جناب شیخ عبدالمالک صاحب کرنال شاب لاہور)

(۱) جو لوگ خدا سے صدق اور خلوص کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں وہ اُس کے ماسوا سے ہر حالت میں نفرت کرتے ہیں۔

(۲) بدگو تین آدمیوں کو مجروح کرتا ہے اول اپنے آپ کو۔ دوم جس کی بُرائی کرتا ہے۔ سوم جو اُس کی بُرائی کو سنتا ہے۔

(۳) جو اپنی جوتی آپ گانٹھ لیتا ہے۔ غلام کی عیادت کرتا ہے اپنے کپڑے دھو لیتا اور اُن میں پیوند لگا لیتا ہے وہ غرور اور تکبر سے پاک اور بری ہے۔

(۴) تلوار کا زخم جسم پر ہوتا ہے اور بُری گفتار کا روح پر۔

(۵) مسلمان کی ذلتِ اپنے مذہب سے غافل بن جانے میں ہے نہ کہ بے زر ہونے سے۔

(۶) تو کتنا ہی مفلوک الحال ہو لیکن مغلوب الحال نہ ہو۔

(۷) جب زبان اصلاح پذیر ہو جاتی ہے قلب بھی صالح ہو جاتا ہے۔

(۸) گناہ کسی نہ کسی صورت سے دل کو بے قرار رکھتا ہے۔

(۹) سخاوت پھل ہے مال کا۔ اعمال پھل ہیں علم کا۔ خوشنودی خدا پھل ہے اخلاص کا۔

(۱۰) اُس نے خُدا کا حق نہیں جانا جس نے لوگوں کا حق نہیں پہچانا۔

(۱۱) جو شخص التجائے نگاہ کو نہیں سمجھ سکتا اُس کے سامنے اپنی زبان کو شرمندہ نہ کر۔

اعلان

حضرت علامہ اقبال مرحوم و مغفور کے اردو شاہکار "ضرب کلیم" کا تازہ ایڈیشن چھپ کر آگیا ہے جو حضرات منگوانا چاہیں وہ براہ کرم مطلع فرما دیں۔
قیمت بے جلد ۲ مجلد ۲/۸ علاوہ محصول ڈاک

پبلک کی سہولت اور آسانی کی خاطر اقبال اکیڈیمی کا دفتر ریلوے روڈ پر اسلامیہ کالج کے بالمقابل منتقل کر دیا گیا ہے۔ اقبال اکیڈیمی اور مکتبۂ پیغام حق کی تمام مطبوعات آپ کو یہاں سے مل سکیں گی۔ علاوہ ازیں اسلامی کتب خانہ کے نام سے ایک کتب خانہ کی بنا رکھدی گئی ہے۔ جہاں سے آپ کو ہندوستان بھر کے اداروں اور دوکانوں کی مطبوعات مل سکیں گی۔ آپ جب چاہیں تشریف لائیں اور جب چاہیں اپنی فرمائشیں بھیجدیں۔ نہایت توجہ اور اہتمام سے تعمیل ارشاد کی جائے گی۔

مینجر اقبال اکیڈیمی و اسلامی کتب خانہ

۶۷۔ ریلوے روڈ۔ بالمقابل اسلامیہ کالج لاہور

ماہنامہ

پیغامِ حق

ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے افکار، عقائد اور پیغام کا علمبردار

مرتبہ

غلام سرور فگار

سالانہ قیمت

عوام سے تین روپے — رؤسا سے پانچ روپے

فہرست مضامین

جلد ۵	جولائی ۱۹۴۱ء	عدد ۱

سید محمد شاہ ایم۔ اے پرنٹر پبلشر کے اہتمام سے دین محمدی الیکٹرک پریس لاہور میں طبع ہو کر دفتر رسالہ "پیغام حق" ظفر منزل تاج پورہ لاہور سے شائع ہوا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخنہائے گفتنی

آج جبکہ ہندوستان میں عظیم الشان سیاسی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں میں آپ حضرات سے درخواست کرتا ہوں کہ موجودہ حالات کی نزاکت کو دیکھیں اور اُن بڑی بڑی مشکلات پر غور کریں جو مسلمانوں کے سامنے ہیں۔ آپ محسوس کر رہے ہوں گے کہ اسلامی جماعت کی تشکیلِ نو کے سلسلے میں ہم نے بڑی تشویش و اضطراب کے بعض موقعے دیکھے ہیں اور ہمارے مفکرین ہمیشہ یہ خیال کرتے رہے ہیں کہ ہمیں ایک مثبت قومی پروگرام کی سخت ضرورت ہے۔ ایک دیرپا پروگرام وضع کرنے کے لئے بہت سی کوششیں عرصہ سے جاری ہیں اور کسی حد تک ہمیں اس میں کامیابی بھی نصیب ہوئی ہے مگر یہ کوئی قابلِ ذکر کامیابی نہیں اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ مسلمان عوام میں ابھی تک بیداری عام نہیں ہوئی اور جماعتِ اسلامی کی تشکیل نو کی کوئی تجویز خواہ وہ بذاتِ خود کتنی ہی جاذبِ توجہ کیوں نہ ہو اُس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک اُسے عوام کی ہمدردی حاصل نہ ہو۔

اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ عوام کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے اخبار سے بڑھ کر کوئی طاقت نہیں ہے اور بدقسمتی سے مسلمانوں کے پاس عرصۂ دراز سے کوئی اخبار نہیں ہے۔ ہماری اس شکائت پر آپ تعجب نہ کریں یہ تو آپ کو بخوبی معلوم ہے کہ اس زمانہ میں اگر کوئی اخبار صحیح طور پر اپنے فرائض بجا لا سکتا ہے اور عوام کی ذہنیت میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے تو وہ ایک انگریزی

اخبار ہی ہو سکتا ہے۔ ہندوؤں نے اس ملک میں جس قدر سیاسی علو حاصل کیا ہے وہ تمام کا تمام انگریزی اخبارات ہی کی بدولت ہے۔ اُن کے پاس ایک نہیں، دو نہیں، بیسیوں اعلےٰ درجے اور بلند پائے کے انگریزی اخبارات ہیں۔ ایسے اخبارات جو اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے کسی دوسرے کے محتاج نہیں اور نہایت اطمینان سے چل رہے ہیں مگر کیا آپ کے پاس پورے ہندوستان میں کوئی ایک بھی انگریزی اخبار ہے جو ہندوستانی مسلمانوں کی رہنمائی کر سکے اور قوم کا وقار دوسروں کے دل میں بٹھا سکے؟ اگر کوئی ایسا اخبار آپ کے پاس ہے تو خدارا ہمیں بھی اُس کا پتہ دیجئے۔ باقی رہے اردو اخبارات۔ بے شک اردو کے دو چار اخبار ضرور ہیں مگر نہ ہونے کے برابر۔ کسی پر عوام کو اعتماد نہیں ان میں سے کوئی اخبار عوام کی رہنمائی کا دعوےٰ نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی زندگی کے لئے دوسروں کے محتاج ہیں اور جن کے محتاج ہیں اُن کے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں۔ اُن کے اور اُن کے ممولوں کے ذاتی مصالح اور مفاد انہیں قوم کی خدمت نہیں کرنے دیتے۔ خدمت کا کیا ذکر، قوم کی گردن پر وہ الٹی چھری پھیر رہے ہیں ان حالات و شواہد سے ہمارے اکثر مفکر اور زعماء واقف ہیں مگر بد قسمتی سے اب تک اس سلسلے میں کچھ نہیں ہو سکا۔

خدا کا شکر ہے کہ ان حالات سے متاثر ہو کر چند ایک حساس مسلمانوں نے ایک ادارہ کی بنیاد ڈالی ہے اور ایک انگریزی اخبار کے اجراء کا اہتمام کیا ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ اخبار روزانہ نکالا جائے مگر سر دست ہفتہ وار نکالا گیا ہے اس خیال سے کہ اگر عوام ایسے اخبار کو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار ہوں تو اتنی جوکھوں کو سر بھی لیا جائے ورنہ اس گرانی کے زمانہ میں عوام کی ہمدردی کے بغیر اخبار کا نکالنا مصائب کی دلدل میں پھنسنا ہے۔

اس انگریزی ہفتہ وار اخبار کا نام "مسلم ہیرلڈ" ہے اس کا پہلا پرچہ ۴ر جولائی کو نکلا ہے ہمیں اس ادارہ اور اس پرچہ سے بڑی توقعات ہیں۔ ہمارے خیال میں اگر قوم نے کچھ تھوڑے

سے ایثار سے کام لیا تو یہ پرچہ بہت جلد اُن کی صحیح اور ٹھوس خدمت کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ کیونکہ مالکانِ اخبار سے لے کر کارکنوں تک سب مخلص اور حساس مسلمانوں کی ایک جماعت ہے۔

اخبار کو دیکھ کر بعض حضرات یہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ قیمت قدرے زیادہ ہے۔ مگر ان کو معلوم نہیں کہ اِس وقت گرانی کا کیا عالم ہے۔ وہ کاغذ جو پہلے دو روپے دس آنے رم آیا کرتا تھا۔ آج سات روپے آٹھ آنے رم آتا ہے۔ اور کاغذ ہی کا سب سے زیادہ خرچ ہوتا ہے۔ چھپائی کے اخراجات بھی بڑھ گئے ہیں۔ سر دست اخبار کو اشتہارات کی آمدنی بھی نہیں اور نہ کچھ عرصہ کے لئے ہوگی۔ اِن حالات کے ماتحت قیمت جو کچھ رکھی گئی ہے۔ بالکل واجب معلوم ہوتی ہے۔ چھ روپے سالانہ ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار کے لئے کچھ زیادہ نہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی بھی اخبار کے ساتھ تعاون کریں گے۔ ہمارے لئے یہ خبر نہایت اطمینان و مسرت کا باعث ہے۔ کیونکہ سید صاحب موصوف کے خیالات اب تک صرف اردو خواں حضرات تک پہنچے ہیں۔ انگریزی دان حضرات کے لئے اُن کے قابل قدر اور لائق عمل ارشادات نہیں پہنچ سکے۔ ہمارے علم و یقین میں حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ہندوستان بھر میں واحد اسلامی مفکر ہیں جن کے پورے استدلال و منطق کی اساس قرآنِ پاک اور پورا نظامِ اسلامی ہے ضرورت ہے کہ سید صاحب کی آواز مسلمانوں کے تمام طبقوں میں پہنچے۔

مسٹر عبداللہ انور بیگ ایم اے ایل ایل بی وکیل ہائی کورٹ جو متعدد علمی کتابوں کے مصنف ہیں مسلم ہیرالڈ کو اُن کی ہمدردی بھی حاصل ہے اور وہ پوری توجہ سے اخبار کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں

مسلم ہیرالڈ کی پالیسی یہ ہوگی کہ وہ اُن کی توجہ قرونِ اولیٰ کے اسلام کی طرف منعطف کرائے گا۔ اور مسلمانوں کے تمام طبقوں کو دعوتِ اسلام دے کر تحریکِ اسلام کے سرگرم کارکن بنانے کی کوشش

کرے گا۔ وہ مسلمانوں کی تشکیلِ نو کے لیئے انتہائی جدوجہد کرے گا اور اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ پوری کوشش کرے گا کہ مسلمانوں کے اندر ذہنی انقلاب پیدا کرے، وہ بتلائے گا کہ مسلمانوں کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتے ہو تو تحریکِ اسلامی کو زندہ کرو۔ اُس کی زندگی تمہاری زندگی ہے اور اگر تم تحریکِ اسلامی کے دائرے سے باہر نکل کر اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے ہو تو ایک دنیا کو دھوکہ دے رہے ہو۔ خود اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو اور اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مار رہے ہو کیونکہ تمہاری حیثیت ایک باغی کی ہے نہ کہ ایک وفادار متبع تحریک کی ایک وفادار متبع تحریک کو اسلام کی اصطلاح میں مومن کہتے ہیں اور باغی کو منافق یا مرتد۔ منافق ہونے کی حیثیت میں فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ اُس کا مقام ہے اور مرتد ہونے کی صورت میں وہ گردن زدنی ہے۔

علاوہ ازیں مسلم ہیرلڈ دنیا کے حالات و کوائف کو نظرِ غائر سے دیکھے گا اور اسلام اور مسلمانوں سے جو باتیں تعلق رکھتی ہیں اُن کو قوم کے سامنے وقتاً فوقتاً پیش کرتا رہے گا اور اِس سلسلے میں اُسے قوم کو جو مشورے دینے ہوں گے وہ نہایت دیانت داری سے دے گا اور قوم کی آواز کو جہاں تک پہنچانا ہوگا وہاں تک پہنچانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھے گا۔ اور حق و صداقت کا ساتھ کبھی نہ چھوڑے گا۔ ہم انتہائی خوشی اور مسرت کے ساتھ مسلم ہیرلڈ کا خیر مقدم کرتے ہیں اور ہر انگریزی خواں مسلمان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس پرچے کو خریدے اور اپنے دوستوں کو اس کی خریداری کی طرف متوجہ کرے۔

اقبالیاتِ وفاؔ

(جناب ابن ندیم وفاؔ)

قلندر کر نہیں سکتا ہے تقریر — مگر یہ نکتہ ہے اس کا اکسیر
"ہری ہوتی نہیں کھیتی ہماری — دیا جائے نہ جب تک خونِ شبیر"

مرے غم کو نشاط آمیز کر دے — فغانِ دل کو نغمہ خیز کر دے
چڑھے وہ نشہ جو اترے نہ ہرگز — ذرا صہبا کو ساقی! تیز کر دے

نہیں سوز و تپش تیری فغاں میں — کہ تو بے نور ہے اس خاکداں میں
کچھ اپنے دل میں پیدا کر تڑپ بھی — کہ نہیں تاثیر تیری داستاں میں!

مسلماں! دل میں پیدا کر یقیں کو — الگ ہرگز نہ کر دنیا و دیں کو
جدا ہو جائیں گے گر دین و دنیا — نہ پائے گا بشر "نورِ مبیں" کو

عالم کے ذرّے ذرّے میں پنہاں وہی تو ہے — سبزہ ہے اور گل ہے، گلستاں وہی تو ہے
نیرنگیوں میں عالمِ تکویں کے اے وفاؔ! — دیکھا بغور ہم نے نمایاں وہی تو ہے

دیکھو اسے غنچوں کی چٹک میں دیکھو — شاخوں کی لچک، گل کی مہک میں دیکھو
کون آتا ہے گلشن میں خراماں یہ وفاؔ! — اس آنکھ سے سبزے کی لہک میں دیکھو

کس طرح اس نے وفاؔ! مجھ پہ کرم عام کیا — بادہ آشام کیا، معتقدِ جام کیا
ساقیٔ مست نے صہبائے طرب دے دے کر — ایک دن پیکرِ تقویٰ کو بھی تو رام کیا

سکون اور جنون

(از جناب میرزا عزیز فیضانی)

کون بہتر ہے بتا اے دل! سکوں — یا پُر از بیتابی و شورشِ جنوں؟

اک طرف ہے ترکِ دنیا کا فسوں — اک طرف معبود ہے دنیائے دوں

دونوں حلقے کر رہے ہیں اپنا کام — ان کے حملوں سے ہے دیں زار و زبوں

پیر الگ، مُلّا الگ، لیڈر الگ — سوچتا رہتا ہوں کس کس کی سنوں

کوئی کچھ کہتا ہے مجھ کو کوئی کچھ — محوِ حیرت ہوں کہے کس کے لگوں

خود اگر مُلّا نہ سمجھے کیا ہے دیں — کیا کروں اِس پر میں رو دوں یا ہنسوں

کچھ نہ کر صوفی مگر یہ تو بتا — ہاتھ میں کس کے میں اپنا ہاتھ دوں

یا ڈروں اُس سے نہیں کچھ ڈر جسے — یا ہزاروں ڈرنے والوں سے ڈروں؟

مکتبِ دینی میں یاس و خامشی — دنیوی مکتب میں الحاد و فسوں

اب بتا اے علم کی سچی تلاش — ایسی حالت میں کہاں اور کیا پڑھوں

امنِ عالم کی الٰہی خیر ہو — بحر و بر سے آ رہی ہے بوئے خوں

بخت کا کیا، خفتہ یا بیدار ہو — خود اگر میں بے خبر سویا رہوں

ہو کے رہتا ہے جو ہونا ہو عزیز
دل میں پھر میں کیا رکھوں اور کیوں رکھوں

اقوال حضرت امام غزالی رح

(جناب عبدالمالک صاحب کرنال شاپ لاہور)

(۱) تکلف کی زیادتی محبت کی کمی کا باعث بن جاتی ہے۔

(۲) غریب مہمان آجائے تو قرض لے کر بھی تکلف کر۔

(۳) جس مجلس میں جا کر خلافِ شرع امور معلوم ہوں اور منع نہ کر سکتا ہو تو وہاں سے چلے آنا واجب ہے۔

(۴) مجلس کے اندر بیٹھ کر قریب ترین لوگوں کی مزاج پرسی کر۔

(۵) تنگ دست قرضدار کو مہلت دینا رحمت الٰہی کو جوش میں لاتا ہے۔

(۶) قرض ادا کرنے کی مقدور رہتے ہوئے ایک ساعت دیر کرنا بھی ظلم میں داخل ہے مگر اجازتِ قرضخواہ قرض بغیر تقاضا کے ادا کر دینا قرضدار کی طرف سے احسان ہے۔

(۷) ظالم کے مرنے سے ملول ہونا ظلم میں شامل ہے۔

(۸) جو شخص حرام کھاتا ہے اُس کے تمام اعضا گناہ میں پڑ جاتے ہیں۔

(۹) اگر تو اِس قدر نماز پڑھے کہ پشت خم ہو جائے اور اس قدر روزے رکھے کہ بدن ہلال بن جائے ہرگز فائدہ نہ پائے گا۔ تاوقتیکہ مال حرام سے پرہیز نہ کرے گا۔......

(۱۰) محتاجوں سے مہنگا مال خریدنا احسان میں داخل ہے اور صدقہ سے بہتر ہے۔

اسرارِ خودی

شرح اسرارِ اسمائے علی مرتضےٰ رضؓ

(۱۰)

خودی کی تربیت کے مراحلِ سہ گانہ اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی کی وضاحت کے بعد اقبالؒ کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ مثال کے طور پر کسی ایسی شخصیت کو پیش کریں جو ان صفات کی آئینہ دار ہو اور جس نے اپنے عمل سے دنیا کو مسخر کیا ہو چنانچہ حضرت علی رضؓ کو وہ مثالی حکم کے طور پر پیش کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اُن کے وجودِ بابرکات میں یہ صفات کس طرح گھُل مِل گئی تھیں اور ان کی بنا پر اُنہیں دنیا میں کتنا بڑا درجہ ملا۔

مسلمِ اوّل شہِ مرداں علی رضؓ عشق را سرمایۂ ایماں علیؓ

اس میں اختلاف ہے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے بعد مردوں میں سے سب سے پہلے کون ایمان لایا۔ بعض روایات سے حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی اولیت ظاہر ہوتی ہے اور بعض سے حضرت علی رضؓ کی اور بعض کے نزدیک حضرت زید بن حارثؓ کا ایمان سب پر مقدم ہے۔ اِن تمام روایات کے پیشِ نظر اربابِ تحقیق نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اُم المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ عورتوں میں، حضرت ابوبکر صدیق رضؓ بڑی عمر کے مردوں میں حضرت زید بن حارث رضؓ غلاموں میں اور حضرت علیؓ بچوں میں سب سے پہلے ایمان لائے یعنی حضرت علی رضؓ کی عمر دس سال تھی۔ جب وہ جمالِ نبوی کی شمع کے پروانے بنے لیکن اقبال رحؒ کے نزدیک اس کے علاوہ اولیت کی جو سب سے بڑی وجہ ہے وہ عشق کا معیار ہے جس پر حضرت علی رضؓ

عمر بھر قائم رہے اور زندگی کے ہر مرحلے میں انہوں نے اپنے آپ کو عشق میں ثابت قدم رکھا اس قسم کی سینکڑوں مثالیں اُن کی زندگی سے مل سکتی ہیں جن میں عشق کا جذبہ بے پناہ جلوہ ریزیاں کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ابھی اُن کی عمر بیس بائیس سال تھی کہ ایک رات مشرکین مکہ نے یہ فیصلہ کیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مکان کے اندر ہی قتل کر دیا جائے۔ یہ حضرت علیؓ ہی تھے جو آنحضرت صلعم کی بجائے اُن کے پلنگ پر رات بھر لیٹے رہے اور مشرکین نے انتظار میں کھڑے کھڑے صبح کر دی اور جب وہ مکان کے اندر داخل ہوئے تو انہیں اس کا سخت افسوس ہوا کہ حضرت محمد صلعم بچ کر نکل گئے۔ مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت بھی آنحضرت صلعم کے ساتھ حضرت علیؓ اینٹ اور گارا اپنے کندھوں پر اُٹھا کر لاتے تھے، غزواتِ خندق، خیبر، ہوازن، بدر، حنین وغیرہ میں بھی حضرت علیؓ نے عشق و ایمان کے جن سرفروشانہ مجاہدوں کا عملی اظہار کیا تاریخ اسلامی میں اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ حضرت علیؓ کی خوش قسمتی اس سے بڑھکر کیا ہو سکتی ہے کہ انہیں اس کا سب سے زیادہ موقعہ ملا کہ وہ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر و حضر میں رہے اور اظہار عشق و محبت کیا۔ یہی وہ جاں نثاری ہے جس کی بنا پر صحیح معنوں میں اُنہیں مسلم اول کہا جا سکتا ہے۔

از ولائے دودمانش زندہ ام	در جہاں مثلِ گہر تابندہ ام
نرگسم وارفتۂ نظارہ ام	در خیابانش چو بُو آوارہ ام
زمزم ار جوشد ز خاکِ من ازوست	مے اگر ریزد ز تاکِ من ازوست
خاکم و از مہرِ اُو آئینہ ام	می تواں دیدن نوا در سینہ ام

ان چار اشعار میں اقبالؒ نے اُن محبت آمیز اور عقیدتمندانہ جذبات کا اظہار کیا ہے جو اُن کے دل میں خاندانِ سادات سے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اس امر کا ثبوت جابجا اُن کے کلام میں ملتا ہے چنانچہ اپنے استاذِ مکرم شمس العلماء مولوی سید میر حسنؒ کے متعلق اپنی نظم "التجائے مسافر"

میں اقبالؒ نے اس روحانی فیض کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے یہ نظم اقبالؒ نے یورپ جانے سے قبل لکھی تھی اور حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء کے حضور میں پیش کی تھی ؎

وہ شمعِ بارگہہ خاندانِ مصطفوی ۔۔۔ رہے گا مثلِ حرم جس کا آستاں مجھ کو

نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی ۔۔۔ بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو

دعا یہ ہے کہ خداوندِ آسمان و زمیں ۔۔۔ کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

اقبالؒ اپنے جملہ تحصیل کمالِ علم و معرفت کو حضرت علیؓ کے خاندان کے فیضان صحبت واثر کا مرہونِ منت قرار دیتے ہیں اور اس کا اعتراف برملا کرتے ہیں۔

قوتِ دینِ مبین فرمودہ اش ۔۔۔ کائنات آئین پذیر از دودہ اش

اقبالؒ کے نزدیک حضرت علیؓ کا فرمان اسلام کے جسم میں ایک نئی روح پھونکنے کی زبردست قوت ہے اور اُن کا خاندان دنیا میں خدا کے احکامات کی نشر و اشاعت کا واحد ذریعہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبالؒ کی نظروں سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ حضرت علیؓ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دامنِ تربیت میں تیس سال تک تربیت پائی تھی اور بچپن ہی سے سفر و حضر میں آنحضرت صلعم کے ہمراہ رہے تھے اس لئے اُن کو احکام و فرائض اور ارشاداتِ نبوی کا خزانہ سمجھا جاتا تھا نیز وحی الٰہی کے کاتبوں میں بھی اُن کا اسم گرامی ہے اور رسول اکرم کی جانب سے جو فرامین اطراف و جوانب میں لکھے جاتے تھے اُن میں سے زیادہ تر حضرت علیؓ کے دستِ مبارک ہی کے ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید کے اسرار و غوائض سے بھی وہ سب سے زیادہ واقف تھے کیونکہ حضرت محمد صلعم کی زندگی ہی میں نہ صرف انہوں نے پورا کلام مجید حفظ کر لیا تھا بلکہ ایک ایک آیت کی شانِ نزول اور اس کے معنی سے بھی کما حقہٗ بہرہ ور تھے۔ ابن سعد میں ہے کہ ایک موقعہ پر خود حضرت علیؓ نے علانیہ فرمایا کہ میں ہر آیت کے متعلق بتا سکتا ہوں کہ یہ کہاں اور کیوں اور کس

کے حق میں نازل ہوئے۔ قرآنِ پاک سے اجتہاد اور مسائل کے استنباط میں اُنہیں ید طولیٰ حاصل تھا چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ اپنے اپنے عہدِ خلافت میں مسائل مبہمہ کے حل کے لئے آپؓ کی جانب رجوع کیا کرتے تھے شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی نے اپنی تصنیف ازالۃ الخفاء میں حضرت علیؓ کے فیصلوں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے سامنے ایک مجنون زانیہ لائی گئی اور حضرت عمرؓ نے اس پر شرع کی حد جاری کردی حضرت علیؓ سے استصواب کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ یہ ممکن نہیں کیونکہ مجنون حدودِ شرعی سے مستثنیٰ ہے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے اپنے فیصلے کو منسوخ کردیا۔ اسی طرح ایک دفعہ حج کے موسم میں حضرت عثمانؓ کے سامنے کسی نے شکار کا گوشت پکا کر پیش کیا۔ لوگوں نے بحالتِ احرام اس کے کھانے کے جواز اور عدم جواز میں اختلاف کیا۔ حضرت عمرؓ اس کے جواز کے قائل تھے اور دلیل یہ دیتے تھے کہ بحالتِ احرام خود شکار کرکے کھانا منع ہے لیکن جب کسی دوسرے غیر محرم نے شکار کیا ہو تو احرام کی حالت میں ہمیں اس کے کھانے میں کوئی ہرج نہیں اور لوگوں نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا۔ آخر کار حضرت عثمانؓ نے استصواب کیا کہ اس معاملہ میں قطعی فیصلہ کس سے معلوم ہوگا لوگوں نے کہا حضرت علیؓ سے چنانچہ حضرت عثمانؓ خود حضرت علیؓ کے پاس گئے اور انہوں نے یہ فیصلہ دیا کہ رسول اکرم صلعم نے احرام کی حالت میں ایسا شکار کھانے سے دو مرتبہ پرہیز کیا۔ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے اقضانا علیؓ اقرانا ابیؓ یعنی مقدمات کے فیصلے کے لئے حضرت علیؓ ہم سب میں سے موزون ہیں اور حضرت ابیؓ سب سے بڑے قاری ہیں۔

حضرت علیؓ کو جید محدث مانا جاتا۔ اور آپ کی اصابتِ رائے، ذکاوتِ فہم استعدادِ علمی اور فضل و کمال کے رسول اکرم صلعم بذاتِ خود معترف تھے جس شخص کا درجۂ کمال یہ ہو اس کے ارشادات اسلام کے لئے قوت کا باعث کیوں نہ ہوں۔ یہ ہے اُن کے خاندانی احسانات جن کے بارے

دنیا کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی اس کا اندازہ اُن بزرگوں، اماموں، عارفوں اور محققوں سے ہو سکتا ہے جو اس خاندان کے چشم و چراغ تھے اور جنہوں نے دنیا کے طول و عرض کو اپنے فیضانِ علم و صحبت سے معمور کیا۔ کوئی خطہ ایسا نہیں جہاں اُن کے قدم پہنچے ہوں اور وہاں انہوں نے حق کا پیغام نہ پہنچایا ہو۔

رسِلِ حق کرد نامش بوتراب حق یداللہ خواند در اُمّ الکتاب

اِن خصائل کی بنا پر رسول اکرم صلعم نے حضرت علیؓ کا لقب ابوتراب رکھا اور خدا نے کلام مجید میں اُن کو یداللہ کہہ کر پکارا۔

ہر کہ دانائے رموزِ زندگی است سِرِّ اسمائے علی داند کہ چیست

خاکِ تاریکے کہ نامِ اُو تن است عقل از بیدادِ اُو در شیون است

فکرِ گردوں رس زمیں پیما ازو است چشم کور و گوشِ ناشنوا ازو است

از ہوس تیغِ دو رُو دارد بدست رہرواں را دل بریں رہزن شکست

شیرِ حق ایں خاک را تسخیر کرد ایں گِلِ تاریک را تسخیر کرد

مرتضیٰ کز تیغِ اُو حق روشن است بوتراب از فتحِ اقلیمِ تن است

اِن اشعار میں اقبالؒ نے اس حقیقت کی وضاحت کی ہے کہ حضرت علیؓ کے اندر وہ خصائص کیسے پیدا ہو گئے، جن کی بنا پر انہیں ابوتراب کا لقب ملا۔ اُن کے خیال میں یہ معمولی سی بات ہے جسے ہر وہ شخص جو زندگی کی حقیقتوں کو جانتا ہے بڑی آسانی سے معلوم کر سکتا ہے اور زندگی کی حقیقت یہ ہے کہ انسان اگرچہ ایک خاکی پتلا ہے لیکن خدا نے اس خاکی پتلے کے اندر اپنی قدرتِ کاملہ کے چند اسرار پوشیدہ کر رکھے ہیں جن کو ہم مختلف ناموں سے تعبیر کرتے ہیں چنانچہ عقل بھی اُن میں سے ایک ہے۔ اس خاکی جسم اور عقل کے درمیان ہمیشہ سے ایک ختم نہ ہونے والی جنگ برپا رہی ہے اور عقل اس خاکی جسم کے جور و ستم کی شاکی رہی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جب خاکی جسم عقل کو مغلوب

کرلیتا ہے تو وہ اُن خصائص سے محروم ہو جاتی ہے جو عقل کا خاصہ ہوتے ہیں اور انسان بھی خاکی جسم کی ہوسناکیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ خاکی جسم کی وہ ہوسناکیاں کون سی ہیں۔ مغلوب الشہوات اور مغلوب الغضب ہونا۔ حضرت علیؓ نے ان دو نو ہوسناکیوں کو مسخر کر لیا۔ چنانچہ انہوں نے خود فرمایا ہے کہ خدا نے فرشتوں کو عقل دی جو قوتِ شہوت اور قوتِ غضب سے مبرا تھی۔ حیوانوں کو قوتِ شہوت اور قوتِ غضب دی جو عقل سے عاری تھی اور انسان کو قوتِ شہوت بھی دی اور قوتِ غضب بھی اور اس کے ساتھ ہی عقل بھی۔ اگر انسان اپنی قوتِ شہوت اور قوتِ غضب کو عقل کا فرمانبردار بنالے تو وہ فرشتوں سے بھی برتر ہے اور اگر عقل کو یہ دو نو قوتیں مغلوب کرلیں تو وہ حیوانوں سے بھی بدتر ہے۔ حضرت علیؓ نے اپنے اس مقولہ کے پیشِ نظر اپنے خاکی جسم اور اس سے متعلقہ ہوسناکیوں کو مغلوب کر لیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ دنیا میں حق کا جھنڈا اُن کی شمشیر ذوالفقار نے بلند کیا تھا۔ اسی طرح جو شخص بھی عمل پیرا ہوگا اس کے اندر یہ قوت پیدا ہو جائے گی۔

مرد کشور گیر از کرّاری است — گوہرش را آبرو خودداری است
ہر کہ در آفاق گردد بوتراب — باز گرداند ز مغرب آفتاب
ہر کہ زیں بر مرکبِ تن تنگ بست — چوں نگیں بر خاتمِ دولت نشست
زیر پاش اینجا شکوہِ خیبر است — دستِ اُو آنجا قسیمِ کوثر است
از خود آگاہی یداللّٰہی کند — از یداللّٰہی شہنشاہی کند

وہی شخص دنیا میں فاتح کہلا سکتا ہے جس نے سب سے پہلے اپنے جسمِ خاکی کو قابو میں کیا ہو، ہوسناکیوں کے لشکر پر شیر کی طرح پے در پے حملے کر کے اپنے آپ کو کرّار ثابت کیا ہو۔ لیکن جس چیز کو ان سب پر حقِ فائق حاصل ہے، جو انسان کے جوہرِ حیات کی آبرو کی محافظ ہے وہ خودداری ہے، فقر ہے اور استغنا ہے اور جو شخص دنیا میں بوتراب کے لقب سے ملقب ہو

ہے اس کے اندر خدا ایسی صفت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ سورج کو مغرب سے لوٹا سکے جس طرح کہ حضرت علیؓ نے کیا تھا یہ اُن کے جذبۂ خود آگاہی کے طفیل تھا کہ وہ یداللّٰہی کے درجہ پر فائز ہوئے اور جو شخص یداللّٰہی کے درجہ کو پا لیتا ہے وہ عناصرِ عالم پر حکمرانی کرتا ہے، دنیا کی تمام مہمات اس کی انگلی کے اشاروں سے حل ہوتی جاتی ہیں اور اُس کی ایک ایک نگاہ کائنات کے پوشیدہ سے پوشیدہ اسرار کو معلوم کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے اس دنیا کی زندگی ہی پر کیا منحصر ہے موت کے بعد آنے والے جہان میں بھی اُسی کی سرداری کا سکہ رواں رواں ہوتا ہے اور اُس کائنات میں بھی اسی کو قابلِ فخر و عزت سمجھا جاتا ہے نہ صرف ساکنین کے نزدیک بلکہ خدا اور اُس کے رسول کے نزدیک بھی

ذاتِ او دروازۂ شہرِ علوم زیرِ فرمانش حجاز و چین و روم
حکمراں باید شدن بر خاکِ خویش تامَے روشن خوری از تاکِ خویش

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضؓ کے متعلق فرمایا اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَ عَلِیٌّ بَابُھَا۔ جو شخص اپنی مشتِ خاک پر غالب آجاتا ہے اس کے متعلق رسول اکرم بھی یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور وہی حجاز، چین اور روم پر بھی حکمرانی کر سکتا ہے۔

خاک گشتن مذہبِ پروانگی است خاک را اَب شو کہ ایں مردانگی است
سنگ شو اے ہمچو گُل نازک بدن تا شوی بنیادِ دیوارِ چمن
از گِلِ خود آدمے تعمیر کن آدمے را عالمے تعمیر کن
گر بنا سازی نہ دیوار و درے خشت از خاکِ تو بندد دیگرے

اِن اشعار میں اقبالؒ اُن مذاہب کی مخالفت کرتے ہیں جو انسان کو نفیِ حیات کی تعلیم دیتے ہیں، جو یہ کہتے ہیں کہ انسان چونکہ خاک سے پیدا ہوا ہے اس لئے اُسے چاہئے کہ اپنے آپ کو خاک میں ملا دے پروانے کی طرح اپنی ہستی کو معشوقِ حقیقی میں فنا کر دے کیونکہ انسان کی ہستی کا ہی

منتہائے کمال ہے، اقبال اس کے برعکس یہ تلقین کرتے ہیں کہ انسان اپنی ہستی کو فنا کرنے کے لئے دنیا میں پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کا مقصدِ حیات یہ ہے کہ وہ اپنے جسمانی قویٰ کو مسخر کر کے اپنے حسبِ منشا اُن سے کام لے اگرچہ انسان کا جسم خاک کا بنا ہوا ہے لیکن خاک کو خاک بنانا انسان کا کمال نہیں بلکہ کمال تو یہ ہے کہ وہ اس خاکی جسم کو آزمائشوں اور ابتلاؤں میں ڈال کر اتنا مضبوط اور طاقتور بنائے کہ دنیا کی کوئی طاقت اُس کے مقابلے کی تاب نہ لاسکے اور جو چیز اس کے ساتھ آ کر ٹکرائے وہ خود ہی پارہ پارہ ہو جائے اور اس کے اندر جو مخفی طاقتیں خدا نے رکھی ہیں اُن کو بروئے کار لائے تاکہ وہ آدم وجود میں آسکے جس کی نگاہ باطل سوز عالم کے خس و خاشاک کو جلا کر اس کی خاکستر سے ایک نئی دنیا کی تخلیق کرے اقبالؒ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ دنیا میں جو افراد اپنے آپ کو خاک بنانے کے حق میں ہیں اُن کا انجام کیا ہوتا ہے۔ تاریخ انسانی شاہد ہے کہ اُن کی اس خاک کو بے کار دوسروں نے فائدے اُٹھائے اپنی قوتِ ایجاد کے بل پر اس کو اکسیر بنایا اور اپنے زورِ نفس سے اس کے اندر ایک ایسی روح پھونکی کہ چند سال کے اندر ہی وہ ربع مسکون پر چھا گئے۔ قرونِ اولیٰ کا اسلام بھی اسی طرح دنیا میں پھیلا تھا کیونکہ اس کے اندر حضرت علیؓ کا یہ جذبۂ ایمانی کارفرما تھا کہ ہر مسلمان کو ابوتراب ہونا چاہئے اور یہی اُس کی زندگی کا ماحصل ہے ورنہ عناصر کی ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے اجسام میں کوئی فرق نہیں خواہ وہ انسان کے ہوں خواہ حیوانوں کے۔ جو چیز انسان اور حیوان کے مابین مابہ الامتیاز ہے وہ زورِ نفس، بلندیٔ حوصلہ، پاکیٔ نگاہ اور تحفظِ خودی ہے

اے ز جورِ چرخِ ناہنجار تنگ　　جامِ تو فریادیٔ بیدادِ سنگ
نالہ و فریاد و ماتم تا کجا　　سینہ کوبی ہائے پیہم تا کجا
در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات　　لذتِ تخلیق قانونِ حیات
خیز و خلاقِ جہانِ تازہ شو　　شعلہ در برکن خلیل آوازہ شو

شعراء، عالمانِ اخلاق، اور صوفیائے کرام نے ایک عرصہ سے انسان کو آسمانی گردشوں کے سامنے ایک کٹھ پتلی بنا رکھا ہے اور وہ رات دن اُسی کے جور و ستم کی گلہ بندیوں میں مصروف ہے، آہ و بکا کرتا رہتا ہے اور اپنا سینہ کوٹتا رہتا ہے لیکن اس بحرانی حالت میں اُس نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ آخر زندگی کا مقصد کیا ہے اور کیا اس بے عملی سے وہ اُس مقصد کو حاصل کر سکتا ہے جو خدا نے انسان کے پیدا کرنے میں پوشیدہ رکھا تھا اقبالؒ کے نزدیک انسان کی یہ روش اُس کی فطرت کے سراسر خلاف ہے کیونکہ وہ اس غرض سے پیدا نہیں کیا گیا کہ وہ اپنی قوتوں کو بالکل بیکار کر کے بیٹھ رہے اور جمود و سکون کی ایسی حالت پر قانع ہو جائے جس سے اُس کی ترقی کے جملہ امکانات خواب خیال ہو جائیں۔ اقبالؒ عمل کو زندگی کا دوسرا نام قرار دیتے ہیں اور اس کو انسانی اعمال کے پرکھنے کا واحد معیار سمجھتے ہیں۔ جس شخص کا دائرۂ عمل جتنا لامحدود ہوگا اس کی عملی قوتوں کو اپنے اظہار کے لئے اتنی ہی زیادہ گنجائشیں نظر آئیں گی لیکن اس عمل سے اقبال کی مراد یہ نہیں کہ کولھو کے بیل کی طرح ایک ہی مقام پر انسان چکر لگاتا رہے بلکہ عمل کے ساتھ تخلیق کا لفظ بھی جزو لاینفک ہے جب تک انسان کا کام و دہن اس کی لذت سے آشنا نہ ہو اُس کا عمل محدود ہو کر رہ جاتا ہے اور زندگی کے اُن سرچشموں تک اس کی رسائی نہیں ہو سکتی جو ہر لحظہ اپنے پہلو کو بدلتے رہتے ہیں اور جن کی رفتار کی تندی و تیزی ہر نرم رَو اور سُست گام کو پیچھے چھوڑتی جاتی ہے یا اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے اور غرق کر دیتی ہے۔ اسی لئے مسلمان کو مخاطب کر کے اقبالؒ نے کہا ہے کہ تمہاری بقا اسی میں ہے کہ اپنی دنیا آپ پیدا کرو۔ کیونکہ اس وقت جس دنیا میں تم زندگی بسر کر رہے ہو وہ تمہارے رہنے کے قابل نہیں اس میں بیسیوں ایسے فتنے پیدا ہو چکے ہیں جو تمہارے سخت ترین دشمن ہیں اگر تمہاری یہ خواہش ہے کہ ان فتنوں سے اپنے آپ کو بچاؤ تو حضرت ابراہیمؑ کا سا ایمان پیدا کرو تاکہ تم بھی عصرِ حاضر کی بھڑکتی آگ میں سے صحیح و سلامت بچ کر نکل سکو۔

با جہانِ نامساعد ساختن	ہست در میداں سپر انداختن
مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار	با مزاجِ اُو بسازد روزگار
گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں	می شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیادِ موجودات را	می دہد ترکیبِ نو ذرّات را
گردشِ ایّام را برہم زند	چرخِ نیلی فام را برہم زند
می کند از قوّتِ خود آشکار	روزگارِ نو کہ باشد سازگار
در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست	ہمچو مرداں جاں سپردن زندگی است

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس زمانے کی ہوا ناسازگار ہو اُس میں زندہ رہنے کے لیے انسان کو کیا وتیرہ اختیار کرنا چاہئے آیا اُس کے ساتھ موافقت کرنی چاہیئے اور جدہر کی ہوا چل رہی ہو اُدہر ہی چلنا چاہیئے یا اُس کے مخالف رُخ کو اختیار کرنا چاہیئے۔ عموماً یہی دیکھا جاتا ہے کہ ہر انسان زمانے کے رَو کے ساتھ بہ جاتا ہے اُس کے مذہبی، اخلاقی، معاشرتی اور تمدّنی حالات اُس زمانے کا عکس ہوتے ہیں جس میں وہ زندگی بسر کرتا ہے۔ علماء اور ماہرینِ اخلاق و معاشرت اپنے جملہ مسائل کی تشریحات میں اپنے اپنے زمانہ کے نفسیاتی ہیجانات اور سیاسی تحریکات سے متاثر ہوتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عوام کے دلوں میں بھی یہی عقیدہ جاگزیں ہو جاتا ہے ؎

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز

مگر اقبالؒ اس قسم کی نفسیاتی کیفیت اور اعتقادی صورت کے سخت خلاف ہیں چنانچہ وہ اس مقولہ کے جواب میں کہتے ہیں ؎

حدیثِ بے خبراں است با زمانہ بساز
زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

جیسے کہ انہوں نے اسرارِ خودی کے اِن اشعار میں بھی اس کی وضاحت کی ہے اقبالؒ کے خیال میں زمانے کے ساتھ موافقت کرنا بدترین اعتراف شکست ہے جو لوگ اپنے آپ کو زمانے کے رحم وکرم پر ڈال دیتے ہیں اُن کی زندگی کا ہر ایک لمحہ عبرتناک واقعات سے لبریز ہوتا ہے اس لئے اگر انسان دنیا میں باعزّت زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو اُس کے لئے ذیل کے امور پر کاربند ہونا ضروری ہے۔

۱۔ بجائے اس کے کہ وہ زمانہ کے ساتھ موافقت کریں زمانہ اُن کے مزاج کے ساتھ موافقت کرے۔

۲۔ اگر زمانہ اُن کے ساتھ موافقت نہ کرے تو وہ اس کے ساتھ جنگ آزما ہوں اور اپنی قوت سے اس کے نظام کو درہم برہم کریں۔ یہاں تک کہ نئے جہان کو وجود میں لے آئیں۔

۳۔ اگر جنگ آزمائی سے بھی وہ زمانہ کو اپنے موافق نہ بنا سکیں تو ذلت کی زندگی بسر کرنے کی بجائے اُنہیں چاہئے کہ اس آویزش یہم میں اپنی جان دے دیں۔

دراصل جن شخصیتوں نے دنیا میں کارہائے نمایاں کئے ہیں اُن کے دلوں میں یہی جذبہ حیات خونِ زندگی بن کر دوڑتا رہا ہے اور انہوں نے دنیا کو ہر وقت میدانِ جنگ سمجھا مسلمانوں کو سب سے مکمل مثال حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ملتی ہے کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ انہوں نے زمانہ کے ساتھ موافقت کی تھی یا کبھی اپنا سرِ تسلیم اس کے سامنے خم کیا تھا حالانکہ مختلف قسم کی تحریصات سے اُن کو ورغلانے کی بھی کوشش کی گئی تھی اس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی بلکہ اس کے برعکس وہ زمانہ کے نظامِ فرسودہ اور عقائدِ باطلہ کے خلاف بےخوف وخطر اُٹھ کھڑے ہوئے اور طرح طرح کی اذیتیں اُٹھائیں لیکن پائے استقامت میں خفیف سی بھی لغزش نہ آئی یہاں تک کہ ایک نئے جہاں کو وجود میں لانے میں کامیاب ہو گئے اور یہی درسِ حیات انہوں نے اپنی اُمت کے لئے چھوڑا ہے آنحضرت صلعم کے بعد اُن کی اُمت میں بھی سینکڑوں شخصیتیں ایسی پیدا ہوئیں جنہوں نے دنیا کے اس پیشوائے اعظم کے نقشِ قدم پر چل کر اپنے وقت کی

خرابیوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور اس کا نتیجہ یا تو یہ نکلا کہ وہ اپنے جہاد میں کامیاب ہو گئے یا اُنہوں نے اس کوشش میں جان تک دے دی لیکن طاقتوں کے سامنے اپنے سر کو جھکانا گوارا نہ کیا۔ ان دونو کے نام زندہ جاوید ہو گئے اور آج مسلمانوں کے لئے سنگِ میل کا کام دے سکتے ہیں بشرطیکہ یہ اُس روحِ زندگی کو اپنے اندر پیدا کریں۔

اسلام کے اندر جو انتشار ایک زمانہ سے پیدا ہو رہا ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ مسلمان کا دل اسلامی جذبۂ عمل سے عاری ہو چکا ہے اور اس کا دماغ اتنا ضعیف الاعتقاد ہے کہ دوسری قوموں کے اثرات کو ہر وقت اور زندگی کے ہر شعبہ میں قبول کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ جو المزدی اور غیر تمندی کے جس رنگ میں اُسے رنگا گیا تھا اُس کا ہلکا رنگ بھی اب دکھائی نہیں دیتا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کہیں وہ اشتراکی رنگ کو اختیار کئے ہوئے ہے، کہیں آزاد خیالوں کی جماعت کا ممبر بنا ہوا ہے، اور کہیں تھیا سوفیکل سوسائٹی میں بیٹھا اسلام کی تضحیک کر رہا ہے غرض ہر نئی تحریک اور ہر نئی سوسائٹی کا خیر مقدم کرنے کے لئے وہ ہر وقت تیار رہتا ہے جب کہ مسلمانوں کی اپنی یہ حالت ہے تو پھر یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں کہ زمانہ اُن پر ظلم وستم کرے اور وہ زمانہ کے ظلم وستم کے ہاتھوں نالاں ہوں۔ ہندوستان کی ادبیات پر نظر ڈالئے تو مسلمان ادیبوں کو چرخِ ستمگار اور زمانہ ناہنجار کا رونا روتے ہی دیکھئے گا، عقائد اور اُن کے رسم و رواج کو ملاحظہ فرمایئے اسلام سے ان کو دور کی بھی مناسبت نہیں کیا یہی وہ قوم ہے جو حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی قوتِ تخلیق کا نتیجہ تھی جس کا ایک ایک فرد شیروں سے جا لڑتا تھا، دریاؤں کے رُخ بدل دیتا تھا اور آفتاب کو غروب ہونے سے لوٹا دیتا تھا۔ حضرت علیؓ اسلامی سیرت کا ایک لاثانی نمونہ تھے جنہوں نے اس اسلامی مسلک پر کاربند ہو کر دنیا کو دکھا دیا کہ جب زمانہ کسی مردِ خود دار کے ساتھ موافقت نہیں کرتا تو وہ مردِ خود دار کس طرح زمانہ کے ساتھ جنگ آزما ہو جاتا ہے اور اُس کے

نظامِ کہنہ کو درہم برہم کر کے کس طرح وہ نئے نظام کو اس کی جگہ دنیا میں رائج کرتا ہے

آزماند صاحبِ قلبِ سلیم | زورِ خود را از مہماتِ عظیم
عشق با دشوار ورزیدن خوش است | چوں خلیل از شعلہ گل چیدن خوش است
ممکناتِ قوتِ مردانِ کار | گردد از مشکل پسندی آشکار
حربۂ دوں ہمتاں کین است و بس | زندگی را ایں یک آئین است و بس
زندگانی قوتِ پیدا ستے | اصل او از ذوقِ استیلاستے

اقبال کہتے ہیں کہ جس شخص کو قدرت نے قلبِ سلیم عطا کیا ہے وہ قوت آزمائی کے وقت کبھی مغلوب الغضب نہیں ہوتا اور اس کے دل و دماغ کی آنکھیں کینے یا خواہشات نفسانی کی وجہ سے اندھی نہیں ہو جاتیں۔ وہ پہلے اپنی قوت کا جائزہ لیتا ہے اور پھر اپنے مدِ مقابل کی قوت۔ وہ اس کو بھی دیکھتا ہے کہ خدا نے یہ قوت مجھے کس مقصد کے لئے دی ہے اور اس کا صحیح محل استعمال کیا ہے غرض وہ اس معاملہ میں بڑی وسعتِ نظری سے کام لیتا ہے اور آخر اس نتیجہ پر پہنچتا ہے قوت کا مقصد حق و باطل کی آویزشوں کا فیصلہ کرنا ہے مگر اس کا محل استعمال یہ نہیں کہ اپنے سے کم قوت والوں کو مدِ مقابل بنایا جائے بلکہ اپنے سے زیادہ قوت والوں کا مقابلہ کیا جائے۔ جوانمردوں کا یہی خاصہ ہوتا ہے ان کے نزدیک کمزوروں اور ضعیفوں پر ہاتھ اٹھانا ننگِ جوانمردی ہے اور سوئے ہوئے اور بے خبر دشمن پر حملہ کرنا بزدلی ہے کیونکہ وہ اس سے بخوبی واقف ہوتے ہیں کہ قوت کے مخفی امکانات کا اظہار اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ مدِ مقابل بھی قوی اور ہوشیار ہو۔ دور کیوں جاتے ہو جب دو پہلوانوں کے درمیان کشتی ہوتی ہے تو جب تک دونو پہلوان ہم پلہ نہ ہوں پچھاڑنے والے کے لئے کوئی قابل فخر بات نہیں ہوتی ہے رستم ہند گاماں پہلوان اگر کشتی میں کسی پٹھے کو گرالے تو اس کے رستم ہند ہونے کے لئے باعثِ ننگ ہے ضرورت اس کی ہے کہ گونگا پہلوان یا اس سے بھی کوئی طاقتور پہلوان اس کے

مقابلہ میں آئے تاکہ اُسے اپنا کمالِ فن دکھانے کا موقعہ ملے اور تماشائی بھی اس کی قوت کے معترف ہوں۔

اسی طرح عشق کا بھی یہی خاصہ ہے چونکہ یہ خود بھی ایک زبردست قوت ہے اپنا مدِمقابل بھی اتنا ہی زبردست طلب کرتی ہے یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ عشق اپنے سے فرومایہ چیز کو چاہے اور نہ کوئی فرومایہ چیز اس کا ساتھ دے سکتی ہے دو چار قدم ہی اُس کے ساتھ چل کر وہ رہ جاتی ہے حضرت ابراہیمؑ کے عشق نے شعلوں کو اپنا مدِمقابل منتخب کیا اور اس طرح اپنی بے پناہ قوت سے ایک ایسی چیز پر فتح حاصل کی جس کی خاصیت یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو جلا کر خاک سیاہ کر دیتی ہے۔ آج دنیا میں آگ کی قوت سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن حضرت ابراہیمؑ کے عشق کی قوت نے اُس کو ٹھنڈا کر دیا۔ جب تک حضرت ابراہیمؑ نے اتنے زبردست مدِمقابل سے قوت آزمائی نہیں کی تھی اُن کے عشق کے مخفی امکانات آشکار نہیں ہوئے تھے لیکن اس مقابلہ نے دنیا پر یہ بات ثابت کر دی کہ آگ سے بھی طاقتور کوئی چیز دنیا میں ہے۔

عفوِ بے جا سردئ خونِ حیات	سکتہ در بیتِ موزونِ حیات
ہر کہ در قعرِ مذلت ماندہ است	ناتوانی را قناعت خواندہ است
ناتوانی زندگی را رہزن است	بطنش از خوف و دروغ آبستن است
از مکارم اندرون او تہی	شیرش از بہر ذمائم فربہی است

اس میں کچھ شک نہیں کہ عفو و درگزر کا شمار محاسنِ اخلاق میں ہوتا ہے لیکن جب اس کا استعمال غلط ہو جاتا ہے تو یہی خوبی عیب میں بدل جاتی ہے اور انسان کے اندر اچھی خصلت کے بجائے بُری خصلت پیدا ہونے لگتی ہے حقیقی عفو تو وہی ہے جس کا مظاہرہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے وقت کیا تھا۔ جب کہ آنحضرت صلعم میں اس کی طاقت تھی کہ وہ اہلِ مکہ سے

اُن مظالم کا بدلہ لیتے جو انہوں نے آنحضرت صلعم اور اُن کے ہمراہیوں پر کئے تھے لیکن سبحان اللہ عفوو درگزر کی کیا شان ہے۔ تمام اہل مکہ ڈر کے مارے کانپ رہے تھے کہ دیکھئے فاتح اب اُن کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے کیونکہ اُن کو اپنی بدسلوکیاں اچھی طرح یاد تھیں لیکن اُن کو اس کا علم نہیں تھا کہ یہ فاتح دنیا کے دوسرے فاتحوں سے بالکل نرالا ہے اور یہ صرف فاتح ہی نہیں بلکہ نبی بھی ہے چنانچہ آنحضرت صلعم نے اہل مکہ کو اکٹھا کر کے علی الاعلان کہہ دیا کہ لا تثریب علیکم الیوم اصل میں معافی کا یہ اعلان اُس خوشی کی تقریب میں تھا جو خدا نے حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو مکہ پر عطا کی تھی اور اس میں کوئی ذاتی غرض نہ تھی۔ خدا نے اس عفوِ عام کا مشرکین مکہ کے دلوں پر یہ اثر ڈالا کہ اُن میں سے اکثروں نے خوش دلی سے اسلام قبول کر لیا حالانکہ اس سے قبل وہ اسلام کے سخت ترین دشمن تھے لیکن جب سے نہ معافی دینے والے کو اس کا اندازہ ہے کہ اُس میں کسی معاف کرنے کی کہاں تک اہلیت ہے اور نہ معافی مانگنے والے کو اس کا احساس کہ وہ معافی مانگنے میں کہاں تک حق بجانب ہے زندگی کی سرگرمی ٹھنڈی پڑ گئی ہے، بے غیرتی اور بے شرمی ہر سو دکھائی دیتی ہے اور کسی کو پاسِ خودداری نہیں رہا جب تک کسی انسان میں بدلہ لینے کی طاقت نہ ہو اس کا دوسرے کو معاف کرنا بے معنی ہے جس شخص میں مقابلہ کرنے کی قوت نہیں اس کا جھک کر سلام کرنا کمزوری میں داخل ہے اور جو شخص اپنے ہاتھ پاؤں ہلا کر نہ کمائے اس کی قناعت قابلِ نفرین ہے۔ اقبال کے نزدیک یہ سب بے طاقتی کے کرشمے ہیں اس لئے جس شخص یا جماعت پر ناتوانی حملہ آور ہوتی ہے اس کے جسم کا خزانہ زندگی کے اوصاف حمیدہ سے خالی ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ خوف اور جھوٹ لے لیتے ہیں۔

ہوشیار اے صاحب قلبِ سلیم | در کمینہا می نشیند این غنیم

تا

جہرہ در شکلِ تن آسانی نمود | دل ز دستِ صاحب قوت ربود

اقبالؒ کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا نے مسلمان کو عقلِ سلیم عطا کی ہے اس لیے وہ اس کو مخاطب کرکے تنبیہہ کرتے ہیں کہ ناتوانی ایک زبردست دشمن ہے جو ہر وقت انسان کی گھات میں لگا رہتا ہے عقلمند آدمی کو چاہئے کہ اس کے دھوکے میں نہ آئے یہ ایسی ایسی صورتیں اختیار کرتی ہے کہ اخلاقِ ذمیم، اخلاقِ حسنہ دکھائی دینے لگتے ہیں کبھی رحم اور نرمی کا لباس پہن لیتی ہے اور کبھی انکساری کا، کبھی مجبوری کا اور کبھی معذوری کا اور کبھی آرام طلبی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے غرض ہر قوی انسان کے دل کو چھیننے کے لیے یہ تمام سوانگ بھرتی ہے اور اپنے اندر دلکشیاں پیدا کرتی ہے کون ہے جو رحم، نرمی اور انکساری کو بہترین انسانی خوبی نہیں سمجھتا، مجبوری اور معذوری کے دامن میں بروقتِ ضرورت پناہ نہیں لیتا اور آرام طلبی کا دل سے شیدائی نہیں یہ انفرادی عقاید ہی نہیں بلکہ دنیا میں اکثر مذاہب ایسے ہیں جو رحم، نرمی، اور انکساری کی تلقین کرتے ہیں، انسان کو فطرتاً مجبور قرار دیتے ہیں اور دنیا کے حوادث کا مقابلہ کرنے میں اُسے معذور پاتے ہیں لیکن وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ محرّکات کو کسی تحریک سے کہاں تک تعلق ہوتا ہے لبعض اوقات ایک تحریک بظاہر اچھی معلوم ہوتی ہے لیکن جب اُس کے محرّکات پر غور کیا جاتا ہے تو اس کا بودا پن روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے۔ چنانچہ، بدھ مت اور جین مت اِسی قسم کے مذاہب ہیں جن کے محرّکات کی تہ میں انسانی ناتوانی اور بےلبسی کارفرما دکھائی دیتی ہے۔ آج کل ہندوستان میں عدم تشدّد کی جو تحریک چل رہی ہے انسانی بےلبسی کا ایک زبردست المیّہ ہے اصل میں سیاسی حالات اور وقتی مصلحتوں کی آڑ میں ہندو ایک ایسے اُصول کو اختیار کئے ہوئے ہیں جو اُن کے مذہب کی جان ہے۔ لیکن زندہ قوموں کے لئے اُن کا یہ اُصول پیغامِ موت ہے افسوس کہ مسلمانوں جیسی زندہ قوم بھی اُن کے پیچھے لگی ہوئی ہے اور ایسے اصول پر کاربند ہے جو اسلامی تعلیم کے خلاف ہے

با توانائی صداقت توام است گر خود آگاہی ہمیں جامِ جم است

زندگی کشت است و حاصل قوت است　　شرحِ رمزِ حق و باطل قوت است

مدعی گر مایہ دار از قوّت است　　دعویٔ او بے نیاز از حجّت است

باطل از قوّت پذیرد شانِ حق　　خویش را حق داند از بطلانِ حق

از کُنِ او زہر کوثر مے شود　　خیر را گوید شرے شر می شود

اقبالؒ زندگی کی کتاب کے بہترین مفسر ہیں۔ چہرۂ حیات پر انہیں جتنے بھی خط و خال دکھائی دیتے ہیں اُن میں سے جو چیز اُن کی توجہ کے لئے زیادہ جاذب ہے وہ اُس کی شانِ جلالی ہے اور بغیر اس کے شانِ جمالی کو بھی جادوگری قرار دیتے ہیں ضربِ کلیم کے ان اشعار میں وہ جس چیز کو اپنے لئے کافی سمجھتے ہیں وہ یہی شانِ جلالی ہے ؎

مرے لئے ہے فقط زورِ حیدری کافی　　ترے نصیب فلاطوں کی تیزیٔ ادراک

مری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی　　کہ سر بسجدہ ہیں قوّت کے سامنے افلاک

نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر　　نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتش ناک

مجھے سزا کے لئے بھی نہیں قبول وہ آگ　　کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بیباک

اقبالؒ کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان قوت کا مظہر اتم ہے اور شانِ جلالی اس کی زندگی کا زیور ہے اس لئے اس کی زندگی کی ہر حرکت اور ہر فعل سے قوّت کا مظاہرہ ہونا چاہیئے اور اس کے دل و دماغ کی دنیا اسی کے جلووں سے منوّر ہونی چاہیئے نہ اُسے کسی ایسے شخص سے ہمنشینی اختیار کرنی چاہیئے جو اُس کی قوت کا رہزن ہو اور نہ کسی ایسے شخص سے مقابلہ کرنا چاہیئے جو اپنی ناتوانی پر قانع ہو۔ اقبالؒ کے نزدیک قوّت ہی سچائی ہے اور وہ اپنے دعوے کو بغیر کسی دلیل کے منوا لیتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر ایک وقت میں باطل بھی قوّت حاصل کرے تو وہ اپنے اندر شانِ حق پیدا کر لیتا ہے اور حق کو باطل قرار دے کر اپنے آپ کو حق سمجھنے لگ جاتا ہے چنانچہ جس چیز کو وہ اچھا سمجھتا ہے

دوسرے بھی اس کو اچھا سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور جس چیز کو وہ برا قرار دے دیتا ہے دوسرے اس کو برا قرار دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اس کے بے پناہ سیلاب کے آگے کسی کو یارائے، دم زدن نہیں ہوگا۔ دنیا اس وقت تک قوت کے بے شمار مظاہرے دیکھ چکی ہے اور تاریخ اس قسم کے واقعات سے لبریز ہے کہ کس طرح جس کے ہاتھ میں لاٹھی ہوتی ہے وہ سب کو ایک ہی سمت کو ہانکتا ہے سکندر اعظم اور چنگیز خاں کیا تھے قوت کا ایک ایک مظہر تھے جن کا سیل سبک سیر عقل، نظر، علم، ہنر اور دین سب کو اپنی رو میں بہا کر لے گیا اور ان کے مقابلہ کی کسی ایک کو بھی جرأت نہ ہو سکی نپولین اور لینن کی قوت کا بھی آپ کو خوب اندازہ ہے۔ لینن کی قائم کی ہوئی حکومت اس وقت بھی دنیا کے ایک وسیع حصہ پر اپنی قوت کا زندہ ثبوت دے رہی ہے غرض اقبالؒ قوت کو ایک ایسا موثر حربہ سمجھتے ہیں جس کے سامنے کوئی چیز بھی نہیں ٹھہر سکتی چنانچہ ضرب کلیم میں فرماتے ہیں ؎

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک
تاریخ امم کا یہ پیامِ ازلی ہے صاحب نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیل سبک سیر و زمیں گیر کے آگے عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لادیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

اقبالؒ کو ہر قوی چیز بے حد پسند ہے، جمادات، نباتات اور حیوانات میں سے بھی جو چیز اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے پر قادر ہے اقبالؒ اس کے دل سے شیدائی ہیں چنانچہ حیوانات میں سے شیر اور چیتے کے بہت مداح ہیں اور پرندوں میں سے شہباز کو ایک مثالی پرندہ سمجھتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان جانوروں کی رگوں میں اقبالؒ کو خونِ حیات بڑی تیزی سے دوڑتا دکھائی دیتا ہے اور بہادری اور غیر تمندی کی خصوصیت ان کے اندر پائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اپنے اپنے دائرہ مخلوقات میں امتیازی درجہ رکھتے ہیں۔

اے ز آدابِ امانت بے خبر
از دو عالم خویش را بہتر شمر

از رموزِ زندگی آگاہ شو
ظالم و جاہل ز غیر اللہ شو

چشم و گوش و لب کشا اے ہوشمند
گر نہ بینی راہِ حق بر من بخند

مسلمان کو مخاطب کر کے اقبالؒ کہتے ہیں کہ جب غیر ذوی العقول مخلوقات کی یہ حالت ہے کہ جنسی قوت کے بل پر انہیں شانِ امتیازی حاصل ہے تو کیا وجہ ہے کہ تو اس امانت سے غافل ہے جو خدا نے روزِ ازل انسان کے سپرد کی تھی اور جس کو سوائے تیرے دنیا کی تمام مخلوقات نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس بنا پر تجھے لازم ہے کہ اپنے آپ کو دونو عالم سے بہتر سمجھے اور زندگی کے اس بھید کو معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ سوائے خدا کے جملہ مخلوقات کو اپنے قبضۂ قدرت میں لانا تیری زندگی کا مقصدِ وحید ہے اور یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جس پر چلنے کی تمہیں تاکید کی گئی ہے اس لئے اپنے ہوش و حواس درست کر کے اپنی تمام طاقتوں کو اس کوشش میں صرف کر دے کیونکہ مومن کی شان تو یہ ہے ؎

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

عقیدۂ توحید اور اقبال

(جناب مولوی نذیر الحق صاحب میرٹھی)

ملتِ بیضا تن و جاں لا الٰہ ساز مارا پردہ گرداں لا الٰہ

لا الٰہ سرمایۂ اسرارِ ما پردہ بند از شعلۂ افکارِ ما

دین کے بنیادی اصول تین ہیں، انبیا علیہم السلام نے ان ہی اصولوں کی دعوت دی اور ان ہی اصولوں پر نوع انسان کی دینی و دنیوی بہتری، بھلائی، کامیابی، ترقی اور نجات کا دار و مدار ہے۔ قرآن پاک نے ان اصولوں کے متعلق جو تعلیم و روشنی دی ہے وہ اس قدر فطری، عقلی، کامل اور جامع ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب اس کی نظیر لانے سے قاصر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اسلام کو دنیا کا آخری اور نجات دہندہ مذہب مانتے ہیں۔

دین کا پہلی اصلی اور بنیادی عقیدہ خدا پر ایمان لانا ہے، لیکن دنیا بھر کی قومیں اسی اصل میں صحیح راستے سے دور جا پڑی ہیں اور وہ خدا کی ذات و صفات کے متعلق اتنا گھٹیا درجہ کا تصور رکھتی ہیں کہ اس کا خلافِ عقل و فطرت ہونا ہر سلیم الفطرت انسان بادنیٰ تامل معلوم کر سکتا ہے۔ اسلام سے پہلے انسان کا یہ حال تھا کہ وہ دنیا کے ذرہ ذرہ کو خدا سمجھتا تھا۔ تاریخ انسانی بتلاتی ہے کہ تمام نوع انسانی کے اندر ایک بلند و بالاتر ہستی کا اقرار و اعتراف تو موجود رہا کہ اس کا احساس وجدانی طور پر فطرتِ انسانی کے اندر موجود ہے لیکن گوناگون اسباب داقتضاتِ فطرتِ انسانی

پر قسم قسم کے پردے ڈالتے اور اُسے کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں اور یہ فطری تصور اقوام و مذاہب نے قسم قسم کے پردوں اور لباسوں میں گم کر کے رکھ دیا اور خود ساختہ و خیالی معبودوں کے پجاری بن گئے۔

اس سلسلہ میں قرآن کریم نے جو اولیں پیغام نوعِ انسانی کو دیا وہ لا الٰہ الا اللہ ہے اس کلمہ کے دو حصے ہیں۔ ایک سلبی۔ یعنی اس امر کا یقین کہ دنیا میں کوئی طاقت ایسی نہیں جسے آقا، مالک، حکمران اور مربی تسلیم کیا جائے جس کی غلامی اختیار کی جائے اور جسے حاجات کا قبلۂ مقصود بنایا جائے۔ یہ نفی کا پہلو ہے یعنی پہلے سے ذہن میں جو کچھ ہو اُسے مٹا دینا اور بھلا دینا چاہیے۔ جب ذہن یوں صاف ہو جائے تو پھر اس میں اللہ کا تصور بٹھایا جائے اور اعمال کی ایک نئی عمارت کھڑی کی جائے۔ یہ ایجابی پہلو ہے۔ کہ تمام قوتوں کے انکار کے بعد صرف معبود حقیقی کی غلامی اختیار کی جائے۔ تمام ذہنی، فرضی، وہمی اور خیالی معبودوں اور قوتوں کو راستے سے ہٹا کر خدا اور بندے کا براہِ راست تعلق پیدا کر دیا جائے۔

اس طرح جب ایک انسان عقل انسانی کے تراشے ہوئے خداؤں کی تخریب پر آمادہ ہو گیا۔ تو اُس نے "لا" پر عمل اور لاہِ توحید پر قدم اُٹھا لیا۔ مگر اب لغزش کا مقام آگیا۔ جہاں ممکن ہے کہ محسوسات کا خوگر انسان جھوٹ کو سچ فریب کو حقیقت اور باطل کو حق سمجھ بیٹھے، اپنی فطرت صالحہ کو مسخ کر لے اور حقیقتِ مجردہ کو خارجی پردوں اور لباسوں میں گم کر دے اور دنیا کے تمام مذاہب و مسالک اس غلطی میں گرفتار ہیں اس مشکل مقام پر آ کر "اِلّا" ذہن انسانی کو گمراہی سے بچاتا اور محسوسات کے پردوں کو چاک کر کے حقائق حسن و عشق تک پہنچاتا ہے۔ اگر اس تخریب و تعمیر میں "لا" "اِلا" سے بیگانہ ہو جائے۔ یعنی آپ پتھر کے بتوں سے خدائی منصب چھین کر تقدس مآب انسانوں کو الوہیت کے مقام تک پہنچا دیں یا کسی فرعون کے ہاتھ سے زمامِ اقتدار چھین کر

کسی کمزور کے ہاتھ میں دے دیں تو گویا آپ نے ایک باطل کو مٹا کر اُس کی جگہ دوسرا باطل قائم کر دیا آج امتِ مسلمہ مذہبیات و سیاسیات کے اسی چکر میں پھنسی ہوئی ہے۔ حضرت اقبالؒ اس چیز کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

نہادِ زندگی میں ابتدا لا انتہا الّا — پیام موت ہے جب لا ہوا الّا سے بیگانہ
وہ ملت روح جس کی لا سے آگے بڑھ نہیں سکتی — یقین جانو ہوا لبریز اُس ملت کا پیمانہ

ذرا غور فرمائیے علامہ مرحوم نے ان دو شعروں میں ذہن انسانی کو کہاں سے کہاں پہنچانا چاہا ہے۔ کیا ہماری قوم اسی لئے مرگ آور نیند کے مزے نہیں لوٹنے لگی کہ اس نے "لا" کو "الّا" سے بیگانہ و بے تعلق کر دیا۔ نام نہاد مسلمان زبان سے لا الٰہ الّا اللہ کہتے رہے اور دل کو صنم خانہ بنا لیا۔ وہ بڑی سادگی کے ساتھ اس کلمہ کو پڑھ جاتے ہیں مگر اس بات کو محسوس تک نہیں کرتے کہ اس فیصلہ کن اقرار کا عقلی اقتضا کیا ہے؟ اور اس جملہ کے مقتضیات و مطالبات کیا ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ ؎

شرک پیدا ہو گیا توحید رخصت ہو گئی — بے زری ناطاقتی جزوِ طریقت ہو گئی

اقبال وہ پہلا شخص ہے جس نے اپنی فلسفیانہ شاعری میں معقول و مدلل اور دلنشیں پیرایہ میں اس کلمہ کے جملہ مقتضیات و مطالبات کو پیش کر کے امتِ مسلمہ کو ایک نئی زندگی کی دعوت دی ہے اور مسلمانوں کے دل و دماغ کو مسلمان بنانا چاہا ہے۔

اقبال کے نزدیک تعلق باللہ کی حقیقت تک پہنچنا گویا عروجِ انسانی کا کمال ہے اور خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہوں نے اس گوہرِ مقصود کو پا لیا۔ وہ کہتا ہے اس متاعِ بے بہا کا حصول ہدایتِ آسمانی کی روشنی اور اتباعِ نبوت کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ حقیقت دیکھنے کی چیز ہے سمجھنے کی نہیں۔ قرآن حکیم نے ایمان بالغیب کے فلسفہ میں انسانی عقل و ادراک کی کمزوری و نارسائی کا اعلان

کرتے ہوئے دنیا والوں کو بتلا دیا ہے کہ خدا شناسی ذہنی ادراک کی کیفیت کا نام نہیں بلکہ روحانی مشاہدے کی تفسیر ہے۔ چنانچہ مرید ہندی پیر رومی سے اس سلسلہ میں استفسار کرتے ہیں کہ انسانی ارتقار کا مقصد و منتہیٰ علم حقیقت ہے یا دیدارِ حقیقت؟

خاک تیرے نور سے روشن بصر غایتِ آدمؑ خبر ہے یا نظر

اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے ؎

آدمی دید است باقی پوست است دید آں باشد کہ دید دوست است

انسانی زندگی پر عقیدۂ توحید کا اثر | لا الٰہ الا اللہ کے اقرار سے انسان پر ایک وجد آور کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں اقبالؒ نے سب سے پہلے اس چیز کو ذہن نشین کرایا ہے کہ اسلام کی تعلیم میں ایمان باللہ سب سے اہم اور بنیادی چیز ہے۔ یہ اسلامی اعتقادات و احکام کا مرکز، اس کی جڑ اور اس کی قوت کا منبع ہے، اسلام کے تمام قوانین اسی ایک بنیاد پر قائم ہیں اور سب کو اسی مرکز سے قوت پہنچتی ہے فرماتے ہیں ؎

دیں از و حکمت از و آئیں از و زور از و قوت از و تمکیں از و

یہ کلمہ انسان کو اس کے اصلی مقام سے واقف کرتا ہے، اس میں انتہا درجہ کی خودداری اور عزتِ نفس پیدا کر دیتا ہے، اس لئے کہ اس پر اعتقاد رکھنے والا جانتا ہے کہ انسان تمام مخلوقات کا آقا ہے، وہ تمام مخلوقات سے اشرف ہے، مخلوقات میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کو انسان اپنا خدا بنالے اور کسی کے آگے جھکے۔ صرف ایک خدا ہی تمام طاقتوں کا مالک ہے اس کے سوا کوئی نفع و نقصان پہنچانے والا نہیں۔ موت و حیات، عزت و ذلت اور نفع و نقصان سب کچھ اللہ ہی کے ہاتھ ہے پس اس کی گردن کسی مخلوق کے آگے نہیں جھک سکتی۔ فرماتے ہیں ؎

آنکہ ذاتش واحد است و لاشریک — بندہ اش ہم در نسازد با شریک

مومن بالائے ہر بالا ترے — غیرت او بر نتابد ہمسرے

ایک مومن کی شان یہ ہے کہ اس کا سر سوائے خدا کے اور کسی کے سامنے نہ جھکے ۔

پیش فرعونے سرش افگندہ نیست — ماسوی اللہ را مسلمان بندہ نیست

اس لئے کہ دنیا کی ہر چیز اس کے لئے ہے اور وہ کسی کے لئے نہیں ۔

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے — جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

متاعِ دنیا کے فلسفہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ دنیا ایک متاع ہے ۔ اب یا تو اس کی غلامی میں عمر بسر کی جائے یا اُسے اپنے قبضہ و اختیار میں لے لیا جائے تاکہ دنیا کے انسانوں کو انسانوں کی غلامی و بادشاہی سے نکال کر خدا کی حکومت و بادشاہی میں لے آیا جائے اقبال کہتا ہے

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث — مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے۔

عقیدۂ توحید انسان میں احساس خود داری اور عزتِ نفس کو کتنا اُبھارتا ہے ۔

مسلم استی بے نیاز از غیر شو — اہلِ عالم را سراپا خیر شو

پیشِ منعم شکوۂ گردوں مکن — دستِ خویش از آستیں بیروں مکن

چون علیؓ در ساز بانانِ شعیر — گردنِ مرحب شکن خیبر بگیر

منت از اہلِ کرم بردن چرا — نشترِ لا و نعم خوردن چرا

رزقِ خود را از کفِ دوناں مگیر — یوسف استی خویش را ارزاں مگیر

قرآن مجید کی رو سے موحد وہ ہے جو صرف ایک قادر مطلق عالم الغیب خدا پر ایمان رکھتا ہو اور اس کے سوا کسی کو اپنا خالق، مالک، حاکم، رازق، کفیل، کارساز، دستگیر، حافظ ناصر اور مستعان نہ سمجھتا ہو اور صرف اسی ایک کا ہو جائے ۔

چوں مقام عبدہٗ محکم شود کاسۂ دریوزہ جام جم شود

قوم را اندیشہا باید یکے در ضمیرش مدعا باید یکے

اگر مسلمانوں کی نظروں سے فکر و عمل کی یہ بلندی اوجھل ہو جائے تو ان کی زندگی سے موت اچھی ہے ۔

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

لا الٰہ الا اللہ کا اعتقاد سوائے خدائے واحد کے کسی کو حکومت کا حق نہیں دیتا۔ اُس اعتقاد کی رُو سے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ بذاتِ خود انسانوں کا حکمران بن جائے پس اس اعتقاد کی رُو سے خدا کے سوا کسی کی غلامی جائز نہیں ۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

یہی وجہ ہے کہ اقبال اس ترقی اور آزادی کا طالب نہیں جو حکمران عطا کریں ۔

خریدے نہ جس کو وہ اپنے لہو سے مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی

وہ اس آزادی کو آزادی نہیں سمجھتا جو ہر فردِ بشر کو شترِ بے مہار بنا دے ۔

اس قوم کی ہے شوخئ اندیشہ خطرناک جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد

اقبال کو محض وہ ترقی اور آزادی مطلوب ہے جو اسلام کے ذریعہ حاصل کی جائے اور جس کی بنیاد اس اعتقاد پر ہو کہ "مسلم خدا کے سوا کسی کا محکوم نہیں" ۔

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر میری دانش ہے افرنگی میرا ایمان ہے زناری

پس اگر مسلمانوں کو ترقی اور آزادی مطلوب ہے تو انہیں چاہئیے کہ اپنے اندر توحید کی روح پیدا کریں اور دنیا کے موجودہ شیطانی نظام کو تہ و بالا کر دیں ۔

تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام دانش و تہذیب دیں سودائے خام

ہر نئی تہذیب کو لازم ہے تخریب تمام ہے اسی میں مشکلات زندگانی کی کشود

لا الٰہ الا اللہ سے مسلمانوں کو یہی سبق ملتا ہے کہ وہ دنیا سے غیر اللہ کی حاکمیت و حکومت مٹا کر حکومتِ الٰہی کو قائم کریں ؎

صنم کدہ ہے جہاں اور مردِ حق ہے خلیل یہ نکتہ وہ ہے جو پوشیدہ لا الٰہ میں ہے

اقبال جانتا ہے کہ صدیوں سے مسلمان اس چیز کو بھولے ہوئے ہیں کہ اسلام ایک انقلابی نظریہ و مسلک کا نام ہے اور دنیا کے تمام ظالمانہ اور مفسدانہ نظامات کو مٹا کر ان کی جگہ اپنا ایک اصلاحی پروگرام نافذ کرنا چاہتا ہے اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا حقیقی مدعا و مقصود یہی ہے اس لئے وہ مسلمانوں کو یہی مقصود و مدعا سمجھاتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ خدا ان کی ہی مدد کیا کرتا ہے جو دستِ سوال نہیں بلکہ دستِ طلب بڑھائیں سروری و جہانبانی انہی کے لئے ہے جو جدوجہد اور سعی کرتے ہیں اور جانی اور مالی قربانیاں کرنا اور پہاڑوں سے ٹکرا جانا جانتے ہیں جو زمانہ کی رو کے ساتھ ساتھ نہیں بہتے بلکہ نامساعد حالات اور ناموافق ماحول کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں۔ اسی لئے وہ کہتا ہے ؎

حدیث بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

اس مقام پر پہنچ کر اقبال دیکھتا ہے کہ قریب قریب اسلام کے تمام نام نہاد مفکر اور کشتیٔ مسلم کے ناخدا اس چیز کو بھولے ہوئے ہیں کہ اسلام ایک انقلابی نظریہ و مسلک ہے اور وہ زمانہ سے جنگ آزما ہونے کے بجائے قوم کو یہ درس دے رہے ہیں "چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر" کی یہ دیکھکر اس کے سینہ سے اک آہ نکلتی ہے اور وہ چیخ اٹھتا ہے ؎

چنیں دور آسمان کم دیدہ باشد کہ جبریل امیں را دل خراشد
چہ خوش دیرے بنا کردند آنجا پرستد مومن و کافر تراشد

وہ اسلام کے رہنماؤں کو ایک لاہوتی ڈانٹ دیتا ہے ؎

فتادی از مقام کبریائی حضور دوں نہاداں سر نہادی

سجودے آوری دارا و جم را کنی اے بے خبر رسوا حرم را

مسلمانوں کے جو زعماء انگریز کی گود میں سو جانا چاہتے ہیں، اُن سے کہتا ہے ؎

مبر پیشِ فرنگی حاجت خویش زطاقِ دل فرو ریز ایں صنم را

ان کے مقابلہ میں جو لوگ اپنے آپ کو کانگریس کے رحم و کرم پر چھوڑ رہے ہیں، اُن سے پوچھتا ہے ؎

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

جب ان سیاسی قائدوں کا جائزہ لے کر وہ صوفی و ملا کی بارگاہِ عالی میں پہنچتا ہے تو اُسے نظر آتا ہے کہ اللہ والے عزلت و تنہائی کے گوشوں میں بیٹھے ہوئے نذر و نیاز کے سلسلہ میں مگن ہیں اور حال و قال و سماع و نغمہ کی محفلیں گرم ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ دوسروں کو بھی دنیا کی جدوجہد میں حصہ لینے کے لئے روک رہے ہیں، زندگی کی کشمکش سے ڈرے بیٹھے ہیں اور ہاتھ پاؤں توڑ کر ایک جگہ بیٹھ رہنے کی تلقین کر رہے ہیں۔ جب وہ ان اللہ والوں میں بھی مردِ مومن کی نگاہ اور مسلم کا عزم و ہمت نہیں دیکھتا تو ان سے بھی بیزار ہو جاتا ہے اور کہتا ہے ؎

نہ با صوفی نہ ملا نشینم تو میدانی کہ من آنم نہ اینم

نویس اللہ بر لوحِ دِل من کہ ہم خود را ہم او را فاش بینم

جو لوگ ان جبہ پوشوں کی عقیدت و ارادت کے چنگل میں پھنس کر اپنی دنیا اور آخرت برباد کر رہے ہیں، ان کی آنکھیں کھولنے کے لئے کہتا ہے ؎

نماز و روزہ و قربانی و حج — یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

آہ! اسلام کی وہ روح و حقیقت کہاں جس کا سبق لا الٰہ الا اللہ میں دیا گیا ہے ؎

قلندر جز دو حرف "لا الٰہ" کچھ بھی نہیں رکھتا — فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

پوری قوم کو اپنے مقام سے یوں گرا ہوا دیکھ کر ہمارا شاعر مایوس نہیں ہوتا۔ بلکہ کہتا ہے ؎

اگر کوئی شعیب آئے میسر — شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

وہ شعیب سے بھی کہتا ہے کہ راہی کی کم کوشی دیکھ کر مایوس نہیں ہونا چاہیئے ؎

نومید نہ ہو ان سے اے رہبر فرزانہ — کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

بلند خیال اقبال راہی کی کم کوشی سے مطلق ہراساں نہیں ہوتا۔ کہتا ہے

جہاں نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالم پیر مر رہا ہے — جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے — وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

آہ! آج اقبال ہم میں نہیں جس نے ہمیں درس توحید دے کر ہماری ہمتوں کو یوں بلند کیا تھا اور صراط مستقیم سمجھائی تھی۔ ہاں دو چار ایسے مردان حق آگاہ ہماری قوم میں اب بھی موجود ہیں جو تند و تیز ہواؤں میں اپنے چراغ جلائے ہیں۔ اب اگر قوم کی فطری صلاحیتیں بالکل ہی مفقود نہیں ہو گئی ہیں تو اُن مردانِ کامل کو ڈھونڈھے۔

ان میں سے ایک گرانمایہ ہستی حضرت مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی مدظلہ العالی کی ہے، جو افق پنجاب پر لمعہ فگن ہے۔ جن لوگوں کو مولانا کی فکری اور اسلامی صلاحیتوں کا علم ہے، ان کے لئے بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ مولانا موصوف کو اس زمانہ میں اسلام کی صحیح خدمت اور ملت کی تجدید کے لئے بہرۂ وافر ملا ہے۔ آپ جس شرح صدر، اسلامی بصیرت اور تفقہ فی الدین کے ساتھ اس مغربی الحاد کے دور میں ہر چیز کا صحیح ادراک کر کے قرآن پاک کی روشنی ہر مرض کا تریاق مہیا

کررہے اور کتابِ الٰہی کی روشنی سے تاریک دلوں کو منور کررہے ہیں۔ نہ معلوم آپ کی حکیمانہ دعوت نے ہندوستان کے کتنے مسلمانوں کو شعوری مسلمان بنایا ہوگا اور میری طرح کتنے مسلمانوں کی زندگیوں کو صراطِ مستقیم پر لگایا ہوگا۔

کاش مسلمانانِ ہند اس بطلِ جلیل کی آواز کو سنیں اور پروانہ وار اس کے گرد جمع ہو جائیں؛ اگر ایسا ہو تو یقین کیجئے کہ بس مسلمانانِ ہند کا بیڑا پار ہے۔

خلاصہ مافی الباب یہ کہ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کو لا الٰہ الا اللہ کی تفسیر کتابوں میں پڑھنے کی ضرورت نہیں، ان کے نزدیک شہادتِ حسینؓ اس کلمۂ طیبہ کی زندہ تفسیر ہے۔ امام عالی مقام نے اپنے طرزِ عمل سے مسلمانوں کو اس کلمہ کے حقیقی معنے سے آگاہ کر دیا اور وہ یہ نہیں؛ کہ خدا کے سوا کسی کی اطاعت نہ کرو، خدا کے سوا کسی سے مت ڈرو۔ جو تم کو خدا کی اطاعت سے ہٹانا چاہے اس کا مقابلہ کرو اور جان تک دیدو۔ یہی توحید کے حقیقی معنے ہیں ؎

نقش الا اللہ بر صحرا نوشت   سطرِ عنوانِ نجاتِ ما نوشت

بس اس میں مسلمانوں کی عظمت کا راز مضمر ہے اور یہی نجاتِ اخروی کی کنجی ہے علامہ اقبالؒ نے اس نکتہ کو دو لفظوں میں یوں سمجھا دیا ہے ؎

عاشقی توحید را بر دل زدن
وانگہے خود را بہر مشکل زدن

اقبال کی الہیات کا مجمل خاکہ

(جناب مولانا عبد السلام خاں صاحب رامپوری)

(۲)

کائنات ارتقائی حرکت ہے مگر یہ حرکت ضرورتِ ذات کی بنا پر محض جبری نہیں اور نہ بے غایت اور بے مقصد ہے۔ ہاں کائنات کا اس معنی میں کوئی مقصد نہیں کہ اُس کے لئے کوئی آخری طے شدہ نصب العین ہو اور کائنات وہاں پہنچ کر ٹھہر جائے کیونکہ اس صورت میں فعلیتِ مطلقہ کے غیر متناہی امکانات اور عالم کے ابداً و ازلاً مستمر ہونے کے کوئی معنی نہ ہوں گے اور نہ اس معنی میں وہ مشینی اور جبری حرکت ہے کہ مخصوص اصول و قواعد یا سلسلۂ علل کے مطابق حرکت کر رہی ہے بلکہ تخلیق آزاد ہے اس کے لئے کوئی خارجی اصول و قواعد یا علل و اسباب کا سلسلہ نہیں اور نہ کوئی طے شدہ منصوبہ ہے۔ جس کے ماتحت وہ مجبوراً بڑھی چلی جا رہی ہے۔ اُس کی ہر فعلیت اپنی اندرونی رسائی اور صلاحیت کے ماتحت ہے۔ جس میں کسی خارجی شے کو دخل نہیں ہے۔ وہ اس معنی میں بامقصد ہے کہ نقصان سے کمال کی طرف اور کمال سے اکملیت کی طرف جاری اور سیال ہے اور اسی طرح برابر جاری اور سیال رہے گی۔

فطرتِ ہستی شہید آرزو رہتی نہ ہو — خوب تر پیکر کی اُس کو جستجو رہتی نہ ہو

زندگی کا شعلہ اس ذرہ میں جو مستور ہے — خود نمائی خود فزائی کے لئے مجبور ہے

اس مستمر ارتقائی حرکت اور حیاتیاتی فعلیت کا ماضی اور حال جانب مستقبل کے اُن خالی امکانات کی جو اس فعلیت و حرکت کی ذات اور بطن میں مضمر ہیں مخصوص شکلوں میں تشکیل کرتا ہے اور ان کے لئے خاص خاص فعلی سمتیں مقرر کرتا ہے۔

باشعور وارادہ خلاق فعلیت یا خدا | جیساکہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کائنات ایک مستمر تخلیقی اور ارتقائی حرکت ہے۔ اس کے پس پشت ایک تخلیقی اور ارتقائی خواہش وارادہ ہے جو ازلاً و ابداً مستمر ہے۔ اس لئے کہ یہ تخلیقی خواہش وارادہ کائنات سے الگ اور اُس سے ماورا کوئی وجود نہیں رکھ سکتا۔ کائنات سے الگ اور ماوراہستی رکھنے کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ غیر متناہی فضا میں یہ دونوں ہستیاں الگ الگ مقام رکھتی ہوں یا یہ کہ دونوں میں کوئی خاص زمانی فصل ہو یا یہ کہ ایک کی حیثیت روحانی ہو اور دوسری کی مادی۔ حالانکہ مکان، زمان اور مادہ تینوں ہمارے ذہنی اور فکری عوارض ہیں جن کو ہمارا تفکر فعلیت یا تخلیقی حرکت کے سر منڈھ دیتا ہے

خرد ہوئی ہے زماں و مکاں کی زناری نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ

یہ تخلیقی حرکت یا تخلیقی استمرار اپنے بطن اور حقیقت کے اعتبار سے ایک قسم کی عضوی وحدت ہے جس میں شعور، حیات اور مقصد باہم سوئے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کی فعلیت یا کسی ایک کا کامل تصور دوسرے کی فعلیت اور تصور کے بغیر ناقابل فہم ہے۔ اقبال اس عضوی وحدت کو خدا کہتے ہیں۔ یہ عضوی وحدت ایک انفرادیت ہے جو دوسری انفرادیتوں کی نسبت سے زیادہ مکمل ہے۔ انفرادیت کے مکمل ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اُس سے تولید مثل ممکن نہ ہو کیونکہ تولید مثل کے لئے عضوی اجزا کا افتراق اور ایک دوسری مستقل عضویت میں صورت پذیر ہونا ضروری ہے۔ جو کامل انفرادیت اور شخصیت کے منافی ہے چنانچہ یہ عضوی وحدت بھی اپنے مثل کی تولید نہیں کر سکتی۔

اگر کائنات کی توجیہہ محض تخلیقی حرکت اور ارتقائی استمرار سے کی جائے اور مرکزیت اور اجتماعیت کے تصوّر کو اس سے کلیتہً خارج کر دیا جائے جیسا کہ برگسان کا خیال ہے تو کائنات کے نظم اور اُس کی مقصدیت کی کوئی وجہ نہیں رہے گی۔ کائنات کی حیثیت محض ایک بے نظم بے مقصد سیلان اور بہاؤ کی رہ جائے گی۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ کائنات کے لئے ایک اصول اور وحدت ہو جو اس کو منظم کرے اور کسی خاص مقصد کی طرف اُس کے رخ کو پھیرے رکھے۔ اس فعلیت اور حرکت میں یہ تنظیم اور مقصدیت بلا اس کے پیدا نہیں ہو سکتی کہ اُس کے لئے مرکزیت اور اجتماعیت کے تصور کو تسلیم کیا جائے۔ اسی مقصدیت اور اجتماعیت یا جامع کا نام "خودی" اور "انا" ہے۔ گویا خدا کو "انا" یا خودی سے تعبیر کرنا کائنات کے لئے ایک خاص مقصد کی طرف پھیرنے والا تنظیمی اصول اور جامع تسلیم کرنا ہے۔ نہ کہ خدا کو انسان سے تشبیہہ دینا یا اس کو انسانی شکل میں فرض کرنا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کائنات عضویتوں کے اجتماع کا نام ہے جن میں سے ہر عضویت ایک مستقل انفرادیت یا خودی اور "انا" ہے۔ یہ عضویتیں اور انا اُس فعلیتِ مطلقہ کے افعال ہیں جس کو الوہی "انا" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ وحدتیں ممتاز ہیں۔ باہم بھی اور الوہی انا کے اعتبار سے بھی مگر ان کا امتیاز اضافی ہے بخلاف الوہی "انا" کے کہ اُس کا امتیاز ذاتی ہے۔ الوہی انا جیسا کہ گزشتہ بیان سے واضح ہے اجتماعی اور مرکزی حیثیت ہے اُس پوری فعلیت کی جو پوری کائنات میں ازل سے ابد تک جاری اور مستمر ہے۔ اگر اس فعلیت اور حیاتِ مطلقہ یا تخلیقی حرکت کو اُس کی اپنی ذات یا انفرادیت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو کسی دوسری چیز کی ہستی باقی نہیں رہتی بلکہ محض وہی وہ ہستی رہ جاتی ہے۔ بنا بریں اس کا اپنا ذاتی امتیاز کسی دوسری شے پر موقوف بھی نہیں ہو سکتا اُس کا امتیاز اور تشخص اور تعین "حکمِ عینیت" کی بنا پر ہوتا ہے یعنی وہ ممتاز متشخص اور متعین ہے اس لئے کہ وہ خود وہ ہے۔ اُس کے متعلق سلبِ غیر اور نفی ماسوا کا حکم نہیں کیا جا سکتا

یعنی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنے علاوہ کوئی دوسری چیز یا انانیت نہیں کیونکہ اُس کے ذاتی وجود کے مرتبہ میں کسی دوسری چیز کا وجود نہیں۔ اگر کوئی دوسری انفرادیت ہوتی تو یہ کہنا صحیح ہوتا کہ فعلیتِ مطلقہ ایک انانیت ہے اور یہ دوسری انفرادیت ایک دوسری انانیت ہے۔ جو فعلیتِ مطلقہ کے علاوہ ہے اور یہ فعلیتِ مطلقہ بذاتہ یہ دوسری انفرادیت نہیں۔ خلاصہ یہ کہ بحیثیتِ ذات فعلیتِ مطلقہ کا امتیاز و تعین عینیت یعنی خود اپنے عین ہونے سے متعلق ہے۔ لاغیریت یا اپنے غیر نہ ہونے سے متعلق نہیں۔ اسی وجہ سے یہ "انا" مطلق اور کامل ہے۔ دوسری انفرادیتیں یا دوسرے "انا" جو اس فعلیت مطلقہ کے افعال ہیں متعین اور ممتاز وحدتیں ہیں لیکن ان انفرادیتوں میں سے کسی انفرادیت کو بھی اُس کی ذاتی حیثیت میں لیا جائے دوسری انفرادیتوں کی ہستی ختم نہیں ہوتی بلکہ دوسری انفرادیتیں بھی اسی طرح مستقل ہستی رکھتی ہیں لہذا اُن کے باہمی امتیاز کے لئے لاغیریت کا حکم یا اُن سے اُن کے غیر کی نفی ضروری ہے۔ ہر انفرادیت اس لئے ممتاز ہے کہ وہ اپنے علاوہ کوئی دوسری انفرادیت نہیں۔ اُس کے مرتبۂ ذات میں منفی طور پر دوسری انفرادیتیں بھی ملحوظ ہیں جو اُس کو متعین اور متشخص کر رہی ہیں۔ بنا بریں اُن کا امتیاز اضافی ہے۔ ایسے "انا" یا انفرادیت کو اضافی "انا" یا اضافی انفرادیت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

یہ فعلیت مطلقہ یا حیاتِ مطلقہ اور خواہشِ تخلیق اپنی ذات کے اعتبار سے ثابت ہے اور اپنی فعلیت اور تخلیق کے اعتبار سے سیال و رواں۔

شیوہ ہائے زندگی غیب و حضور ان یکے اندر ثبات آں در مرور

جلوتِ او روشن از نورِ صفات خلوتِ او مستنیر از نورِ ذات

چوں ز خلوت خویش را بیروں دہد پائے در ہنگامۂ جلوت نہد

حیات مطلقہ کی خواہشِ ظہور کا نام ہی تخلیق ہے چنانچہ اُس کی خواہشِ ظہور و تجلی ہے

جو عالم یا کائنات کی شکل میں جلوہ گر ہے بلکہ اُس کی حیات اور فعلیت ہونے کے معنی ہی اپنے آپ کو ظاہر کرنا ہے۔

زندگی از لذتِ غیب و حضور بست نقش ایں جہانِ نزد و دور
خدائے زندہ بے ذوقِ سخن نیست تجلی ہائے او بے انجمن نیست

خدا اس معنی میں غیر محدود نہیں کہ وہ غیر متناہی خلار میں پھیلا ہوا ہے بلکہ اپنے بطون واندرون کے اعتبار سے ایک انفرادیت اور متعین اور متشخص ہستی ہے اور اس لحاظ سے نہ کہ محدود خلار میں پھیلے ہونے کے لحاظ سے) محدود ہے۔ہاں اپنے بیرون و ظہور کے اعتبار سے بایں معنی غیر محدود ہے کہ اُس کے تخلیقی امکانات کی کوئی حد نہیں جن کے فعلیت میں آ جانے کے بعد اُس کی تخلیقی قوت منقطع ہو جائے۔"كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ" کے مطابق اُس کی شئون غیر متناہی ہیں ہر شان فعل ہے اور ہر فعل خلق۔

حقیقت لازوال و لامکاں است مگو دیگر کہ عالم بیکران است
کران او درون است و بروں نیست درونش پست و بالا کم فزوں نیست

ذات الٰہی اپنے اندرون اور بطون یا ذات کے اعتبار سے غیر متغیر ہے یعنی اس میں سے نہ کوئی چیز کم ہو رہی ہے اور نہ کوئی چیز زیادہ۔ وہ اپنی ذات میں "الآن کما کان" ہے اور اسی طرح رہے گی۔اس معنی میں متغیر ہے کہ اُس کی بیرونی اور فعلی حیثیت برابر ظاہر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اُس کے تخلیقی امکانات مسلسل اور متواتر بلا انقطاع کھلتے چلے جا رہے ہیں اور افعال یا ذوات اور عضویتیں پیدا ہوتی جا رہی ہیں۔

درونش خالی از بالا و زیر است
ولے بیرونِ او وسعت پذیر است

مکان | ہمارا تفکر کائنات کو اُس کی مجموعی اور کلی حیثیت میں گرفت نہیں کرسکتا اور نہ اُس کے تواتر، تسلسل اور سیلان کا تصور کرسکتا ہے۔ فکری مطالعہ کے لئے چیزوں کا جامد اور پارہ پارہ ہونا ضروری ہے۔ ہمارے تفکر کے پیشِ نظر جب چیزیں اپنی ظہوری حیثیت میں جامد اور منقطع ہوجاتی ہیں تو ان میں باہم اضافتیں اور تعلقات پیدا ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ جہاتِ شش گانہ جن سے مکان کا تصور پیدا ہوتا ہے انہیں تعلقات اور اضافتوں کی معلول ہیں۔ بالا و پست، پیش و پس اور چپ و راست کے تصور کا عروض کسی چیز کو دوسری چیزوں کے اعتبار سے ہی ہوسکتا ہے کوئی دوسری چیز نہ ہو تو شے کے اُس کی ذاتی حیثیت میں اوپر یا نیچے، آگے یا پیچھے اور داہنے یا بائیں ہونے کے کوئی معنی نہیں۔ خود خلاء کا تصور بھی حقیقتاً اشیاء کی ہی منفی حیثیت کا ساختہ اور پرداختہ ہے گویا مکان کی حیثیت ایک ذہنی عارض اور فکری سانچہ کے مانند ہے جس کے ساتھ ہم اشیا پر غور کرتے ہیں۔ یا یوں کہا جائے کہ وہ ایک قسم کا ذہنی انتزاع ہے جو منفرد اور منقطع اشیا کے باہمی تعلقات اور اُن کی اضافتوں سے حاصل ہوتا ہے۔

حقیقت اپنی آنکھوں پر نمایاں جب ہوئی اپنی — مکاں نکلا ہمارے خانۂ دل کے مکینوں میں

خود ذات کے بطن اور اندروں سے اُس کو کوئی تعلق نہیں۔ وہ اُس کے محض ظاہر اور بیرون سے متعلق ہے اور وہ بھی ہماری فکری اور ذہنی ساخت کی خصوصیت کی وجہ سے۔

خرد در لامکاں طرحِ مکاں بست		چو زنارے زماں را بر میاں بست

چنانچہ ہماری فکری ساخت اور ذہنی زاویۂ نظر میں کوئی تبدیلی رونما ہوجائے یا اشیاء کی اضافی حالت میں کوئی ناقابلِ فہم انقلاب پیدا ہوجائے تو ہمارے مکانی تصورات اور نزدیک و دور کے متعلق ہمارے مفروضہ خیالات میں یکسر انقلاب پیدا ہوجانا مستبعد نہیں

جہانِ طوسی و اقلیدس است ایں		پئے عقل زمیں فرسائش است ایں

زمانش ہم مکانش اعتباری است　　　زمین و آسمانش اعتباری است

از شعور است ایں کہ گوئی نزد و دور　　　چیست معراج انقلاب اندر شعور

احوال و مقامات پہ موقوف ہے سب کچھ　　　ہر لحظہ ہے سالک کا زماں اور مکاں اور

ذات و زماں | اقبال کے نظام فلسفہ میں زمانے کے دو تصور ہیں اور یہ دونوں اُن کے تصور ذات سے ماخوذ ہیں۔ اگر ہم اپنی ذات یا نفس پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ذات اپنی باطنی اور اندرونی حیات میں ایک مرکز سے باہر کی جانب ابل رہی ہے۔ جو امکانات اور استعدادیں اُس کے باطن میں موجود ہیں وہ فعلی حیثیت میں ظاہر ہو رہی ہیں۔

گر نظر داری یکے بر خود نگر　　　جز رم پیہم نۂ اے بے خبر

ذات جو اپنی اصلی حقیقت کے اعتبار سے ایک عضوی وحدت ہے اپنے اظہار میں افعال کثیرہ کو پیدا کر رہی ہے۔ ذات کی یہ مرکزی حیثیت اور عضوی اجتماعیت اُس کا اندرونی اور باطنی رخ ہے۔ یہ رخ تاثیر محض اور بقائے خالص ہے۔ اس میں ذات کے تمام افعال اور تخلیقیں خفتہ امکانات کی صورت میں بسیط طور پر موجود ہیں۔ ذات کا دوسرا رخ اُس کا ظاہری اور بیرونی پہلو ہے۔ یہ کاروباری رخ ہے اور اظہار ہے اُن خفتہ امکانات اور استعداد ذات کا جو باطن میں موجود ہیں۔ اشیا اور اُن کی کثرت اُن کے تعلقات اور اضافات اُن کے نظام اس پہلو سے متعلق ہیں۔ اشیا اور افعال کو وضعی اور حِسّی امتیاز اس رخ کے اعتبار سے عارض ہوتا ہے۔

ذات کے ان دونوں رخوں کے اعتبار سے زمانے کے دو رُخ ہو جاتے ہیں۔ باطنی اور ظاہری۔ زمانے کا اندرونی یا وہ رخ جو ذات کی اصلی اور باطنی حیثیت سے متعلق ہے استمرار محض اور بقائے خالص ہے اور بیرونی اور وہ رخ جو ذات کی خارجی اور کاروباری حیثیت سے متعلق ہے مکانی یا وضعی زمان ہے۔

مکانی زمان | زمانے کا عام مفہوم جس کے اعتبار سے اشیا اور افعال کے قبل، بعد یا معاصر ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور جس میں قبلیت اور بعدیت کبھی مجتمع نہیں ہوتیں، جو ماضی ہے وہ حال نہیں جو حال ہے وہ استقبال نہیں۔ اقبال کے نزدیک مکانی زماں ہے یہ ایک قسم کا تعاقب اور تسلسل ہے جو اشیاء و افعال کو عارض ہوتا ہے۔ زمانہ اپنے اس تصور کے اعتبار سے ایک تقسیم پذیر کمیت ہے جو مختصر اور طویل ہو سکتی ہے ہماری عام کاروباری زندگی میں اس تصور کا اعتبار ہے۔ ہمارا ذہن چیزوں کو اس زمانی ظرف کے اندر ہی گرفت کر سکتا ہے۔ اس سے الگ ہو کر کسی چیز کے تصور کرنے کے کوئی معنی نہیں گویا زمانہ اپنے اس تصور کے اعتبار سے اشیا اور افعال کے لئے لازمی ذہنی لازمہ ہے۔ اشیا اور افعال کے تقدمی، تاخیری اور معاصرانہ تعلقات اور اضافتیں، اُن کا حدوث و قدم اسی تصور کے تحت متعین کئے جاتے ہیں۔ کائنات میں علت اور معلول کا رابطہ یا محض وجودی تصاحب و توافق زمانے کے اس مفہوم کا اختراع ہے۔ ریاضیات میں جس زمانے سے بحث کی جاتی ہے وہ بھی یہی ہے۔ زمانے کے اس تصور کو اقبال غیر حقیقی اور اعتباری زمان کہتے ہیں۔

قدیم و محدثِ ما از شمار است شمارِ ما طلسمِ روزگار است

اُن کے نزدیک اس زمانے کو ذات کے بطن سے کوئی علاقہ نہیں۔

فعلیت اپنی اندرونی ذات کے اعتبار سے ایک اجتماعی وحدت ہے جو اپنے آپ کو ظاہر کرتی رہتی ہے اور اُس کے خفتہ امکانات اس عالم کیف و کم میں ظہور پذیر ہوتے ہیں تو اُنہیں مختلف قسم کے تعلقات عارض ہوتے ہیں جیسا کہ گزر چکا ہے یہ تعلقات اور اضافتیں ذاتِ اشیا سے بالکل جدا ہیں جن کا عروض اشیا کو اُن کی جمودی اور مفترق اور متکثر حیثیت سے ہوتا ہے حالانکہ اصلِ ذات نہ جامد ہے اور نہ مفترق و متکثر ہے بلکہ متحرک، سیال اور

واحد ہے۔ ذات کو اس ظہوری اور بیرونی رخ کے اعتبار سے حیثی اور وضعی امتیاز لاحق ہوتا ہے جس کی مکان سے تعبیر کی جاتی ہے چونکہ ذات کا یہ رخ اپنے آپ سے باہر ہے اگر اس کو مجموعی حیثیت میں لحاظ کیا جائے تو وہ مسلسل متعاقب اور متعین حالتوں کا مجموعہ ہوگا۔ اس مجموعے کو اس کے مکانی تعاقب اور تسلسل کی بنا پر ایک دوسری قسم کا تعاقب و تسلسل اور تعین عارض ہوجاتا ہے۔ یہ زمانی تعاقب ہے۔ اقبال کے نزدیک اس قسم کے تعاقب و تعین کا اشیاء کے وضعی اور مکانی تعاقب اور حیثی امتیاز و تعین سے انتزاع ہوتا ہے۔

در گلِ خود تخمِ ظلمت کاشتی وقت را مثلِ خطے پنداشتی

باز با پیمانۂ لیل و نہار فکرِ تو پیمود طولِ روزگار

وقت را مثلِ مکاں گستردۂ امتیازِ دوش و فردہ کردۂ

ایک متحرک اثنار حرکت میں مختلف مکانی نقطوں سے گزرتا ہے۔ اس حرکت اور مرور کے درمیان میں اپنے مختلف مکانی نقطوں یا مکانی حدود پر پہنچنے کے اعتبار سے اس کو مختلف چیزوں کے ساتھ مختلف وضعیں حاصل ہوتی ہیں۔ اسی طرح ان چیزوں کو بھی اس متحرک کے اعتبار سے مختلف وضعیں لاحق ہوتی ہیں۔ ان کی وضعوں سے زمانے کا عام تصور ماخوذ ہے جس سے اشیا کی محض وضعی معاصرتیں دریافت ہوسکتی ہیں اور وہ بھی اشیا کو جامد اور پارہ پارہ کر لینے کے بعد۔ گویا زمانہ ایک ذہنی خطِ مستقیم ہے جو مختلف مکانی حدود اور وضعی نقاط پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ پہلے گزر چکا ہے کہ مکان خود محض ایک فکری انتزاع ہے جس کو اصلیت سے کوئی تعلق نہیں۔ لہذا اس قسم کے زمانے کی حیثیت بھی ذہنی لازم اور فکری انتزاع سے زیادہ نہ ہوگی۔ مکان اور زمان کا یہ مفہوم ذات کے اعتبار سے ایک واحد حالت ہے جو ذات کو اس کے خارجی رخ کے اعتبار سے باہمی تعلقات اور اضافتوں کا لحاظ ک

کے عارض ہوتی ہے۔

چشم بکشا بر مکان و بر زماں ایں دو یک حال است از احوالِ جاں

ذات کی اصلی حیثیت اور اس کے بطن کو ہماری کاروباری زندگی سے تعلق نہیں۔ کاروبار میں ذات کی ظہوری اور خارجی حیثیت ہی کا اعتبار ہے۔ جب تک اشیا اپنی امکانی اور استعدادی حیثیت سے نکل کر عالم کم و کیف میں نہ آجائیں اُس وقت تک اُن پر خارجی احکام کے کوئی معنی نہیں۔ لہٰذا ہماری خارجی زندگی میں ذات کا بطن ہماری آنکھوں سے اوجھل رہتا ہے اور اس کی صرف ظاہری اور مصنوعی حیثیت ہی سامنے آتی ہے۔ چنانچہ ہماری توجہ کو اپنی طرف منعطف رکھنے والا بھی زمانے کا یہی غیر اصلی تصور ہوتا ہے۔

تن ز رسم و راہِ جاں بیگانہ ایست در زماں واز زماں بیگانہ ایست

استمرار محض | یہ گذر چکا ہے کہ ذات یا "انا" فعلیت کی ترکائفی حالت کا نام ہے جو ایک قسم کی عضوی وحدت ہے۔ اس میں اُس فعلیت کے تمام مظاہر بسیط شکل میں باہم دیگر تحلیل ہیں۔ ذات عالِم کون و فسا د میں کھلتی جارہی ہے۔ اور اس کے وہ تمام مظاہر جو بالقوہ حیثیت میں سموئے ہوئے ہیں بالفعل حیثیت اختیار کرتے جارہے ہیں۔ بالقوہ مظاہر کا بالفعل حیثیت کو اختیار کرنا ہی خلق اور اظہار ہے۔ اس خلق اور اظہار سے تکثر اور تعلقات اور اضافتیں حاصل ہوتی ہیں۔ یہ ظہور اور خلق ظاہر ہے کہ تدریجی اور متعاقب صورت میں ہی ہوتا ہے۔ اگر یہ تدریج اور تعاقب و تسلسل ذات کے اندر اپنے بسیط امکانات کی شکل میں موجود نہ ہوں تو پھر تدریجی اور متعاقب خروج کے کوئی معنی نہیں اس اندرونی ذات میں جس طرح اور تمام فعلیتیں بسیط شکل میں موجود ہیں اس طرح کہ اُن میں نہ جہتی و وضعی امتیاز ہے اور نہ کسی تحدید کیونکہ اگر اندرون ذات میں فعلیتیں حساً اور وضعاً ممتاز ہوں اور ہر فعلیت

الگ الگ مقام اور الگ الگ کمیت رکھتی ہو اور حس ایک کو دوسرے سے متمیز کر سکے تو اندرونِ ذات میں بالفعل تکثر اور بالفعل تعلقات اور اضافتیں موجود ہو جائیں گے اور خروج کے کوئی معنی نہ رہیں گے۔ خروج کے معنی یہی ہیں کہ اشیا ان تعلقات اور اضافات اور اوضاع اور امکنہ کی معروض ہو جائیں۔ ذات کے اندر فعلیتوں میں امتیاز ہے مگر کیفی یعنی ذات مختلف اور متکثر کیفیتوں کی حامل ہے جن میں سے ہر کیفیت دوسری سے ممتاز ہے۔ ایک خاص کیفیت ایک خاص ہی فعل میں اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ کیفیت جو کسی خاص فعل سے مخصوص ہے عالم خارجی میں کسی دوسرے فعل میں صورت پذیر نہیں ہو سکتی کیونکہ کیفیات ذاتی طور پر کوئی خاص وضع اور مقام نہیں رکھتیں لہٰذا وہ متداخل اور بسیط صورت میں ذات میں رہ سکتی ہیں۔ یہ تغیرات اور حرکتیں اندرونی طور پر نہ منفرد ہوتی ہیں نہ یکے بعد دیگرے مسلسل۔ جیسا کہ گزر چکا ہے یہ کیفیتیں حقیقتاً امکانات اور استعدادیں ہیں جو مخصوص افعال سے مختص ہیں۔ اندرونِ ذات میں یہی حالت زمان اور وقت کی ہے کہ ذات کے اندر یہ بھی اپنی بسیط شکل میں متداخل ہے۔

یہ زمانہ استمرار محض اور لقائے خالص ہے جس پر مکان اور وضع کا کوئی اثر نہیں چونکہ یہ بسیط وحدت کی شکل میں ہے لہٰذا اُس کے زمانے کو ایک "اب" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس اندرونی "اب" کو ذات کا کاروباری اور خارجی رخ مکانی عالم میں "اب" کی ایک کثیر اور تدریجی و متعاقب مقداروں میں تحلیل کر دیتا ہے یہ "اب" اور ایک بسیط "آن" عالم خارجی کے ہزاروں سال میں اپنے آپ کو ظہور پذیر کر سکتی ہے۔ یہ استمرار محض یا حقیقی زمانہ لمحات کا علیحدہ علیحدہ اور پے بہ پے سلسلہ نہیں بلکہ ایک عضوی کل ہے جس میں ماضی پیچھے چھوٹ جانے کے بجائے برابر آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ مستقبل آگے کو بڑھی ہوئی چیز نہیں بلکہ ایک کھلے ہوئے امکان کی صورت میں موجود ہے۔ ماضی اور مستقبل دونوں مل کر حال پر اثر انداز ہوتے ہیں اس حقیقی

زمانے میں ہونے کے معنی تدریجی زمانے کی پابندی نہیں بلکہ اُس کے تدریجی اور متعاقب لمحات کی تخلیق ہے۔ یہ بذاتہٖ ایک خلاق فعلیت ہے غیر متعاقب و غیر مسلسل۔ اس کا بالفعل حیثیت میں وجود تدریجی زمانے کی اور ساتھ ساتھ دوسری چیزوں کی تخلیق اور اظہار ہے۔

زندگی سرّیست از اسرارِ وقت این و آں پیداست از رفتارِ وقت

وقت جاوید است و خور جاوید نیست اصلِ وقت از گردشِ خورشید نیست

"لاتسبوا الدھر" فرمانِ نبی است زندگی از دہر و دہر از زندگی است

جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ

تقدیر | استمرار عضوی کل اور بسیط وحدت کی حیثیت میں تقدیر ہے۔ اس عضوی کل یا تقدیر میں تمام افعال اور اشیا اپنی ذاتی صلاحیتوں اور ارتقائی امکانات کی صورت میں محفوظ رہتے ہیں اور انہیں مخصوص استعدادوں کے تحت اُن کا ظہور اور خلق ہوتا ہے۔ کیونکہ کوئی شے اپنی خارجی اور ظہوری حیثیت میں اُس استعداد سے آگے یا پیچھے نہیں رہ سکتی جو اُس کی ذاتی ہے۔ تقدیر کے متعلق یہ تصور کہ وہ ایک طے شدہ قسمت ہے جو چیزوں پر اُن کی ذات کے علاوہ کسی خارجی سبب کی وجہ سے مسلط ہو جاتی ہے اور چیزیں اُس خارجی دباؤ اور منصوبے کے تحت مجبور ہوتی ہیں ایک غلط تصور ہے۔ حقیقتاً تقدیر خود اُس شے کی ذاتی اہلیت اور اُس کی اندرونی رسائی کی آخری حد ہے۔ چیزوں کی حالیہ حیثیتیں خود اُن کے ماضی اور مستقبل کے امکانات کی ذخیرہ ہیں۔

کار ہا پابندِ آئین بود ہ شد اے کہ گوئی بودنی ایں بود شد

نے خودی را نے خدا را دیدۂ معنیٔ تقدیر کم فہمیدۂ

بعد ازیں جا تیر او تیرِ حق است عزم او خلاقِ تقدیر حق است

مزید براں ذاتی امکانات بھی محدود نہیں۔ بلکہ غیر محدود ہیں۔ اُن کا خارجی تعین یا دوسُوں کی بیرونی تحدید بھی اصل شے سے متعلق نہیں۔

تو اگر تقدیر نو خواہی رواست	زانکہ تقدیراتِ حق لا انتہاست

یہ صحیح ہے کہ عالمِ خارجی میں ان غیر محدود امکانات اور لا انتہا استعدادوں کا ظہور کسی نہ کسی محدود اور متعین صورت میں ہی ہوگا۔

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز
جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

یعنی ذات اور اصل فعلیت آزاد اور ابتدائی ہے۔ تقدیر خود اُس کی ذاتی استعداد ہے جس کی کوئی اندرونی تحدید نہیں۔ خارجی حیثیت میں امکانات محدود و متعین صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس لئے زیادہ سے زیادہ اُس کی بیرونی حیثیت کو ہی مجبور کہا جا سکتا ہے۔

چہ مے پرسی کہ چہ گون است و چہ گون نیست
کہ تقدیر از نہادِ او برون نیست

ز جبر او حدیثے در میاں نیست	کہ جان بے فطرتِ آزاد جہاں نیست

ذات اور شعور شعور کا حیات سے تعلق ہے۔ حیات ایک قسم کی روحانی فعلیت ہے۔ بنا بریں شعور بھی۔ زندگی کی تکاثفی اور خود مرکزی حالت کا نام شعور ہے۔ شعور ایک قسم کی روشنی ہے یا یوں کہا جائے کہ وہ ذات میں ایک ایسا روشن نقطہ مہیا کر دیتا ہے جس کی وجہ سے ذات کا آگے کی جانب بہاؤ اور سیلان یا روانی منور ہو جاتی ہے۔ جو افعال ذات سے سرزد ہوتے ہیں یا جو تاثیریں ظہور میں آتی ہیں ذات اُن کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے اور اُس کا میلان اور انعطاف اُس خاص فعل کی طرف ہو جاتا ہے۔ اسی میلان اور انعطاف کی بنا

پر ذات کی روانی اور اُس مخصوص فعل کی طرف اُس کا خروج روشن و منور ہو جاتا ہے ۔ زندگی کے اُس مخصوص جانب تکاثف اور مرکزیت سے ماضی کی وہ تمام یادداشتیں اور ایتلافات ہماری توجہ سے خارج ہو جاتے ہیں جن کو موجودہ فعل سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا اور ایسی تمام یادداشتیں اور ایتلافات سامنے ہو جاتے ہیں جن کو اس فعل سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق ہوتا ہے ۔ یہ پہلے گزر چکا ہے کہ انانیت اور خودی کی قوت و ضعف کا مدار ذات کے اپنے شعور پر ہے گویا انانیت کی یہی عام تکاثفی حیثیت اُس کے عام شعور کا بھی منبع ہے یہی تکاثف اور مرکزیت اگر کسی خاص جانب ہو جائے تو اس شعور کا اُس خاص منبع سے تعلق زیادہ ہو جاتا ہے اور اُس فعل کی طرف اُس کی توجہ میں شدت پیدا ہو جاتی ہے ۔ شعور موقع اور ضرورت کے اعتبار سے پھیل اور سکڑ سکتا ہے اور اس طرح اُس کا احاطۂ تنور چھوٹا اور بڑا ہو جاتا ہے ۔

چونکہ شعور کا تعلق ذات سے ہے اور ذات کی دو حیثیتیں ہیں باطنی اور حقیقی دوسری ظاہری اور کاروباری ۔ ذات کے ان دونوں رخوں کے اعتبار سے خود شعور کی بھی دو حیثیتیں ہیں اندرونی اور باطنی دوسری بیرونی اور کاروباری ۔ پہلی کو بصیرت اور وجدان سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور دوسری کو تفکر سے ۔ اقبال کے نزدیک ان دونوں میں تعقل کے اعتبار سے کوئی نوعی فرق نہیں بلکہ وجدان بھی ایک قسم کا اعلٰے تعقل ہی ہے ۔ دونوں ایک ہی اصل سے پھوٹ رہے ہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں ۔ ایک واقعیت کو پارہ پارہ کر کے گرفت کرتا ہے اور دوسرا اُس کو کلی اور مجموعی حیثیت میں ۔ ایک کا ظاہر سے تعلق ہے دوسرے کا باطن سے ۔ ایک مکان و زمان سے محیط دوسرا غیر محدود و استمرار ۔ ایک فعلیت کو وحدت کی صورت میں ادراک کرتا ہے اور دوسرا اُس کو مختلف شعبوں اور درجوں میں تقسیم کر کے ۔ حیات کے سلسلے میں ہر ایک کا اپنا مستقل کام ہے جس کو وہ اپنی حدود میں انجام دیتا ہے ۔

زیرکی از عشق گردد حق شناس — کارِ عشق از زیرکی محکم اساس

عشق چوں با زیرکی ہمبر شود — نقش بند عالمِ دیگر شود

عقل را او را سوئے جلوت مے کشد — عشق او را سوئے خلوت مے کشد

عقل است چراغ تو در راہ گذارے نہ — عشق است ایاغ تو با بندۂ محرم زن

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات — علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات

مقامِ فکر ہے پیمائشِ زمان و مکان — مقامِ ذکر ہے سبحانَ ربّیَ الاعلیٰ

تفکر: تفکر (بشرطیکہ اُس میں وجدان کو شامل نہ کیا جائے) اگرچہ اپنی اندرونی ذات کے اعتبار سے ایک غیر محدود کل ہے مگر چونکہ اپنی بیرونی صورت میں مکانی زماں کے ساتھ مطابق ہو جاتا ہے لہذا کائنات کو اُس کی کلی اور غیر محدود صورت میں گرفت نہیں کر سکتا۔ یہ اپنی ظاہری صورت میں بعینہٖ منطقی فہم ہے جو کائنات کو اُس کی حرکت اور وحدت سے الگ کر کے دیکھتا ہے اس کا طریقہ اصولِ تعمیم پر مبنی ہے اور تعمیم کا استخراج اشیا کی باہم دیگر مشابہتوں سے ہوتا ہے اور بجائے اصل شے کو گرفت کرنے کے ہماری منطقی فہم محض اشیا کی مشابہ چیزوں کو گرفت کر لیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی چیز کے کتنے ہی قریبی مشابہات اور ہم شکل جمع کر لئے جائیں وہ کسی طرح بھی اصل شے نہیں ہو سکتے۔ چونکہ اُس کا تعلق حقیقت کے الگ الگ مناظر سے ہوتا ہے اور وہ بھی ان کی جمودی حیثیت سے لہذا اُس کی توجہ حقیقت کے محض وقتی اور عارضی رخوں پر منحصر رہتی ہے اور حقیقت کی بحیثیت کل اور وحدت کے دائمی اور ذاتی حالت توجہ سے خارج ہو جاتی ہے۔ حالانکہ یہ تعمیمی وحدتیں محض افسانوی وحدتیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائے نظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا تفکر نتیجہ بخش اور باثمر طرزِ تعقل نہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ یہ اپنی ذات کے اعتبار سے ایک کل ہے جو زمانی سلسلے میں محدود تشخصیتوں

کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے لہذا اس کی نتیجہ بخش اور اس کے با ثمر اور مؤثر معانی کے لئے ان محدود شخصیتوں سے گزر کر اس کل میں پہنچنے کی ضرورت ہے جس کے یہ زمانی اجزا ہیں۔ اور وہ بھی غیر حقیقی۔

اشیاء اور افعال اپنے خروج میں تدریج و تعاقب اور تعلقات و اضافات کے معروض میں تفکر ان کو ہی گرفت کرتا ہے اور زمانی و مکانی خصوصیات کا حامل ہو جاتا ہے۔ یہ تفکر اپنی اس حیثیت میں بھی حقیقت کو گرفت کرنے کے لئے ناگزیر ہے کیونکہ حقیقت کا بیرونی رخ بھی حقیقت سے علیحدہ اور کلیتہً بے تعلق نہیں۔ مزید براں حیات جیسا کہ گزر چکا ہے عضوی کل ہے جو درجہ بدرجہ ارتقائی طور پر نشو و نما پا رہی ہے۔ ان ارتقائی درجات کا انضباط اور ان کا نظم و تالیف ہمارے تفکر کا ہی کام ہے

ہمارے کاروباری احکام کا تعلق حقیقت کی ظہوری حیثیت سے ہے۔ کاروباری تجربات اسی رخ سے متعلق ہیں۔ ان تجربی عناصر کی ترتیب اور تالیف اور ان سے کاروباری نتائج حاصل کرنا تفکر کا فریضہ ہے تفکر ہماری حیات کے کاروباری رخ کے لئے ناگزیر اور ضروری ہے۔ حقیقت کا اندرونی پہلو اس مکانی تفکر کی دسترس سے باہر ہے حقیقت کو اس کی باطنی حیثیت میں ادراک کرنے کے لئے غیر مکانی اور غیر محدود کلی اور وجدانی تفکر کی ضرورت ہے۔

تا خرد پیچیدہ تر با رنگ و بوست   مے رود آہستہ اندر راہ دوست
کارش از تدریج مے یابد نظام   من نہ دانم کے شود کارش تمام

عقل گو آستاں سے دور نہیں   اس کی تقدیر میں حضور نہیں

خرد سے راہرو روشن بصر ہے   خرد کیا ہے چراغ راہ گزر ہے
درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا   چراغ راہ گزر کو کیا خبر ہے

وجدان یا البصیرت | جس طرح ذات کی دو صورتیں ہیں خارجی اور داخلی پہلی صورت منفرد اور محدود و متعین افعال و اعمال کا مجموعہ ہے اور دوسری ایک کل ہے جو اپنے امکانات کے اعتبار سے غیر محدود ہے۔ مکانی اور زمانی حدود سے ماورا۔ اسی طرح تفکر بھی اپنی ذاتی اور داخلی حیثیت میں محیط کل غیر محدود اور مکان و زماں سے ماوراحقیقت ہے۔ اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے وہ حقیقت کو اُس کے باطن کے اعتبار سے ایک کلی اور وجدانی حیثیت میں ادراک کرتا ہے جس طرح اصل حقیقت ایک سیال اور حرکیاتی حیثیت رکھتی ہے اسی طرح یہ بھی سیال اور حرکیاتی خصوصیت کا حامل ہے۔ حقیقت اپنے آپ کو زمانی مکان میں کھولتی چلی جاتی ہے اُسی طرح یہ بھی اپنے آپ کو مکانی زماں میں کھولتا چلا جاتا ہے۔ اس طرز تعقل میں اشیا کی منفرد اور متشخص کمی حیثیتیں بسیط اور کیفی امکانات کے ضمن میں منور ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ سے ذات اپنے تمام امکانات اور صلاحیتوں کی مجموعی کیفیت کے اعتبار سے روشن ہو جاتی ہے۔ اس کی کلی اور وجدانی حیثیت میں جو خود بخود کھلتی چلی جا رہی ہے محدود تصورات محض لمحات ہیں۔

اقبال نے تفکر کی اس اندرونی کیفیت کو یا دوسرے لفظوں میں وجدان کو علم کے مقابلے میں کہیں عرفان کہا ہے، کہیں نظر کے مقابلے میں دل اور کہیں عقل کے مقابلے میں عشق کہا ہے

میری فطرت آئینۂ روزگار   غزالان افکار کا مرغزار

می نداند عشق سال و ماہ را   دیر و زود و نزد و دور راہ را

بے حضوری ہے تیری موت کا راز   زندہ ہے تو، تو بے حضور نہیں

ہے تجھے واسطہ مظاہر سے   اور باطن سے آشنا ہوں میں

علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے   تو خدا جو خدا نما ہوں میں

تو زمان و مکان سے رشتہ بپا   طائر سدرہ آشنا ہوں میں

لوح محفوظ | علم اور تفکر کی غیر محدود اور محیط کل حیثیت کے لئے قرآن نے اقبال کی رائے میں لوح محفوظ کا استعارہ کہا ہے یہ لوح محفوظ علم کی باطنی اور اندرونی حالت ہے جس میں علم کے تمام امکانات اپنی بسیط شکل میں ایک فی الحال موجود واقعیت کی صورت میں محفوظ ہیں۔ اور یکے بعد دیگرے محدود اور منفرد تصورات کی حیثیت میں اس تدریجی زمان میں اپنے آپ کو ظاہر کر رہی ہے۔ لوح محفوظ یا یہ محیط کل علم جس میں تمام امکانات بحیثیت ایک وحدانی واقعیت کے موجود ہیں طے شدہ اور مقرر کردہ امور واحکام نہیں جن کی عالم کیفیت و کم تعمیل پر مجبور رہے۔ بلکہ یہ اشیاء و افعال کی ذاتی اور اندرونی صلاحیتوں کا واقعی اور نفس الامری علم ہے جو ان امکانات اور صلاحیتوں اور اُن کی فعلیتوں کے ساتھ مطابق ہے۔ نہ یہ کہ یہ صلاحیتیں اور فعلیتیں اُس کے ساتھ مطابق ہیں یا اُن کے لئے اس علم کے ساتھ مطابق ہونا ضروری ہے۔ بایں معنی کہ وہ علم اصل ہو اور یہ فرع و تابع۔

اقبال کی الہیات کی تلخیص اور اُس پر تبصرہ

اقبال کے فلسفے کے عناصر اس طرح ایک دوسرے میں گتھے ہوئے ہیں کہ اُن میں سے کسی ایک کو بھی دوسروں کے حوالے کے بغیر بیان کرنا قریب قریب ناممکن ہے یہی وجہ ہے کہ اُس کے نظام کی تحلیل اور تفصیل میں تکرار سے دامن بچالینا کوشش کے باوجود بھی دشوار ہے۔ اقبال کے نزدیک کائنات اپنی ظہوری یا خارجی حیثیت میں انفرادیتوں اور وحدتوں کا مجموعہ ہے انفرادیت اور استقلال کی خواہش ہر ہر ذرّہ میں موجود ہے اور ہر چیز اپنی انفرادیت اور استقلال کو قوی کرنے کی اور اُس کا مظاہرہ کرنے کی خواہش رکھتی ہے۔ کائنات کی اصل ایک قسم کی عضوی وحدت ہے۔ یہ وحدت روحانی حیثیت اور مستمر قوت حیات ہے۔ جو ازلاً و ابداً

جاری ہے۔ اس فعلیت کی یا عضوی وحدت کی دو حیثیتیں ہیں ایک بیرونی دوسری اندرونی یہ فعلیت اپنی اندرونی اور باطنی حیثیت میں ایک قسم کا تکاثف اور دباؤ ہے اور بیرونی ظہور میں ایک اِتّساع اور پھیلاؤ۔ اس فعلیت کے تکاثف اور دباؤ کو ذات یا "انا" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس فعلیت کے تمام احوال اور افعال میں نظم پیدا کرنا اور ایک خاص مقصد کی طرف اُس کے خروج کو متعین کرنا اور گوناگون افعال کو ایک وحدانی سلک میں منسلک کرنا اسی تکاثف کا معلول ہے یہ فعلیّت اپنی ذات کے اعتبار سے متعین ہے کیونکہ اُس کے علاوہ اور کسی چیز کا وجود نہیں۔ کائنات کی تمام بقیہ وحدتیں اسی فعلیّت کے افعال اور خارجی رخ ہیں۔ یہ فعلیت اپنی ذات کے اعتبار سے مطلق ہے اور اُس کے علاوہ تمام چیزیں اضافی۔

مجو مطلق دریں دیرِ مکافات   کہ مطلق نیست جز نُورُ السّمٰوٰتِ

اس فعلیّتِ مطلقہ یا انا و کامل کا نام خدا ہے۔ یہ فعلیت خالص استمرار اور بقائے محض ہے۔ جس میں علم، شعور، ارادہ اور مقصد اس طرح متداخل ہیں کہ ایک کی حقیقت دوسرے کے بغیر ممکن نہیں۔ اس ذات میں تمام اشیاء اور افعال، پورا زمانہ، ماضی، مستقبل اور حال بلا تدریج و تعاقب بسیط شکل میں ایک فی الحال موجود واقعیّت کی حیثیت سے موجود ہیں۔ جو اگرچہ کیفاً متاز ہیں لیکن کمّاً ان میں کوئی امتیاز نہیں۔ فعلیت مطلقہ کی ذات میں محیطِ کل اور واقعی علم بسیط صورت میں موجود ہے اس محیط کل علم کو لوح محفوظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہ فعلیّت مطلقہ جو تمام امکانات پر اُن کی بسیط شکل میں مشتمل ہے ذاتی طور پر خروج اور ظہور کی مقتضی ہے۔ اُس کے امکانات بالفعل صورت میں متشکل ہو رہے ہیں۔ کائنات اس فعلیت کا یہی ظہوری رخ ہے۔ یہ افعال بالارادہ سرزد ہو رہے ہیں۔ کثیف افعال کا مرکب مادہ ہے اور لطیف کا روح۔ جن کی ترکیب اور تخلیق اور ارتقائی صورت میں جاری ہے اور ہمیشہ جاری

رہے گی۔ ذاتِ مطلقہ کا ہر ظہور تاثیر و تخلیق ہے اور ہر تاثیر و تخلیق ایک انا یا ذات۔ جو اُس عمل کی تکاثفی حالت ہے۔ ہر "انا" میں اُس کے تمام امکانات اور افعال بسیط طور پر موجود ہیں اور اپنی ذات کے اعتبار سے ظہور کے مقتضی۔ اشیا کے انہی ذاتی امکانات اور صلاحیتوں کا نام تقدیر ہے۔ اُن میں سے ہر "انا" دوسرے "انا" کی اضافت سے ممتاز ہے اس لئے اُن کو اضافی "انا" کہا جا سکتا ہے۔ ان ذوات کی قوت اور ضعف کا مدار اُن کی تکاثفی قوت اور ضعف پر ہے۔ یہی تکاثفی حالت شعور کی بنیاد ہے۔ جتنا شعور زیادہ ہوگا اُتنا ہی تکاثف قوی اور جتنا کم ہوگا اُتنا ہی تکاثف کمزور۔ اسی تکاثف کا دوسرا نام خودی بھی ہے خودی میں جدوجہد اور تصادم سے قوت پیدا ہوتی ہے۔ یہی خودی خیر و شر کا آخری معیار ہے جو اعمال خودی یا "انا" میں اضمحلال کا باعث ہیں شر ہیں اور جو قوت اور شدت کا باعث ہیں خیر ہیں۔

فعلیتِ مطلقہ سے افعال اور اعمال کا جو سلسلہ جاری ہے وہ ارتقائی ہے۔ نقصان سے کمال کی طرف اور کمال سے اکملیت کی طرف کائنات رواں ہے۔ یہ ارتقائی روانی اور امکانات کا فعلیت کی طرف خروج تخلیق کا مقصد ہے۔ اس ارتقائی آخری کڑی انسان ہے۔ چنانچہ وہ اپنے اعمال اور افعال اور صلاحیتوں کے اعتبار سے فعلیتِ مطلقہ یا انا رکامل کے ساتھ سب سے زیادہ مشابہ ہے۔ اسی لئے وہ خلافتِ الٰہی کا مستحق ہے مگر یہ ترقی انسان کی موجودہ حد پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ یہ ازل سے جاری ہے اور ابدالآباد تک جاری رہے گی۔

موت ذات یا انا کے لئے ایک سخت قسم کا صدمہ ہے جس سے اُس کی خودی کی قوت اور ضعف کا امتحان ہوتا ہے۔ جو خودیاں ضعیف ہیں اور اس تصادم کی تاب نہیں لا سکتیں منتشر ہو جاتی ہیں اور جو قوی ہیں اُن میں بھی ایک قسم کا اضمحلال اور استرخا پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کے بعد وہ پھر اپنے آپ کو مجتمع کرنے کی اور ساتھ ساتھ واقعیت کے دوسرے مناظر سے بہرہ اندوز ہونے کے لئے

مابعد الموت کے ماحول سے اپنے آپ کو ہم آہنگ اور مطابق بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔ یہ درمیانی وقفہ عالمِ برزخ ہے۔ اس تکمیلی وقفے کے بعد حشر شروع ہو جاتا ہے یہ "انا" کی گزشتہ فعلیتوں کی اور آئندہ صلاحیتوں کا محاسبہ ہے۔ اس کے بعد سے دوسری قسم کی حیات اور دوسرے ارتقائی منازل شروع ہو جاتے ہیں۔ اگر وہ گزشتہ بد اعمالیوں کی وجہ سے اس دوسرے ماحول کے مطابق نہیں بن سکا ہے اور اپنی سختی کی وجہ سے ان بدلے ہوئے حالات کے مطابق حس و شعور پیدا نہیں کر سکا ہے تو اس کے لئے سخت ترین جدو جہد کرنا پڑ جاتی ہے۔ انا کی یہی دونوں حالتیں اس کے لئے اُس کی جنت اور دوزخ ہیں۔

فعلیت کے باطن میں افعال اور اشیا بسیط امکانات کی صورت میں موجود ہیں جن میں نہ تدریج و تعاقب ہے اور نہ کلی امتیاز۔ ان افعال کے خروج و ظہور سے اشیا میں ہمارے طریقۂ تفکر کی خصوصیت کی وجہ سے (کیونکہ ہم اشیا کا اُن کی کلی اور سیال حیثیت میں احساس نہیں کر سکتے) باہم اضافتیں اور تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں جن سے مکان کا تصور پیدا ہوتا ہے مکانی تدریج و تعاقب سے اشیا کو زمانی تدریج عارض ہو جاتی ہے۔ یہ زمانہ چونکہ مکانی جامد نقطوں پر پھیلا ہوتا ہے لہذا یہ ایک قسم کا مکانی زمان ہے جو ہمارے ذہن کا غیر حقیقی انتزاع ہے اور ذات کے محض خارجی رخ سے متعلق ہے۔ باطن ذات سے جس زمانے کا تعلق ہے وہ بسیط ہے تدریج و تعاقب سے پاک۔ اس میں ماضی مستقبل اور حال سب مجتمع ہیں۔ یہ بقاء محض اور استمرار خالص ہے مکانی زمان اور اس کے مشمولات کا خلاق۔ ذات کے ان دونوں رخوں کے اعتبار سے تفکر کی دو حالتیں ہیں۔ اندرونی جو فعلیت کو اُس کی غیر محدود اور کلی حیثیت میں گرفت کرتی ہے۔ یہ وجدان یا غیر محدود تفکر ہے۔ دوسری اُس کی بیرونی حیثیت یہ اشیا کو اُن کے بیرونی رخ کے اعتبار سے گرفت کرتی ہے۔ حقیقت کے جدا جدا اور جامد مناظر پر غور کرنا اور اُن سے

کاروباری نتائج نکالنا اس تفکر کا کام ہے۔ ظاہر اور باطن دونوں حقیقت کے رخ ہیں اس لئے حقیقت کے احاطے کے لئے اس کے دونوں رخوں کا علم ضروری ہے۔ لہذا وجدان اور تفکر میں سے کوئی فضول نہیں بلکہ ایک دوسرے کے لئے تکمیل ہے۔

ہر فلسفے کا مابعد الطبعیاتی حصہ اس وجہ سے کہ وہ کائنات کی آخری توجیہ کرنے کی انسانی کوشش ہے نہایت ہی مجرد قضایا کے ایک منظم سلسلے پر مشتمل ہوتا ہے۔ جس میں محسوس کثرت سے نہایت ہی مجرد قضایا کے ایک منظم سلسلے پر مشتمل ہوتا ہے جس میں محسوس کثرت کو حتی الامکان وحدت میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کا یہی تجرد اور تعمیم اُس کی دقت کا باعث ہے۔

اس حیثیت میں اقبال کا نظام بھی دوسرے نظاموں سے کسی طرح کم نہیں۔ بلکہ اس وجہ سے اُس کی دقت اور دشواری اور بھی بڑھ گئی ہے کہ اُنہوں نے اسلامی الہیات کو اپنے سامنے رکھا ہے اور اُس کو فلسفیانہ نظام میں تبدیل کرنا چاہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسرے مغربی اور مشرقی فلاسفہ کے مابعد الطبیعاتی نظام خصوصاً تصوری اور تخیلی اُن کے سامنے رہے ہیں۔ مزید براں موجودہ طبعیاتی تجربوں کو بھی اُنہوں نے نظر انداز نہیں کیا ہے۔ ان سب چیزوں کو پیش نظر رکھ کر کسی نظام کی تشکیل کا دشوار نہ ہونا تعجب ہے چنانچہ اُن کا نظام بھی بہت پیچیدہ ہے۔ ساتھ ساتھ انتہائی مجرد۔ اس سلسلے میں اُن کی شاعرانہ طبعیت کو بھی خاصا دخل رہا ہے۔ اس سے اُن کے نظام میں اور بھی نزاکت پیدا ہو گئی۔ اُن کے شاعرانہ جذبات نے اُن کے نظام میں بہت سی تفصیلات اور جزیات کا اضافہ کر دیا۔ جن کو کسی ایک نظام میں سمو دینا درحقیقت اُن کا ہی کارنامہ ہے اقبال کے پورے نظام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک قسم کے وحدت وجود کے قائل ہیں۔ اصل واقعیت ایک باطنی اور متکاثف فعلیت ہے۔ کائنات اسی فعلیت کا سلسلۂ افعال ہے۔ افعال کا یہ سلسلہ نہ اُس فعلیت کے اجزا ہیں اور نہ اُسے کلیتہً متغایر اور نہ عین بلکہ یہ اُس کے احوال اور ظاہری

رخ ہیں۔ وہ فعلیت اِنہیں رخوں میں منحصر نہیں بلکہ اُس کے اور بھی رخ ہیں جن کی کوئی حد اور انتہا نہیں گویا کائنات اور اُس کے خالق میں ظہور اور کمون کا فرق ہے

فعلیتِ مطلقہ یا ’انا‘ کامل کو اس نظام میں اصل قرار دیا گیا ہے۔ دوسری ذوات یا اسی فعلیتِ مطلقہ کے افعال ہیں بھی فعلیت مطلقہ کی تمام حیثیتیں کسی نہ کسی حد تک مان لی گئیں ہیں کیونکہ ایک ہی روحانی حیات ان سب میں جاری و سیال ہے اور یہ حیثیتیں اُسی روحانی حیات کی خصوصیتیں ہیں۔ ہاں دونوں میں یہ فرق کیا جا سکتا ہے کہ جس طرح ذاتِ مطلقہ یا انا کامل اصل ہے اور دوسری اضافی اسی طرح ان کی خصوصیات بھی ذاتِ مطلقہ کے اعتبار سے مطلق اور کامل ہوں گی اور ان اضافی ذوات کے اعتبار سے اضافی۔ پوری فعلیتِ مطلقہ اپنی انفرادیت کی حیثیت سے ایک مرکزیت رکھتی ہے اور اُس کے افعال اپنی اپنی انفرادیتوں کی حیثیت سے الگ الگ مرکزیت رکھتے ہیں۔ ہر مرکزیت اپنے تکاثف اور انجذابیت کی شدت سے دوسری چیزوں کو اپنی طرف مائل کر سکتی ہے۔ بلکہ جذب بھی کر سکتی ہے۔ جس طرح فعلیتِ مطلقہ اپنی ذات کے اعتبار سے اپنے تمام مظاہر پر بسیط صورت میں مشتمل ہے۔ اسی طرح یہ اضافی فعلیتیں اپنی ذات کے اعتبار سے اپنے تمام مظاہر پر بسیط شکل میں مشتمل ہیں۔ یہ مظاہر جو اندرونِ ذات میں مضمر ہیں مجرد امکانات ہیں۔ یہی امکانات اپنے ظہور میں محسوس (CONCRETE) شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ پھر یہ افعال بھی اپنی اندرونی ذات کے اعتبار سے اپنے مظاہر یا افعال اور تاثیرات پر مشتمل ہیں اور ان کی حیثیت بھی مجرد امکانات سے زیادہ نہیں۔ بہرحال یہ سلسلہ اسی طرح جاری ہے۔

خالق و مخلوقات کے اس تصور میں محلِ غور یہ ہے کہ ذات و انا کی اور ساتھ ساتھ اُن امکانات کی جن پر ذوات مشتمل ہیں خود اپنی مثبت حیثیت کیا ہے۔ ذات اور انا تکاثفی کیفیت ہے۔ لیکن یہ کس چیز کا تکاثف ہے۔ ذات کے خارجی افعال اور اس کے ظہوری رخوں کا یا محض

مجرد امکانات کا؟ اگر خارجی افعال کا تکاثف ہے تو پھر انا یا ذات کے غیر محدود امکانات پر مشتمل ہونے کے کیا معنی ہیں اور اگر یہ تکاثف مجرد امکانات کا ہے تو امکانات سے اگر کسی خاص سمت کی طرف میلانات ورجحانات مراد ہوں تو یہ کس کے میلانات ورجحانات ہوں گے۔ ان کے علاوہ تو کسی ذات یا شے کا خواہ عرض ہو خواہ جوہر کوئی وجود نہیں اور اگر ان امکانات کو رجحان و میلان سے بھی معرا کر لیا جائے تو یہ خالص عدمی مفہوم ہے۔ ایسی صورت میں ذات اور انا کی حیثیت کیا رہ جائے گی۔ اور اس کے بذاتہ واقعیت اور حقیقت ہونے کی کیا صورت ہو گی۔ کیونکہ وجود کے علاوہ کسی واقعیت کا تصور ممکن نہیں۔ عدم محض ایک ذہنی انتزاع اور اعتبار ہے جس کو وجود کی نفی سے اخذ کیا جاتا ہے۔ مزید براں غیر محدود امکانات کو ترجیح دینے کے لئے اور محدود کرنے کے لئے دوسری ذات کی ضرورت ہو گی جو ان سے ماورا ہو۔ ایسی ذات جو تحدیدی اور ترجیحی با شعور زندہ اصل کا کام دے سکے اس کو کائنات کی دوسری ذوات سے ہر اعتبار سے الگ اور ماورا ہونا چاہئے۔

پروفیسر وہائٹ ہیڈ نے کائنات کی توجیہہ مظاہر ازلیہ سے کی ہے۔ اس کے نزدیک یہ مظاہر ازلیہ مجرد امکانات ہیں جو غیر محدود ہیں۔ انہیں امکانات کی محسوس (CONCRETE) شکل کائنات ہے۔ ان غیر محدود مظاہر ازلیہ کی واقعیت اسی حد تک جس حد تک یہ محدود اور مرجح ہو کر محسوس صورت اختیار کر لیں۔ واقعیت کا مدار اس کے نزدیک زمانی اور مکانی خصوصیات کے معروض ہو جانے پر ہے۔ ان مجرد غیر محدود امکانات کی تحدید اور ترجیح کے لئے ایک اصل کی ضرورت ہے اور یہی اصل خدا ہے۔

خدا غیر محدود ممکن عوالم میں سے کسی ایک عالم کو ترجیح دے کر واقعی اور حقیقی بنا دیتا ہے اسی طرح غیر محدود ممکن تعلقات اور اضافتوں میں سے مخصوص تعلقات اور اضافات کو ترجیح دے کر

اُن کو واقعی اور حقیقی بنا دیتا ہے۔ یہ ترجیح بھی غیر عقلی ہے اور خود خدا یا مجدد اور مرجع اصل بھی غیر عقلی۔ کائنات سے بالکل ماورا۔ اس اصل کو اشیا اور عوالم کی واقعیت کی بنیاد کہا جا سکتا ہے وَتَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا ذٰلِكَ عُلُوًّا كَبِيرًا۔ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ .... وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ۔

اسے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم　　وز ہرچہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم

عمرے تمام گشت و بپایاں رسید کار　　ما ہمچناں باول وصفِ تو ماندہ ایم

میں اس اعتراف پر زیر نظر مقالے کو ختم کرتا ہوں کہ یہ اقبال کو سمجھنے کی ایک طالب علمانہ کوشش ہے۔ اقبال کا الہیاتی نظام بہت مجرد اور دقیق ہے اور ساتھ ساتھ اب تک اُس پر کوئی تحریر میری نظر سے نہیں گزری جو اقبال کو سمجھنے میں مدد دیتی۔ اگر میں اُس کو پوری طرح نہیں سمجھا ہوں تو یہ میری معذوری ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اُن کے نظام کے بہت سے اجزاء ایسے ہیں جن میں اُن کے رشتۂ تفکر کی گرفت نہیں کر سکا جس کے لئے مجھے اپنی فہم کے قاصر ہونے کا اقرار ہے۔

کتابیات زیر نظر مقالے کی ترتیب میں حسب ذیل کتابوں سے خاص طور پر فائدہ اُٹھایا گیا ہے۔ اقبال کے خیالات اُن کے اشعار سے اور اُن کی کتاب "اسلامی تصورات کی تعمیر نو پر خطبات" اسرار خودی پر اُن کے مقدمے سے جس کو انہوں نے ڈاکٹر نکلسن کی فرمائش پر اُس کے ترجمہ کے لئے لکھا تھا ماخوذ ہیں۔ مقالے کے تمہیدی حصے میں ڈاکٹر ویلیم نیسل کی "مختصر تاریخ یونان" ہافڈنگ کی "تاریخ فلسفہ جدید" جلد اول و دوم۔ سی۔ ای۔ ایم۔ جوڈ کی "رہنمائے فلسفہ" اور اسکندر کی "مختصر

تاریخ فلسفہ" سے مدد لی گئی ہے۔" تاریخ فلسفہ جدید" کے بعض حوالے مقالے کے درمیان میں بھی آگئے ہیں۔ کائنات کے ارتقا کی مادی توجیہ اور پروفیسر وہائٹ ہیڈ کے خیالات بھی " رہنمائے فلسفہ " سے مقتبس ہیں۔

Six Lectures on the Reconstruction of Relegious Thought in Islam by Dr. Iqbal. PP 3,7,24,42 52, 55, 56, 60, 63, 71, 74, 76, 77, 82, 87, 90, 91, 99, 100, 130, 144, 161, 164, 166-170, 176

The Secret of the Self, Introduction by Nicholson XXIV, XXV

Guide to Philosophy by C.E.M. Joad PP. 440, 496, 497, 507, 508, 523. 524,

A Short History of Philosophy by Alexander. PP. 592,

تاریخ فلسفہ جدید از ھانڈنگ جلد اول (مقدمہ) ص۳ جلد ثانی (فلسفہ تخیلیت ص۱۵۷ (دار الترجمہ حیدرآباد)

مختصر تاریخ یونان از ڈاکٹر ولیلم نیسل (دار الترجمہ) مقدمہ ص۱

سالانہ قیمت

عوام سے چار روپے | قرآن نمبر | رؤسا سے چھ روپے

پیغامِ حق!

ظفر منزل تاج پورہ لاہور

جلد ۵ | نومبر و دسمبر ۱۹۴۱ء | عدد ۵/ ۶

سید محمد شاہ پرنٹر پبلشر نے دین محمدی الیکٹرک پریس لاہور میں طبع کرا کر دفتر رسالہ پیغام حق ظفر منزل تاج پورہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخنہائے گفتنی

قرآن مجید خدائے لم یزل کا وہ کلام ہے جو محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر اس لئے نازل ہوا کہ بنی نوع انسان اس کی ہدایات کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھال کر دنیا میں فلاح و کامرانی اور آخرت میں نجاح و شادمانی حاصل کریں چنانچہ اِس سرچشمۂ ہدائت سے جن سعادت مند روحوں نے فائدہ اُٹھایا اُن کی قابلِ رشک زندگیوں کے نمونے ہمارے سامنے ہیں۔ مگر افسوس اور صد افسوس کا مقام ہے کہ اب کئی صدیوں سے لوگوں نے اِس سرچشمۂ ہدائت سے ہدائت حاصل کرنا بند کر دیا ہے اِس نے زندگی کے لئے جو پروگرام وضع کیا تھا تو اُسے سمجھنے کی کوئی کوشش ہی نہیں کی جاتی اور یا اگر سمجھا بھی جاتا ہے تو فقدانِ ہمت کا اس قدر افسون چل گیا ہے کہ اُسے بحالاتِ موجودہ ناقابلِ عمل ٹھہرایا جاتا ہے۔ لے دے کے صرف اتنی بات رہ گئی ہے کہ بعض انتہائی درجہ کے "متدین حضرات" اس سے گنڈے تعویز کا کام لے لینا ہی بڑی خدمت خیال کرتے ہیں۔

بقول علامہ اقبال مرحوم اگر ہم لوگ بحیثیتِ مسلمان زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے یہ اُس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ہم قرآن کو اپنا لائحہ عمل نہ بنائیں اور اس کے ساتھ اپنا دامن خوب اچھی طرح وابستہ نہ کریں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس وقت یہ احساس مسلمانوں کے ایک طبقہ میں پیدا ہونے لگا ہے اور مولٰینا ابو الاعلیٰ مودودی جیسے نیک نیت، سنجیدہ مزاج، خدا ترس اور باہمت حضرات اِس امر کی کوشش کرنے لگے ہیں کہ لوگ قرآنِ مجید کو ایک بار پھر اپنا لائحہ عمل بنانے کے لئے آمادہ ہو جائیں چنانچہ مولانائے ممدوح کا رسالہ ترجمان القرآن ۱۹۳۲ء سے یہ خدمت بجا لا رہا ہے اور الحمد اللہ مسلمانوں کے اندر یہ احساس پیدا کرنے میں اُسے عظیم الشان کامیابی نصیب

ہوتی ہے۔ ہم اپنے قارئین کرام سے درخواست کریں گے کہ وہ خود عربی زبان پڑھیں اور اپنے بچوں کو لازمی طور پر عربی زبان پڑھائیں اور قرآن مجید سے براہ راست استفادہ کر سکیں۔ مسلمانوں کا یہ ادبار اُس وقت تک نہیں جا سکتا اور یہ نحوست اُس وقت تک دور نہیں ہو سکتی جب تک وہ قرآن کریم کی ہدایات پر چلنا نہیں سیکھتے۔

"پیغام حق" کا یہ "قرآن نمبر" ملک کے بلند پایہ اہل قلم اور قابلِ احترام علماء کے مضامین کا حامل ہے سیاس مجموعہ میں اور بھی بہت سے مضامین تھے مگر کاغذ کی گرانی کی وجہ سے سب مضامین کو اسی ایک مجموعہ میں شائع کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ تقریباً اُسی قدر مجموعہ باقی رہ گیا ہے خدا کو منظور ہوا تو ان باقی ماندہ مضامین کو پھر کسی دوسرے موقع پر شائع کیا جائے گا۔

کاغذ کی گرانی اور نایابی کا حال کس سے پوشیدہ ہے۔ گزشتہ دنوں میں صرف وہی اخبارات و رسائل شائع ہو سکے جن کے پاس کاغذ کے ذخائر پہلے سے موجود تھے کیونکہ دوکانداروں نے نفع اندوزی کے لالچ میں قیمتیں پانچ گنا تک بڑھا دی تھیں۔ اس لئے غریب اداروں کے لئے کاغذ خریدنے کا کوئی موقع باقی نہ تھا۔ اب گورنمنٹ آف انڈیا نے کاغذ کی قیمتوں کا کنٹرول کیا ہے اگرچہ یہ قیمتیں بھی پہلے کی نسبت بہت زیادہ ہیں تاہم غنیمت ہے مگر بڑی مصیبت یہ ہے کہ سوداگران کاغذ ان قیمتوں پر کاغذ بیچتے نہیں۔ یہ وجوہات تھیں۔ کہ نومبر و دسمبر و جنوری کا پیغام حق شائع نہ ہو سکا۔ الحمد للہ خدا نے ایسا سامان بنا دیا ہے کہ اب پھر پیغام حق مثلِ سابق وقت پر شائع ہوتا رہے گا۔

نومبر و دسمبر کا پرچہ آپ کے سامنے ہے اور جنوری اور فروری کا زیر طبع ہے۔ لہٰذا جن حضرات کا چندہ دسمبر یا جنوری میں ختم ہوتا ہے براہ کرم وہ چار روپے بذریعہ منی آرڈر بھیجکر ممنون فرمادیں۔ یا وی پی کی اجازت دیں کاغذ کی گرانی کے پیش نظر چندہ تین روپے سے چار روپے کرنا پڑا ہے اگرچہ خرچ اس سے بھی پورا نہیں ہوتا مگر قارئین کرام توجہ کریں تو خریداروں کی تعداد بڑھ سکتی ہے اور اس طرح خرچ پورا ہو سکتا ہے

یا اُن کو پیامِ ازلی نے یہ بتایا

(ادریس احمد مینائی خالد حیدرآباد دکن)

اوروں کو مبارک ہو صنم خانۂ افرنگ — توحید کے عشاق کو ہر نوع صنم ننگ

ہے باعثِ بربادئ تہذیب حقیقی — کہتے ہیں جسے کور نظر دانشِ افرنگ

خالد کی نگاہوں نے بھی دیکھے ہیں گلستان — مغرب کی بہاروں پہ ہے کیوں عقلِ جہاں دنگ

ہو داغ کلیجے میں لئے خرم و شاداں — ڈھونڈے یہ بھی ایسا نہیں پایا گلِ خوش رنگ

جب تک کہ نہ ہو زور و منافع کا تقاضہ — اُس دیس میں انہوں کے بھی ہیں قلب و نظر تنگ

اقبال نے یہ درس دیا ہم کو خودی کا — ہے مردِ خود آگاہ سدا صاحبِ اورنگ

وہ تیرے ہی کردار کے ہوتے ہیں کرشمے — تو جن کو کہا کرتا ہے تقدیر کے نیرنگ

دل کو بھی ٹٹولا کبھی حق کے متلاشی! — کیا فلسفہ یونان کا! اک فلسفۂ سنگ

مضمر ہے تری ذات میں وہ جوہر ذاتی — ہیں جس سے طلسماتِ دل و عقل کے نیرنگ

دل ہی تو وہ اک سازِ خداداد ہے جس میں — محفوظ ہے خود سازِ سرِ عرش کی آہنگ

ہو عشق کی مضراب تو یہ نعرۂ تکبیر — شرمندہ کنِ نغمۂ ہر ہر طبل و چنگ

محبوبۂ ملت کے شہیدانِ جواں بخت — شمشیر پہ آنے نہیں دیتے ہیں کبھی زنگ

وہ رنگِ حنا کے کبھی قائل نہیں ہوتے — اُن کے لئے اللہ کے دشمن کا لہو رنگ

یا اُن کو پیامِ ازلی نے یہ بتایا — اللہ کے بندوں کو بس اللہ ہی کا رنگ

ہاں بڑھ کہ مجاہد کے لیے عرصۂ ہستی — یا کارگہِ جنگ ہے یا معرکۂ جنگ

یوں شاہدِ فطرت نے مسلماں کو سکھایا — ہوتے نہیں شیرانِ جواں جنگ سے دل تنگ

[illegible] قرآن

اطاعت رسول صلعم

(حافظ سراج الدین محمود بی۔ اے۔ بی۔ ٹی۔ بہاول پور)

"پھر قسم ہے تیرے رب کی یہ لوگ مسلمان نہ ہوں گے۔ جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کا آپس میں جو جھگڑا ہو اس میں یہ لوگ آپ سے فیصلہ نہ کراویں پھر آپ کے اس فیصلے سے اپنے دلوں میں تنگی بھی نہ پائیں۔ اور اس کو مان لیں جیسا کہ ماننے کا حق ہے"

عہد اسلام سے قبل کی انسانی تاریخ انبیاء و رسل پر ایمان لانے والوں کے ایمان و اخلاص کی ان بلند ترین مثالوں سے یکسر خالی ہے جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ظہور میں آئیں اکثر مومنین کی زندگیوں کے حالات جو پیغمبر پر ایمان لانے والوں میں سابقون الاولون کے زمرہ میں شمار ہوئے۔ بہت مایوس کن ثابت ہوئے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم تو اس معاملے میں اپنی بدنامی کی شہرت کو خوب قائم رکھتی رہی ہے۔ فرعون سے رہائی، دریا سے سلامتی سے گزر جانا۔ دشمن کا ان کی آنکھوں کے سامنے غرق ہو جانا بھی ان کے ایمان و اخلاص کی استقامت کا باعث نہ بن سکا۔ اللہ کی یہ سب رحمتیں اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد بھی جس وقت ان کو یہ خوشخبری سنائی گئی کہ وہ تمہارے سامنے دودھ اور شہد کی نہروں والا ملک ہے۔ جس کا خدا نے تم سے وعدہ کیا، تم اس طرف بڑھو خداوند قدوس تمہارے دشمنوں کو تم سے خائف کر دے گا۔ وہ فرار ہو جائیں گے اور تم غالب ہو گے تو مومنین کے اس چھ لاکھ کے گروہ نے جواب دیا۔

فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا إِنَّا هَاهُنَا قَاعِدُونَ ۔ یعنی آپ اور آپ کے اللہ میاں چلے اور دونوں لڑ بھڑ لیجئے ہم تو یہاں سے سرکتے نہیں۔ اس چھ لاکھ کے گروہ میں صرف دو انسان ایسے نکلے کہ جنہوں نے حق کی تائید میں زبان کھولی اسی لئے موسیٰ علیہ السلام کو بارگاہ الٰہی میں فریاد کرنی پڑی:۔

"اے میرے رب مجھے اپنی اور اپنے بھائی کی جان کے سوا کسی پر کوئی اختیار حاصل نہیں"۔ وقت گزرتا گیا خدا کی طرف سے اس کے بندوں کو پیغام لانے والوں کا سلسلہ ہر عہد اور ہر قوم میں برابر جاری ہا انسانیت کی تعلیم کی تکمیل کے لئے نظام ربانی برابر مصروف عمل رہا۔

یہاں تک کہ حضرت عیسیٰؑ نے امن و محبت کے وعظ سے انسانی قلوب کو گرمانا چاہا ان پر ایمان لانے والوں میں حواریں کو خاص عظمت حاصل تھی پھر ان سب میں سے بڑے حواری یہودہ کو جو تقرب ان کی ذات کے ساتھ حاصل تھا بائیبل کے صفحات پر اس کی شہادت آج تک ثبت ہے لیکن حضرت عیسیٰؑ کی گرفتاری میں اس بہترین رفیق کا ہاتھ ہی تھا بلکہ اس نے اپنی خدمات کے صلے میں حکومت وقت سے تائیس عدد سکے حاصل کر کے اپنے ایمان و اخلاص کو اس قدر سستے داموں فروخت کر دینے میں بھی کوئی ذلت محسوس نہیں کی تھی۔ ان حالات اور روایات کی صدائے بازگشت فضا میں موجود تھی اور انسانی وحشت و بربریت اور ضلالت و گمراہی کی تاریک ترین گھٹا فضائے بسیط پر چھائی ہوئی تھی کہ سرکار دو عالم سرور کائنات محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا آفتاب عالمتاب افق عالم پر نمودار ہوا باد سموم سے جھلسے ہوئے صحرائے عرب کی آتشیں سرزمین پر انسانی اخلاق و عظمت کی مستحکم بنیادیں استوار ہونی شروع ہوئیں اور بنی نوع انسان کی تربیت کے لئے فیضان سماوی کے دروازے کھول دیئے گئے جوں جوں وقت گذرتا گیا وحی الٰہی کی تاثیر اور صحبت نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فیض دا ثر نے بادیہ نشینان عرب کی کایا پلٹ دی تکمیل اخلاق انسانی کے لئے اس معلم اول نے اپنی عدیم النظیر زندگی کے تیرہ سال صرف کر دیئے تو اس قدر عظیم الشان نتائج حاصل ہو چکے تھے کہ قیامت تک کے لئے تاریخ ان کی مثال پیش کرنے سے قاصر رہے گی۔

ایک خاص معاملے کے متعلق جب مندرجہ عنوان آیت نازل ہوئی تو حضرت ابوبکر صدیقؓ کھڑے ہوئے اور عرض کی اگر ہمیں حکم ہو کہ ہم اپنی جانوں کو اپنے ہاتھ سے قربان کر دیں تو میں اس کے لئے حاضر ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا "تم نے سچ کہا ابوبکرؓ" اور اس معاملے میں رفیق غار تنہا نہ تھے بلکہ سینکڑوں دلدادگان عشق نبی کے حکم کی تعمیل کے لئے ہمتن گوش تھے۔ ابتدائے دنیا سے یہی دستور رہا کہ جنگ و پیکار کا سلسلہ دشمنوں کے ساتھ قائم ہوتا ہے حرب و ضرب اور آتش و خون کا یہ کھیل یگانوں کے ساتھ نہیں بیگانوں کے ساتھ کھیلا جایا کرتا ہے لیکن جنگ بدر کے موقعہ پر مخلصین اسلام کے لئے یہ کس قدر آزمائش اور امتحان کا وقت تھا کہ بھائی کو بھائی اور بیٹے کو باپ اور خسر کو داماد کے خلاف تلوار اٹھانی پڑی حضرت ابوبکر صدیقؓ اگر اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کے خلاف نبرد آزما تھے تو حضرت عمرؓ کی تلوار ماموں کے خون سے رنگین تھی تین سو تیرہ رفیقوں میں سے کسی ایک کی پیشانی پر بھی شکن نہ پڑی۔

صحبت نبویؐ کے تربیت یافتہ مردوں کا تو خیر کیا ذکر ہے۔ جنس لطیف کی سی کمزور و ضعیف مخلوق کی استقامت

محبت اور اخلاص کی مثالیں کہیں دوسری جگہ ڈھونڈے سے نہیں ملیں گی۔ ایک عورت کا باپ بھائی۔ بیٹا اور شوہر یکے بعد دیگرے شہید ہوگئے باری باری سے ان کی شہادت کی اطلاع اس فدایہ حق کو کی گئی ہر نئی شہادت کی خبر پر وہ عشق و محبتِ حق کی یہ رازدار دریافت کر لیتی تھی کہ حضور انور تو بخیریت ہیں آخر اس کے شوہر کی شہادت کی خبر پر جب اس کے استفسار کے جواب میں اسے معلوم ہوا کہ حضورؐ بخیریت ہیں تو اس پروانہ رخ شمع نبوی علیہ السلام کے منہ سے جو الفاظ نکلے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فضا میں گونجتے رہیں گے۔

"تیرے ہوتے سب مصیبتیں آسیچ ہیں"

ماں باپ بھی شوہر بھی برادر بھی فدا تیرے ہوتے ہوئے اے شہ دیں کیا چیز ہیں ہم

لیکن واحسرتا و صد افسوس کہ آج وہی قوم دنیا میں اپنی نافرمانیوں کا فرماجرائیوں اور انکار و حجت کے لئے مشہور ہو چکی ہے۔ برسر عدالت اس بات کے اقرار پر فخر کرنا کہ ہم شریعت کے نہیں بلکہ ہندی رواج کے پابند ہیں یہ اسلام اُس کے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم اور اس کی کتاب سے انکار...... نہیں تو پھر اور کیا ہے۔ ہماری زندگی کا کوئی گوشہ بھی اس انکار و حجت سے خالی نہیں ہماری معیشت ہماری معاشرت اور ہماری سیاست شریعت حقہ کے اثر و نفوذ سے کلیتہً آزاد ہو چکی ہیں۔

لیکن پھر بھی ہمیں اپنی ذلت و نامرادی اور خسران کے اسباب و وجوہ کی تلاش ہے گویا ہمیں یہ معلوم ہی نہیں۔ یہود اپنی صریح نافرمانیوں اور عدول حکمیوں کا احساس بھی کھو چکے تھے۔ اس لئے موسیٰؑ نے جب وہ ان میں موجود تھے ان کی رفاقت سے پناہ مانگی تھی بعینہٖ ہم آج اپنی بد اعمالیوں سے بے خبر ہیں لیکن ہماری یہ بے خبری ہمیں ہمارے جرائم کی پاداش سے نہیں بچا سکتی دنیا میں ہمارے اعمال کی سزا ہمیں مل ہی رہی ہے اور قیامت کے دن کس قدر حسرت فزا ہوگی۔ ہماری وہ حالت جب وقت ختم رسل صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہنے پر مجبور ہوں گے قَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۔ اور رسول کہیں گے کہ اے میرے پروردگار میری قوم نے اس قرآن کو بالکل نظر انداز کر رکھا تھا۔

(از مولینا عبداللہ العمادی)

(۱)

آج کی تلویحات کا مفاد یہ ہے کہ کلام اللہ جو حیات انسانی کے لئے سرمایۂ سعادت ہے مسلمان اس کی دل سے تعظیم کریں اور یہ تعظیم ان کی جان و تن سے نمایاں ہو اس کے لئے تعظیم کا مفہوم سمجھنے کی بھی ضرورت ہے، جس کے آغاز سے پہلے ایک تمہید کا انجام دیکھنے کے قابل ہے۔

علامہ تقی الدین احمد بن عبدالقادر المقریزی ایک شہرۂ آفاق مورخ ہیں جن کی کتاب "الخطط والآثار" مصر کی جغرافی تاریخ میں ماخذ مانی گئی ہے، ان کی ایک اہم تالیف "النقود الاسلامیہ" بھی ہے جس میں اسلامی سکّے کی تاریخ دی ہے، ١٢٩٨ھ میں یہ کتاب شیخ احمد فارس شدیاق کے مطبعۃ الجوائب (قسطنطنیہ) میں چھپی تھی اس تلویح کی تمہید اسی کتاب پر مبنی ہے۔

(۲)

ہجرت نبوی کے اٹھارہویں سال جو خلافت فاروقی کا آٹھواں سال تھا اسلامی سکّے مضروب ہوئے، یہ سکّے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ضرب کرائے ان میں کسی کا نقش "درم الحمد للہ" تھا، کسی کا "محمد رسول اللہ" اور کسی کا "لا الہ الا اللہ وحدہ"۔ ؎۱

خلافت راشدہ میں اسی قسم کے سکّے رائج تھے، بنی امیہ کے عہد میں عبدالملک بن مروان نے اس کی تجدید کی اور حجاج بن یوسف نے اس کو ترقی دی، اس ذیل میں ایک واقعہ ملاحظہ ہو۔

کان مما ضرب الحجاج الدراھم البیض حجاج نے جو سکّے ضرب کرائے ان میں چاندی کے درم بھی تھے

؎۱۔ النقود الاسلامیہ، ص [illegible]۔

ونقش علیها "قل هو الله احد" فقال القراء قاتل الله الحجاج ای شیٔ صنع للناس الآن یاخذه الجنب والحائض وکانت الدراهم قبل منقوشة بالفارسیة فکره ناس من القراء مسها وهم علی غیر طهارة وقیل لها "المکروهیة" فعرفت بذلك۔

جن پر "قل ہو اللہ احد" نقش تھا، قاریان کلام اللہ کہنے لگے کہ "اللہ حجاج کو غارت کرے، لوگوں کے لئے یہ کیا بنا رکھا ہے، جو فرد نجس ہوں اور جن عورتوں کو طہر کی نوبت نہ آئی ہو اب تو وہ بھی اسے لیں گے" اس سے پہلے جو درم تھے ان پر فارسی میں نقش ہوتا تھا قاریان کلام اللہ کی ایک جماعت نے بے طہارتی کی حالت میں ان سکوں کا چھونا مکروہ قرار دیا، ان کا نام "مکروہیہ" پڑ گیا اور عرف عام نے اسی نام کو شہرت دی۔

ووقع فی المدینة ان مالکا رحمه سئل عن تغییر کتابته الدنانیر والدراهم لما فیها کتاب الله عز وجل فقال۔

مدینہ منورہ میں یہ واقعہ پیش آیا، کہ آیات قرآنی کے باعث نقش دینار و درم کو بدل دینے کے لئے امام مالک علیہ رحمہ سے استفتا کیا گیا، امام موصوف نے فرمایا۔

"اول ما ضربت علی عهد عبد الملك بن مروان والناس متوافرون فما انکر احد ذلك وما رأیت اهل العلم انکروه و لقد بلغنی ان ابن سیرین کان یکره ان یبیع بها ویشتری، ولم ار احدا منع ذلك ههنا" یعنی رحمه الله اهل المدینة النبویة۔

اس طرح کے سکّے پہلے پہل عبد الملک بن مروان کے عہد میں ضرب ہوئے تھے، اس زمانے میں بہتیرے بزرگان دین موجود تھے لیکن کسی ایک نے بھی اس کو برا نہ جانا، میں نے دیکھا تک نہیں کہ اہل علم نے اس کی برائی کی ہو۔ البتہ مجھے یہ خبر ملی تھی کہ ابن سیرین ایسے سکوں سے خرید و فروخت مکروہ قرار دیتے تھے، مگر یہاں تو میں نے کسی ایک کو اس کی مخالفت کرتے نہیں دیکھا۔ "یہاں" سے امام مالک کی مراد اہل مدینہ منورہ ہیں۔

وقیل لعمر بن عبد العزیز رحمه الله هذا؟

حضرت عمر بن عبد العزیز علیہ الرحمہ جب خلیفہ ہوئے تو ان

الدراھم البیض فیھا کتاب اللہ یقبلھا اليهودی والنصرانی والجنب والحائض، فان رأیت ان تامر بمحوھا۔

سے گذارش کی گئی کہ چاندی کے ان درموں پر کلام اللہ کی آیتیں نقش ہوتی ہیں، یہودی بھی ان سے معاملت کرتے ہیں، نصرانی بھی نجس مرد بھی اور ناپاک عورتیں بھی، اگر آپ کی رائے ہو تو نقش آیات کے مٹانے کا حکم دے دیجئے۔

فقال۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جواب دیا۔

"اردت ان تحتج علینا الامم ان غیرنا توحید ربنا واسم نبینا صلی اللہ علیہ وسلم"

اس کہنے سے تمہاری غرض یہ تھی کہ دنیا کی قومیں ہم پر اعتراض کریں کہ خود ہم نے اپنے پروردگار کی توحید اور اپنے پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کا نام مٹا دیا۔ ؎

(۳)

اس طویل اقتباس سے آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ تعظیم اللہ کے متعلق۔

اہل مدینۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعامل کیا تھا؟

امام مالک رضی اللہ عنہ کا فتویٰ کیا ہے؟

حضرت عمر بن عبدالعزیز کیا کہتے تھے؟

اور عصر تابعین میں کہ خیر القرون کا جزو ثانی تھا، کلام الٰہی کے ادب کی نسبت مذہبی رائے کیا تھی؟

بے شبہ ہر مسلمان کا مقدس فرض ہے کہ اس مجموعۂ برکت و رحمت کو ادب و احترام کی نظر سے دیکھے اجلال اکرام کے ساتھ اس کے لئے گوش بر آواز رہے، یہ بھی تعظیم ہے، لیکن اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔

آپ ظاہری تعظیم پر زور دیجئے، چشم ما روشن۔

آپ مس مصحف کے لئے طہارت شرط کیجئے، دل ما شاد۔

لیکن عمل بھی تو ایک شرط تعظیم ہے۔ اس کو کیوں بھول جائیے؟

نفی حکمت مکن از بہر دلِ عامے چند

تعظیم و تکریم کلام اللہ کے اگر یہی معنی ہیں کہ بغیر طہارت کے تلاوت نہ کی جائے بے وضو کوئی اس کو چھونے نہ پائے تہ بہ تہ ریشمی جزدان اس پر چڑھے رہیں بے ادبی کے خوف سے رسالوں اور اخباروں میں اس کی آتیں نہ لکھی جائیں۔ تو کیا اتنا کر لینے سے یہ فرض ادا ہو جاتا ہے؟

فرض کرو ایک شخص کا عمل قرآن پر نہیں ہے اور اس کے کردار و گفتار سے ثابت ہوتا ہے کہ احکام الٰہی کی عزت سے اس کا دل بے بہرہ ہے۔ مگر ظاہری تعظیم میں وہ نہایت مبالغہ کرتا ہے اور ہمیشہ سے جو رسم و رواج چلا آتا ہے۔ اس کے مطابق مروجہ عظمت کا بڑی سختی سے پابند ہے۔ کیا تم ایک لحظہ کے لئے بھی اس کی تعظیم کو قرآن کریم کی اصلی تعظیم پر محمول کر سکتے ہو؟

اصلی تعظیم ظاہر داریوں سے بے نیاز ہے اس کا منشا محض اس قدر ہے کہ آسمانی کتاب جن تعلیمات کو دنیا میں عام کرنا چاہتی ہے اور نوع انسان کی بھلائی کے لئے جو احکام اس نے مقرر کر رکھے ہیں انکی پابندی کی جائے قرآن اس لئے نہیں اترا تھا کہ لوگ اس کو آنکھوں سے لگانے اور سر پر رکھنے کو کافی سمجھیں قرآن کے نازل ہونے کی خاص غرض یہ تھی کہ دنیا اس کی روشنی سے منور ہو اور اہل دنیا اس کو اپنے معاملات کا دستور العمل بنائیں۔

(۴)

ظاہری عظمت کے لئے دلیل یہ دیجاتی ہے کہ خود قرآن کریم نے لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ - پاکوں کے سوا کوئی اس کو چھونے نہیں پاتا) کی تاکید کی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ آیت کا مفہوم ہی غلط سمجھا گیا ہے۔ کفار کو اعتراض تھا کہ قرآن منجانب اللہ نہیں ہے۔ یہ بنائی ہوئی باتیں ہیں خدا نے اس وہم کی تکذیب کی اور فرمایا کہ۔

إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ ۔ فِي كِتَابٍ مَكْنُونٍ ۔ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ ۔ تَنْزِيلٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۔ أَفَبِهَذَا الْحَدِيثِ أَنْتُمْ مُدْهِنُونَ

یہ قرآن تو بڑی بزرگی کا قرآن ہے۔ محفوظ کتاب میں موجود ہے۔ پاکوں کے علاوہ کوئی اس کو چھونے نہیں پاتا پروردگار عالم کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ کیا تم اس کلام سے منکر

وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ۔ ہو اور تم نے اپنا راتب باندھ لیا ہے کہ اس کو (سورہ واقعہ۔ رکوع ۳۔ آیت ۸۲) جھٹلاتے ہی رہو گے:

آیت میں صاف مذکور ہے کہ کفار کو اس پاک کلام کے کلام اللہ ہونے سے انکار تھا اور انہوں نے اس کے جھٹلانے کو اپنا فرض قرار دے رکھا تھا جس کے جواب میں بتایا گیا کہ یہ لوح محفوظ میں بڑی احتیاط سے لکھا ہوا موجود ہے۔ اور خدا کے پاک نفس بندوں کے علاوہ کوئی اس کو چھونے تک نہیں پاتا۔ پھر اس میں کمی وبیشی کی گنجائش کہاں رہی۔ اور کوئی اس کو جھٹلا کیونکر سکتا ہے؟

(۵)

اس آیت کی تفسیر میں متعدد حدیثیں مذکور ہیں۔

حضرت ابن عباس وجابر بن زید وابو نہیکؓ سے روایت ہے کہ "وہ قرآن جو آسمان پر ہے پاکوں کے علاوہ کوئی اسے نہیں چھو سکتا"۔

حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ "مطلب یہ ہے کہ قرآن ایسی محفوظ کتاب ہے کہ اس پر غبار تک نہیں آسکتا"۔

ضحاک کہتے ہیں کہ "کفار کو گمان تھا کہ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر شیاطین نے قرآن نازل کیا ہے۔ اس کا جواب ملا کہ وہ تو محفوظ کتاب ہے۔ پاکوں کے علاوہ تو اس کو کوئی چھو تک نہیں سکتا۔ وہاں کسی کی دسترس کہاں"۔

سعید ابن جبیر وعیسیٰ ابو نہیک وجابر بن زید ومجاہدؒ نے۔ لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ۔ کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ "اس سے مراد فرشتے ہیں"۔

ابو العالیہ وابن زید وقتادہ نے روایت کی ہے کہ "یہ مطلب کہ پاکوں کے سوا کوئی قرآن کو چھونے نہیں پاتا۔ اس میں پاکوں سے خدا کے پاک فرشتے۔ مقدس پیغمبر اور پاکیزہ خصال وپرہیزگار بندے مراد ہیں اور قرآن سے وہ قرآن مراد ہے جو لوح محفوظ میں ثبت ہے"۔ ورنہ دنیا میں تو اس کو

ناپاک مجوسی اور گندے منافق بھی چھوتے ہیں۔"

اسی طرح کی اور بہت سی روایتیں تفسیر ابو جعفر ابن جریر جلد ۲۷ صفحہ ۱۰۵،۱۰۶ میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔

آیت میں نہ صیغۂ نہی وارد ہے اور نہ معنوی نہی کی صورت نکلتی ہے۔ بات صرف اتنی تھی کہ قرآن کریم کے محفوظ و منجانب اللہ ہونیکا یقین دلانا تھا۔

(۶)

ہمارا یہ منشا ہرگز نہیں کہ قرآن کریم کی ظاہری تعظیم ترک کر دی جائے۔ مدعا صرف اس قدر ہے۔

(۱) مسلمانوں کا ظاہر و باطن یکساں ہونا چاہئے۔ حیف ہے کہ ظاہر میں تو قرآن کریم کا ہم اس قدر ادب کریں کہ جبتک وضو و غسل نہ ہو اُس کو چھُونا اور اُس کے الفاظ کا زبان پر لانا ممنوع سمجھیں اور باطن کا یہ حال ہو کہ تعلیمات قرآنی سے ہماری روش اتنی مخالف ہے کہ گویا دل کو یہ بھی یقین نہیں کہ یہ کلام خدا کا کلام ہے اور اس کا ماننا اور اس پر عمل کرنا ہم پر فرض ہے۔

(۲) اصل تعظیم یہ ہے کہ قرآن کریم کے احکام پر ہمارا عمل ہو، اور ظاہری تعظیم یہ ہے کہ کلام اللہ پر عمل کرنے کے ساتھ کلام اللہ کے مروّج احترام میں بھی کوئی دقیقہ رہ نہ جائے باطن و ظاہر دونوں حیثیتوں سے ہم پر وہ دونوں حدیثیں صادق آئیں جن میں ایک سے کان خلقہ القرآن کی ترغیب نکلتی ہے اور دوسری تخلقوا باخلاق اللہ کی ہدایت کرتی ہے ظاہر ہے کہ اخلاق اللہ سے تخلق بغیر اس کے ممکن نہیں کہ ہم کلام اللہ سے رجوع کریں اور باطن و ظاہر ہر حیثیت سے اس کی تعظیم بجالائیں۔

(۳) یہ نہایت مخدوش استدلال ہے کہ "فلاں بزرگ جو تنکا نظر آتا تھا اس کو اٹھا لیتے تھے کہ یہ الف کی شکل اور یہ ب کی صورت ہے۔ فلاں بزرگ نے صحن کے کھیت میں داخل ہوتے ہی جوتا اتار لیا کہ اس کا کاغذ بنتا ہے اور اس پر قرآن شریف لکھا جاتا ہے میں اس میں جوتا پہنے کیوں کر چلوں" بے شبہ یہ واقعات

ان بزرگوں کے کمال احترام کا نتیجہ ہیں۔ مگر جہاں وہ اس ظاہری ادب کے پابند تھے وہاں کلام اللہ کی اصلی عظمت بھی ان کے دل میں اس قدر تھی کہ تمام عادات واطوار اسی کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے اور اسی کے نمونے بنے ہوئے تھے۔

(۴) ظاہری تعظیم یعنی بے طہارت نہ چھونے کے لئے قرآن کریم سے جو دلیل پیش کی جاتی ہے اس سے یہ مقصد نہیں ثابت ہوتا۔

(۵) جو لوگ خدانخواستہ آیات قرآنی کی بے حرمتی کرتے ہیں وہ خود گنہگار ہوں گے۔ لیکن اس خوف سے یہ مناسب نہیں کہ مسلمانوں کی تحریر و تقریر میں آیتیں آنے ہی نہ پائیں۔ خدائے تعالیٰ کے احکام میں تو ابھی تک اس ممانعت کی تصریح نظر نہیں آئی۔

(۶) یہ فتویٰ کہ بجائے آیت نقل کرنے کے سورہ و آیہ کا نمبر لکھ کر اس کے ترجمہ کا حوالہ دیدیا کریں شاید ان راسخ الاعتقاد مسلمانوں کے لئے تشفی بخش نہ ہو جن کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے کسی جزو کا ترجمہ بغیر اصل عبارت کے لکھنا اس لئے قابل احتراز ہے کہ ممکن ہے کسی وقت میں یہ رواج عام ہو جائے انجیل و توریت کی طرح قرآن کے لئے بھی لوگ صرف ترجمہ کافی سمجھنے لگیں اور انہیں کی طرح مبادا اس میں بھی تحریف کی گنجائش نکل سکے۔

یہ امر بھی قابل غور ہے۔ کہ کیا تعظیم صرف قرآن کے الفاظ کی ہونی چاہئے اس کے مطالب کی نہ ہونی چاہئے۔ لفظ کی عظمت میں اگر معنے کا دخل ہے تو کیا وجہ ہے کہ کلام اللہ کے صرف الفاظ مقدس مانے جائیں۔ لفظ و معنی اگر دونوں مقدس و متبرک ہیں تو کیا یہ جائز ہے کہ آیات قرآنی کے الفاظ تو اس لئے نہ لکھے جائیں۔ کہ ان کی بے ادبی ہوگی اور معانی ترجمہ کرکے اس لئے لکھدیئے جائیں کہ اس کی بے ادبی ہوئی بھی تو کچھ مضایقہ نہیں۔

افکار بشری کی آزادی میں قرآن کا حصہ

(شیخ عبدالعزیز شاولیش مرحوم کے خطبات)

(خطبۂ اوّل)

اب سے چند سال قبل مصر کے مشہور فاضل شیخ عبدالعزیز شاولیش مرحوم نے مدرسہ دارالعلوم قاہرہ میں عنوان مذکور پر چار خطبات دیئے تھے جن کا ترجمہ صفحات ذیل میں درج کیا جاتا ہے ضروری نہیں ہے کہ شیخ کے تمام خیالات سے ہم متفق ہوں لیکن مجموعی حیثیت سے ہم خیال کرتے ہیں کہ شیخ نے جس پہلو سے قرآن حکیم پر نظر ڈالی ہے اس پہلو پر بہت کم لوگوں نے توجہ کی ہے۔ (ایڈیٹر)

حضرات!

غالباً یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ فکر بشری کی تحریک تحریر (آزادی) میں قرآن مجید کے اثر کو بیان کرنے سے پہلے میں آپ کے سامنے ایک مختصر تاریخی بیان پیش کروں جس سے معلوم ہو کہ ظہور اسلام سے پہلے دنیا کی بڑی بڑی قومیں کن انقلابات سے گذری ہیں اور اس کے بعد کئی صدیوں تک قوموں کی عقلوں میں کسی قسم کا مد و جزر اور آزادی و غلامی الٹ پھیر رہا ہے، یہ بیان ہم کو اس بات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنے میں مدد دے گا کہ قرآن نے عقل انسانی کو اس کا پورا پورا حصہ دلانے اور اسے اس مقام تک پہنچانے میں کس قدر حصہ لیا ہے جس تک انسان کے خالق نے اول آفرینش میں اس کا پہنچنا مقدر فرمایا تھا۔

سلطنت رومیہ (Roman Empire) کے عام سیاسی قانون کی بنیاد ادیان و عقائد اور افکار کی کھلی ہوئی آزادی پر تھی، اور وہاں یہ حالت برابر قائم رہی تا آنکہ مسیحی مذہب یورپ میں داخل ہوا اور اس کے ساتھ

ہی روک ٹوک اور قیود اور بندشوں کا وہ دور شروع ہوا جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

قدیم زمانہ میں بعض شعرا یونان اور مذہبی پیشواؤں کے اثر سے لوگ جن خرافات اور رسوم اور تنگ نظری و تنگ دلی پیدا کرنے والے افسانوں کے جال میں پھنسے ہوئے تھے ان سے افکار کو آزاد کرانے میں سب سے زیادہ جن لوگوں نے حصہ لیا ان میں ہراقلیتوس (HERACLEITUS) اور دیمقریطس (DEMOCRITUS) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ان دونوں نے مادۂ طبیعیہ کی تحقیق و تفتیش کے بعد نفس بشری کے احوال اور سیاسی مسائل سے بحث کی، اور اپنی تمام کوششوں اور کاوشوں میں ایک ہی چیز کو اصل الاصول قرار دیا یعنی ہر شے کو عقل اور فکر کی کسوٹی سے پرکھنا۔ یہی طریقہ انکساغورس (ANAXAGORAS) کا بھی تھا اس نے لوگوں کو بتایا کہ یہ سورج جس کی تم صبح شام پوجا کیا کرتے ہو، یہ محض آگ کا ایک تودہ ہے، خدا نہیں ہے کہ اس کی پرستش کی جائے۔

انسانی عقل کو اوہام کی بندشوں سے آزاد کرانے میں ان فلاسفہ نے جو کچھ کیا اسی نے اُن علمار تربیت کے لئے راہ صاف کی جو سوفیہ یا سفسطائیہ (SOPHISTS) کے نام سے موسوم ہیں، جو پانچویں صدی قبل مسیح ظاہر ہوئے اور جنہوں نے قرن مذکور کے نصف ثانی میں اخلاق و سیاست کے نقطۂ نظر سے حیات اجتماعی کے قواعد و اصول وضع کئے اور خطا و صواب، عقل اور قوانین منطق و خطابت وغیرہ سے بحث کی۔ لیکن یہ سب باتیں ایک بہت ہی قلیل طبقہ علما اور مفکرین کے طبقہ) سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ رہے عوام، تو وہ ہر جگہ خرافات اور باطل عقاید کے دام میں اسیر تھے۔ البتہ اس عہد میں ایتھنز (ATHENS) جس آزادی فکر اور سیاسی مسائل میں بحث و کلام کی حریت سے بہرہ مند تھا، اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا خصوصاً ایتھنز کے زعیم حریت پریکل (PERICLES) کے عہد میں کہ وہ آزاد مفکرین کا بڑا حامی تھا اور اُسی کی طاقت نے ایتھنز کے دیوتاؤں سے انکار کرنے والے فلسفی انکساغورس کو قانون کی گرفت سے بچایا۔

اس زمانے کے واقعات و حوادث کے مطالعہ سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ ادیان کے خلاف خروج کرنے والا سزا سے کبھی نہ بچ سکتا تھا اور اس مضمون میں جو کتاب شائع ہوتی تھی اس کے نسخے جمع کر کے جلا ڈالے جاتے تھے اور ان کی فروخت کو ممنوع

قرار دیا جاتا تھا لیکن بعد میں منطقیوں (RATIONALISTS) کے خلاف جو منظم خورشیں اور باقاعدہ سختیاں پہلے ہوتی تھیں وہ پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں کم ہونے لگیں، جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اب ان لوگوں کی تعداد بڑھ گئی تھی اور ان کا گروہ پھیلتا جا رہا تھا۔ یونانیوں اور رومیوں کے ہاں ان کی انتہائی علمی تمدنی اور مادی ترقی کے زمانہ میں جو نظریات مسلم تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مطلقاً مذہب عوام کے لئے نافع اور ضروری ہے جو لوگ حقیقت میں مذہب کے قائل نہ تھے وہ بھی سیاست عامہ کے ایک رکن کی حیثیت سے اس کے فائدے کے ضرور قائل تھے۔ کیونکہ ان کے فلاسفر اکثر اس قسم کے عقائد اور نظریات کی اشاعت کا اقدام کر بیٹھتے تھے جو حیات اجتماعی میں اضطراب اور برہمی پیدا کرنے والے ہوتے تھے۔ یونانیوں میں سے جن لوگوں کا قدم اس میدان میں سب سے آگے تھا ان میں ایک سقراط ہے، جو بجا طور پر ان علماء تربیت میں سب سے زیادہ جلیل القدر سمجھا جاتا ہے جس چیز نے اس کو نابغۂ روزگار بنا دیا تھا۔ وہ یہ تھی کہ وہ نکتہ چینی اور مناقشہ کے طریق میں نہایت مضبوط تھا اور جو لوگ اس سے گفتگو کرتے یا اس کا کلام سنتے ان کو اپنے زور تقریر سے اس نقطہ پر کھینچ لاتا تھا کہ معروف و مقبول عام عقائد کو بغیر جانچے پرکھے تسلیم نہ کریں، ان کو عقل و فکر کی کسوٹی پر کس کر دیکھیں رسوم و تقالید کی بندشوں میں بند ہے نہ رہیں عوام کی خواہشوں اور مذہبوں سے بے پروا ہو جائیں اور بحث و تحقیق کے لئے اپنے سینے کو کشادہ کر لیں سقراط نے علم کی اشاعت اور تلاش حق اور فکر صحیح کے طریقوں کی جانب اپنے عہد کے نوجوانوں کی رہنمائی کے لئے یہ طریقہ اس لئے اختیار کیا تھا کہ پانچویں صدی قبل مسیح کے وسط میں یونان ایک ایسی فکری حرکت کا میدان بنا ہوا تھا جس کی ابتدا کرنے والے یا تو پیٹ کا دھندا چاہتے تھے یا شہرت و نام دری کے طالب تھے۔ ان لوگوں نے اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لئے جدل و تشکیک کے طریقوں میں غلو کی انتہا کر دی تھی، اور ان کو اس کی کچھ پروا نہ رہی تھی کہ ان طریقوں سے لوگ کس قدر گمراہ ہوں گے اور اس کے کیسے بُرے نتائج ظاہر ہوں گے ان لوگوں نے حق اور باطل، فضیلت اور رذیلت کو ایسا گڈمڈ اور غلط ملط کیا کہ لوگوں کے لئے صحیح اور غلط میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا، اور علم صحیح کے نشانات دیدہ و ر نگاہوں سے چھپ گئے انہوں نے فکر و نظر کے

شعبوں میں سے کوئی شعبہ اور معرفت کے میدانوں میں سے کوئی میدان نہ چھوڑا جس کے اساس و ارکان میں تشکیک کے تیشے نہ چلائے ہوں نہ اس غرض سے کہ کسی علمی فائدے تک پہنچیں یا صحیح نتائج حاصل کریں، بلکہ محض بھٹکنے اور بھٹکانے کے لئے، محض جاہل بننے اور بنانے کے لئے۔

پس جب سقراط عقل زندیں لئے سدید اور علم صحیح لے کر آیا تو اس کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق کلام کرے اور اُن کی رہنمائی کے لئے اسی راستہ پر چلے جس پر دوسرے لوگ ان کو گمراہ کرنے اور ان کو بھٹکانے کے لئے چلتے تھے۔ اگر وہ ان کی تعلیم و ارشاد میں ان راہوں سے الگ کوئی راہ اختیار کرتا جن کے وہ لوگ گرویدہ ہو چکے تھے، تو وہ نہ ان کو اپنے طریقہ کی طرف کھینچ سکتا اور نہ اپنے مقاصد میں کوئی کامیابی حاصل کرسکتا۔ سقراط کے زمانہ تک تربیت عالیہ کو یونان کے سیاسیین اور مفکرین کے مقاصد میں شامل ہونے کا شرف حاصل نہ ہوا تھا، باوجودیکہ ایتھنز اس عہد میں اپنی جمہوریت اور رواداری اور آزاد خیالی کے لئے تمام دنیا میں مشہور تھا۔ مگر تاریخ ہمکو حریت فکر کی طرف دعوت دینے والوں اور عقل سے فیصلہ چاہنے والوں کے خلاف اہل ایتھنز کے ظلم و ستم کی وہ وہ داستانیں سناتی ہے جن کے باور کرنے سے ذہن انکار کرتا ہے۔ سقراط مناظرہ و مجادلہ اور تشکیک و نقد کے فن میں پرلے درجہ کا ماہر تھا، اور لوگوں کے رسوم و عقائد کی پابندیوں سے اس کی آزادی مشہور تھی اس کے مقابلے میں یونانیوں کے اندر ایک ایسی روح کام کر رہی تھی جو جدید عقلی زندگی کی دشمن تھی۔ وہ فلاسفہ اور ان کے سردار سقراط سے جنگ کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے جھوٹے قصے گھڑ گھڑ کر ان کو بدنام کیا، ان کا مذاق اڑایا سقراط جیسے شخص کو زندیق، بدعمل اور گمراہی کی طرف بلانے والا مشہور کیا، یہاں تک کہ یونانی قوم اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کو ملحد اور نوجوانوں کے عقاید خراب کرنیوالا قرار دیکر ۳۹۹ قبل مسیح میں قتل کردیا۔ اس پر نوجوانوں کے عقاید خراب کرنے کا الزام تھا اس کو رد کرتے ہوئے اس نے دو باتیں پیش کی تھیں۔

۱۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ جب وہ دیکھے کہ اس پر ظلم کیا جا رہا ہے تو اس کا مقابلہ کرے، خواہ نتیجہ مخالف ہو یا موافق اور چاہے وہ ظلم کرنے والا کوئی صاحب اثر آدمی ہو، یا کوئی محکمہ ہو۔

سوا اپنی بات سے ہرگز نہ ٹلے کیونکہ آزاد مباحثہ میں بڑی مصلحت ہے اور یہی چیز علم صحیح کی ضامن ہے۔ اس کے ۷۰ برس بعد ارسطو کو بھی اسی انجام کے خوف سے ایتھنز چھوڑنا پڑا، کیونکہ وہاں اس کو بھی ملحد شمار کیا جانے لگا تھا۔

سقراط کے سب سے زیادہ جلیل القدر شاگرد افلاطون نے ایک نئی ضرب لگائی جس نے حریت فکر و مباحثہ کی جانب پیشقدمی کو رجعت سے بدل دیا وہ اپنی مثالی ریاست (Ideal state) میں لوگوں کو ایک خاص دین قبول کرنے پر مجبور کرتا ہے جس کا خاکہ خود اس نے پیش کیا ہے جو کوئی اس دین پر ایمان نہ لائے افلاطون اس کو قتل اور قید کی سزا دینا چاہتا ہے۔ وہ گفتگو اور مباحثہ کی آزادی کو بھی سزاؤں سے روکتا ہے جو اس نے اپنی کتاب میں تجویز کی ہیں۔

سقراط کی تعلیمات ایک ایسا سرچشمہ تھیں جس سے فلسفہ کے متعدد مذاہب رونما ہوئے اور فلاسفہ کا ایک متاز گروہ پیدا ہوا جن میں افلاطون اور ارسطو اور رواقیہ (Stoics) وغیرہ شامل ہیں جن کے مذاہب تیسری صدی قبل مسیح سے بلاد یونان کے اطراف میں پھیلنے شروع ہوئے، اور جنہوں نے عقلی زندگی کے دروازے کھول دیئے اور اہلِ یونان میں فکر و تدبر کی قابلیت پیدا کی۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابلِ بیان ہے کہ گو ابیقورس (Epicurus) اس وجود میں تدبیر و تصرف کرنے والی خدائی حکومت کا منکر تھا، اور اس کی نظر مادّہ اور مادّیات کی حدود سے آگے نہ بڑھ سکی تھی مگر اس کے باوجود وہ جدّتِ فکر کی دشوار گذار گھاٹیوں سے اس حیرت ناک سرعت کے ساتھ گذرا کہ سوتی ہوئی عقلیں چونک پڑیں اور صدیوں تک زمانہ اس کے اثر کو نہ مٹا سکا حتّٰی کہ ایک رومی شاعر کو تو اس کے فلسفہ میں وحی الہام کا جلوہ نظر آیا جس کو اس نے اپنے قصیدے "طبیعۃ الدنیا" نامی میں بیان کیا ہے۔

انسانی عقل کی آزادی میں رواقی فلسفہ کا بھی کچھ کم حصہ نہ تھا بلکہ درحقیقت اس مذہب نے ان قوانین اجتماعیہ کو ایک منظم اور مفصل طریق پر پیش کیا جن کا سقراط نے کچھ بھی ذکر کر دیا تھا رواقی فلسفہ نے لائی

قوانین پر خاص اثر کیا، کیونکہ رومی سلطنت کے قانون مدنی کی بنیاد تمام ادیان کی کھلی ہوئی آزادی اور اظہار رائے کی پوری حریت پر تھی، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

(خطبہ دوم)

حضرات!

رومی سلطنت اسی آزادی فکر اور حریت دینی کے قانون پر چل رہی تھی کہ مسیحی مذہب یورپ پہنچا اور رومی قوم نے اپنی صنم پرستی کی حفاظت کے لئے مذہبی آزادی کے اصول کو خیرباد کہہ دیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ رومی اس مذہب کو یہودیت کی ایک شاخ سمجھتے تھے اور یہودیت بالطبع رومیوں کے وثنی عقاید کی مخالف تھی اور رومیوں کو ایک آن نہ بھاتی تھی، یہودیت اور اس کے شبہ میں مسیحیت سے رومیوں کی شدید نفرت اور بغض کا نتیجہ یہ ہوا کہ تراجان (TRAJAN) نے ان لوگوں کے قتل کا حکم دے دیا جو دین نصرانی کے پیرو تھے اگرچہ اس کے ساتھ ایسی قیود بھی عاید کر دیں کہ حد سے زیادہ قتل عام نہ ہونے پائے لیکن بعد میں قیصر ڈیو کلیتیان (DIOCLETIAN) نے حکومت سے مذہب کی تائید کرنے کا عزم کر لیا اور پوری سنگدلی اور قساوت کے ساتھ مسیحیوں کا قتل عام کرایا۔ در حقیقت جس چیز نے اس فرمانروا کو ان جرائم پر آمادہ کیا وہ یہ تھی کہ مسیحیت رومیوں کی اس عبادت کی مخالف تھی جس کا مرکز روما یعنی پایۂ تخت تھا بخلاف اس کے رومی فرمانروا اس کو ضروری سمجھتے تھے، کہ قومیں ان کو اپنی عبادت کے لئے مخصوص کر لیں تاکہ ان کی وحدت قومی باقی رہے اور اس تخت سے انکا خاص تعلق قائم رہے جو پوری سلطنت کا مرکز ہے۔

لیکن قسطنطین اعظم کے نصرانیت میں داخل ہوتے ہی نقشہ بدل گیا۔ اس سے پہلے دو صدیوں تک تو مسیحیت کے پیشوا یہ اعلان کرتے رہے تھے کہ مذہبی رواداری واجب ہے اور عقاید وہ چیز نہیں ہیں جو زبردستی انسان کے سر چیپکی جا سکتی ہو مگر قسطنطین کا مسیحیت میں داخل ہونا تھا کہ سرے سے یہ سب اصول پلٹ گئے۔ اب حکام اور فرمانروا بیشتر سیاسی اغراض کے لئے، اور عوام کے مختلف گروہ آپس کے مذہبی اختلافات کی بنا پر فتنوں کے شعلے بھڑکانے لگے جگہ جگہ ہولناک قتل عام برپا کرنے لگے دنیا سے امن و سلامتی رخصت ہو گئی دلوں سے راحت و اطمینان کی متاع چھن گئی۔

ان کی تعلیم یہ تھی کہ نجات مسیحیت قبول کئے بغیر ہو نہیں سکتی، اور جو اس کو قبول نہ کرے اس کو کوئی فدیہ نہ عذاب نیلے سے بچا سکتا ہے اور نہ عذاب آخرت سے چاہے اس میں کیسے ہی فضائل ہوں اور اس نے کیسے ہی نیک کام کئے ہوں وہ کہتے تھے کہ اگر بچہ بپتسمہ لئے بغیر مر جائے تو وہ آخرت میں ہمیشہ ہمیشہ پیٹ کے بل دوزخ کی زمین پر گھسٹتا رہے گا، ان کے مقدس ترین آدمیوں میں سے ایک سینٹ اگسٹائن (ST. AUGUSTINE) متوفی ۴۳۰ء نے نصرانیت قبول نہ کرنے والوں پر جبر و ظلم کرنے کے لئے ایک نظام مقرر کیا تھا جو اس کے بعد بارہویں صدی تک مسلسل چلتا رہا جب کبھی نصاریٰ کے درمیان کوئی بدعت رونما ہوتی یا کوئی ایسا عقیدہ نکلتا جو چرچ کے نفوذ و اثر کو کم کرنے والا ہوتا، تو اس عقیدہ کے پیرودں پر پادریوں کی طرف سے سختیاں کی جاتیں اور ان کو سزائیں دینے میں انتہائی مبالغہ کیا جاتا تھا پوپ انوسنٹ سوم (INNOCENT) نے کونٹ طولوز کو حکم دیا کہ اپنی رعایا میں سے اس گروہ کا استیصال کر دے جس پر مذہبی بدعت کا الزام تھا، اور جب کونٹ نے اس کا حکم نہ مانا تو پوپ نے اس کے خلاف صلیبی جہاد کیا جس میں اس کی قوم فنا ہوتے ہوتے رہ گئی، کونٹ کی املاک ضبط کی گئیں اس کی شوکت مٹا دی گئی، اور پوپ نے اس سے اس وقت تک صلح نہ کی جب تک کونٹ نے اپنے ملک سے اس مذہب کا کلی استیصال کر دینے کی شرط نہ مان لی۔

اس طرح ۱۲۳۳ء میں ملحدین کی تحقیقات کے لئے نظام تفتیش (INQUISITION) قائم کیا گیا اس کی تنظیم پوپ انوسینٹ چہارم کے عہد میں ۱۲۵۲ء میں مکمل ہوئی۔ تمام نصرانی ممالک میں اسے پھیلایا گیا۔ پادریوں کو اس میں مفتش مقرر کیا گیا۔ پاپاؤں کی جانب سے ان کو مطلق اختیارات عطا کئے گئے جن کے استعمال میں ان سے کوئی بازپرس نہ کی جاتی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی نصرانی سلاطین نے بھی ملحدوں کو سزائیں دینے کے لئے سخت ظالمانہ قوانین مقرر کئے۔ باوجودیکہ فریڈرک دوم (FREDERICK) نہایت آزاد خیال شخص تھا لیکن انہی بھی ایک حکم صادر کیا کہ جو کوئی نصرانیت میں کوئی بدعت نکالے وہ دین سے خارج سمجھا جائے، اگر توبہ نہ کرے تو جلا دیا جائے اگر توبہ کرے تو قید کیا جائے۔ اور اگر توبہ سے پھر جائے تو قتل کر دیا جائے اور بہر صورت ان سب کی املاک ضبط کی جائیں اور ان کے گھر ڈھا دیئے جائیں۔ ان کے بچے اور عورتیں تک رحم کے مستحق نہیں ہیں۔ اگر وہ ملحدین و مبتدعین کی

مخبری نہ کریں (چاہے وہ ان کے باپ ہی کیوں نہوں) تو ان کے ساتھ بھی وہی سختی کا برتاؤ کیا جائے۔ فریڈرک نے الحاد اور بدعت کے لئے سولی کی سزا مقرر کی تھی یہ حکم اٹلی اور جرمنی میں ۱۵ سال تک سنہ ۱۲۲۰ء سے سنہ ۱۲۳۵ء جاری رہا۔

پھر نظام تفتیش تمام مغربی یورپ میں پھیل گیا۔ ہنری چہارم و پنجم کے زمانہ میں انگلستان میں بھی الحاد کی سزا سولی سے دی جاتی تھی۔ یہ قانون سنہ ۱۴۰۱ء میں جاری ہوا، سنہ ۱۵۳۳ء میں منسوخ ہوا پھر دوبارہ ملکہ میری کے عہد میں جاری کیا گیا اور سنہ ۱۶۷۷ء میں آخری مرتبہ منسوخ ہوا لیکن مسلمانوں اور یہودیوں کے خلاف بدترین وحشیانہ طریقوں کے ساتھ اس قانون کو برابر جاری رکھا گیا، اور اس کی قانونیت انیسویں صدی میں منسوخ کی گئی۔ اس دوران میں یہ قانون ان مسلمانوں اور یہودیوں پر نافذ کیا جاتا تھا جن پر ارتداد کا الزام ہوتا تھا، مختصر یہ کہ نظام تفتیش نے یہ قاعدہ کلیہ مقرر کر رکھا تھا کہ "سو بے گناہوں کا قتل کیا جانا اس سے بہتر ہے کہ ایک شخص الحاد کرے" اس قاعدہ کے مطابق وہ کم سے کم شبہ کی بنا پر بھی لوگوں کو قتل کرتے اور جلا ڈالتے تھے، اور کسی کو اپنی طرف سے مدافعت پیش کرنے کا حق نہ تھا، اور نہ کوئی محکمہ کسی حال میں تردیدی شہادت قبول کرتا تھا چنانچہ پوپ الیسنٹ ہشتم نے سنہ ۱۴۸۴ء میں اعلان شائع کیا کہ طاعون اور آندھیوں کا آنا دراصل جادوگروں کے عمل کا نتیجہ ہے لہذا ہر جگہ ان کو تلاش کرو اور جہاں ملیں بری طرح مارو اور قتل کرو۔ یہ حکم خصوصیت کے ساتھ انگلینڈ اور اسکاٹلینڈ میں زیادہ زور کے ساتھ نافذ کیا گیا۔

بارہویں صدی کے آخر میں ایک دوسری دنیا سے اہل یورپ کی عقلوں کے لئے ایک نئی روشنی پہنچی تاکہ انہیں ان بندشوں اور بندھنوں سے آزاد کرائے جن میں وہ جکڑی ہوئی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغربی یورپ میں اہل عرب کے واسطے سے فلسفہ ارسطو کی تعلیم پھیل رہی تھی۔ یورپ والوں کی عقلوں کو آزاد کرانے میں ابن رشد اور اس جیسے دوسرے فلاسفہ اسلام کا بڑا حصہ ہے اور ان کی تعلیمات کے اثر کو مٹانے اور ان کا مقابلہ کرنے میں پاپاؤں کا حصہ بھی کچھ کم نہیں ہے پوپ یوحنا بیست و دوم ابن رشد کی تعلیمات کی سخت مخالفت کرتا تھا اور اس کے وجود اور اس کی اشاعت کو صد درجہ مضر بتاتا تھا، جنوبی اٹلی میں سینٹ ٹامس اکوئن نے سنہ ۱۲۷۴ء میں

ارسطو اور مسلمانوں کے فلسفہ کے مقابل کنیسہ کے لئے ایک فلسفہ ایجاد کیا جس پر اب تک رومن کیتھولک چرچ قائم ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کے فلسفہ میں انسانی عقل کو کوئی جائے قرار نہیں ملتی بلکہ وہ اسے ایک تنکے کی طرح ہوا میں اس طرح اڑائے لئے پھرتا ہے کہ کہیں وہ ٹھیر نہیں سکتا۔

مورخین کا اس پر اجماع ہے کہ حرکت فکری اور نہضت علمی یورپ میں ۱۳ ہویں صدی عیسوی کے قریب دو راستوں سے داخل ہوئی: ایک وہ تصادم جو دو صدیوں تک صلیبی لڑائیوں کے زمانے میں فرنگی اقوام اور اسلامی مشرق کے درمیان ہوتا رہا دوسرے وہ معاہدہ علمیہ جو عربوں نے اندلس نیپلز اور صقلیہ میں قائم کئے۔ اور محقق مورخین یہ بھی ثابت کر چکے ہیں کہ یورپ میں جن لوگوں سے نہضت علمیہ کی تاریخ شروع ہوتی ہے، مثلاً راجر بیکن وغیرہ، وہ عربی زبان جانتے تھے اور لاطینی سے بھی واقف تھے جس میں قریب قریب ہر فن کے متعلق عربوں کے علوم و مباحث منتقل ہو رہے تھے۔ جہاں کہیں ان لوگوں نے ایجاد و ابداع کے شرف کا دعویٰ کیا ہے، یا یہ شرف ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ انہوں نے عمداً وہ مصادر چھپائے ہیں جہاں سے مسائل انہوں نے اخذ کئے اور اپنے بنا کر پیش کر دیئے۔ ائمہ تاریخ نے ثابت کیا ہے کہ انگریزی راہب راجر بیکن نے جس کی طرف اہل فرنگ علم مناظر و انعکاسات (OPTIOS) میں سبقت کا شرف منسوب کرتے ہیں، یہ مسائل ابن الہیثم سے اخذ کئے تھے جو طبیعات اور خصوصاً نور اور بصریات کے مسائل میں اہم مباحث لکھ گیا ہے۔ پس وہ اہل قرآن ہی تھے جن کے ساتھ ربط و تعلق نے اہل یورپ کی آنکھیں کھولیں ان کی بصیرت پر سے جہالت کے پردے ہٹائے، اور صدیوں کی چھائی ہوئی تاریکی سے ان کو نکالا اگر مغرب کے باشندے اس وقت ہر حیثیت سے اسی مرتبۂ عقلی پر ہوتے جس پر اہل قرآن تھے، تو عربی تمدن اور اسلامی حریت فکر سے رابطہ قائم ہونے کے بعد ان کی فکری بیداری میں ذرا سی بھی تاخیر نہ ہوتی لیکن اس زمانے میں مذہبی پیشواؤں کی گرفت ایسی مضبوط تھی اور مسیحی دنیا کی عقلیں کچھ اس طرح ان کی غلامی میں پھنسی ہوئی تھیں کہ اسلامی تمدن کے اثرات پوری قوت کے ساتھ آگے نہ بڑھ سکے، جو فلسفہ ان کے ہاں پہنچا اس کا رخ مذہبی پیشواؤں نے دینی مباحث کی طرف پھیر دیا اور کنیسہ کی چار دیواری میں اس کو مقید کر دیا۔

اور اس طرح اس کی غایتِ طبیعی تک نہ پہنچنے دیا۔

۱۵۲۰ء میں کیتھولک چرچ کی جانب سے اس مضمون کا جو فرمان جاری کیا گیا تھا کہ تمام مجادلات سے پرہیز کیا جائے، اور تورات و انجیل کی تفسیر بجز اس طریقہ کے کسی اور طریقہ سے نہ کی جائے جو کنیسہ نے مقرر کر دیا ہے، اس نے نصرانی قوموں میں عام ناراضی پھیلا دی تھی اور یہ حکم منجملہ ان اسباب کے ایک بڑا سبب تھا، جن کی بدولت پراٹسٹنٹ مذہب پیدا ہوا لیکن اس کے باوجود اسی پراٹسٹنٹ مذہب کے بانی لوتھر نے یہ قاعدہ مقرر کیا کہ حکومت، قوم کو وہ عقیدہ اختیار کرنے پر مجبور کر سکتی ہے، جسے وہ صحیح سمجھتی ہو، اور اسے حق ہے کہ ملحدوں اور اس عقیدہ کا انکار کرنے والوں کا استیصال کر دے ایسی قسم کے عقل کش قواعد و اصول تھے جنہوں نے ایک مدت تک حرکتِ فکریہ کو اپنی اصلی رفتار پر نہ چلنے دیا۔

آخر کار سولہویں صدی کے اواخر میں انگلستان کا فلسفی فرانسس بیکن ظاہر ہوا جس نے فلسفہ دینی پر زبردست حملے کئے اس کے عالیشان قصر کو دلائل کے تیشوں سے ڈھا کر رکھ دیا۔ لوگوں کو عقلی آزادی کی طرف دعوت دی، اور علمی مسائل پر جدید اسالیب سے بحث کرنے کی بنا ڈالی علمی تحقیق کرنے والوں نے اس کی رہنمائی کو قبول کیا اور اس وقت سے تجدیدِ علمی اور تجریدِ عقلی کا وہ دور شروع ہوا جس کے ثمرات سے اب تک مشرق و مغرب متمتع ہو رہے ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ یورپ میں تاریخ فلکِ جدید کی ابتدا ۱۵۴۳ء سے ہوئی ہے یہ وہ زمانہ ہے جب کوپرنیکس (COPERNICUS) کی کتاب شائع ہوئی جس میں اس نے سورج کے گرد زمین کا گھومنا ثابت کیا تھا پھر گیلیلیو (GALILEO) نے اپنی دوربین کے ذریعہ سے مریخ کے چاند ثابت کئے اور یہ بھی ثابت کیا کہ زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے پھر کنیسہ نے ان اکتشافات کا استقبال کس طرح کیا؟ فروری ۱۶۱۶ء میں مکتب مقدس نے فیصلہ کیا کہ کوپرنیکس کا مذہب نہایت رکیک ہے، اسے مسیح کی وصیت کے مطابق بدعتی ٹھیرایا گیا اور اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط تک مدرسہ نظامِ شمسی کی تعلیم سے محروم رکھا گیا اس ممانعت نے اٹلی میں علومِ طبیعیہ کی ترقی پر بہت بڑا اثر ڈالا اسی طرح پوپ الگزینڈر نے ۱۵۰۱ء میں مطابع پر نگرانی قائم کر دی تاکہ ایسے آزاد خیالات جن کو کنیسہ پسند نہ کرتا ہو، شائع نہ ہونے پائیں، چاہے وہ ثابت شدہ علمی حقائق ہی کیوں نہ ہوں۔ فرانس میں ماہرینِ علم

نے اس شخص کے لئے قتل کی سزا مقرر کی تھی جو کوئی چیز بلا اجازت طبع کرے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یورپ کے کسی حصہ میں پریس کو انیسویں صدی سے پہلے آزادی نصیب نہیں ہوئی۔ یہی زمانہ ہے جس میں کنیسہ کا اقتدار ضعیف ہوا۔ اور ملوک و امرا ردینیت کا اقتدار بڑھا اور دستوری نظم و قوانین کا چرچا ہوا۔ فرانس میں جمہوری حکومت قائم ہوئی ز ۱۷۹۲ء تو پاپ کے اقتدار کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ کنیسوں کے خلاف ایک زبردست حرکت شروع ہوئی۔ پیرس میں تمام معابد کو بلا استثنا ر بند کر دینے کا حکم دے دیا گیا پھر جب ٹلیس پیر (ROBESPERRE) برسرِ حکومت آیا تو اس نے طے کیا کہ حکومت کا مذہب بزرگ و برتر کی عبادت ہو۔ اس کے تھوڑی مدت کے بعد ایک نیا دین ایجاد کیا گیا جس کا نام دین فطرت تھا اور یہ اس صدی کے فلاسفہ اور شعراء مثلاً والٹیر (VOLTAIRE) وغیرہ کا مذہب تھا۔ اس کے قواعد یہ تھے کہ خدا اور بقاء روح کا اعتقاد رکھو، اور اخوت و انسانیت و رحمت کو شیوہ بناؤ، ورنہ اس دین کی دوسرے ادیان و مذاہب کشمکش برپا ہو جائے گی۔ اس نئے مذہب کو دین محبت الٰہی (THE OPHILANTHROPY) کے نام سے موسوم کیا گیا۔ مگر ۱۸۰۱ء میں نپولین نے اس مذہب کا تختہ الٹ دیا اور پاپائیت دوبارہ میدان میں آگئی۔ اس حرکت سے نپولین کا مقصد بجز اس کے کچھ نہ تھا، کہ روحانی اقتدار فائدہ اٹھائے اور آئندہ کی لڑائیوں میں اس سے کام لے اور کیتھولک دنیا میں اپنی سلطنت وسیع کرے۔

سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں بہت سی مسیحی جماعتوں کا عقیدہ اس وجہ سے متزلزل ہو گیا کہ اس زمانہ میں یہ خیال عام طور پر پھیل گیا تھا کہ تورات اور انجیل کے بیانات میں تضاد اور اختلاف ہے جس کو قبول کرنے سے عقل انکار کرتی ہے۔ اس سے انکار وحی کا خیال پیدا ہو گیا اور جگہ جگہ علمی مناقشات ہونے لگے انیسویں صدی میں قدیم رسوم و عقائد کے خلاف زیادہ منظم حملے ہوئے اور ان میں سے اکثر کی جڑیں اکھاڑ پھینکی گئیں۔ اگرچہ اس زمانے کے علماء میں خود بھی باہم اختلاف تھا بعض کھلم کھلا ان تقالید کے منکر تھے اور ان کو غیر معقول اور رکیک سمجھتے تھے، اور بعض اس حد تک نہیں پہنچے تھے۔ فرانسیسی عالم پاسکل (PASCAL)

ان پر ایمان رکھتا تھا۔ اگر چہ فلسفی لیکن ظاہر میں لاہوتیت کا اعلان کرتا تھا۔ مگر دل میں الحاد چھپائے ہوئے تھا۔ دوسری طرف رینے ڈیکارٹ (RENE DESCARTES) کوشش کر رہا تھا کہ عقل اور کنیسہ میں موافقت پیدا کرے۔ اس زمانہ میں بسا اوقات ہم کو کنیسہ پر عقل کا غلبہ علانیہ نظر آتا ہے۔ مثلاً جادوگروں کے معاملہ میں یا تو ہم یہ دیکھ رہے تھے کہ ۱۶۱۱ء میں جیمز اول انجیل کی آیت "تو جادوگر کو زندہ نہ چھوڑ" کے مطابق عمل کر کے ان مسکینوں سے نہایت سختی کے ساتھ پیش آرہا ہے یا دوسری طرف ہمکو یہ نظر آتا ہے کہ پھر لفور طرشائر کی ایک جادوگرنی کو جیوری سزائے قتل کی مستحق قرار دیتی ہے مگر جج ان کی بات کو قبول نہیں کرتا اور کنیسہ کی تعلیمات اور عام رسم کو نظر انداز کر کے اسے رہا کر دیتا ہے اگرچہ انگلستان میں ساحر کے قتل کا قانون ۱۷۳۶ء میں منسوخ ہوا لیکن اس کے بعد بھی ۱۸۰۸ء میں سکاٹلینڈ کی ایک عورت اس الزام میں زندہ جلائی گئی۔

قابل ذکر مذاہب میں سے ایک وہ ہے جس کی بنا ہالینڈ کے یہودی فلسفی اسپینوزا (SPINOZA) نے رکھی اس کا عقیدہ یہ تھا کہ عالم کا ایک خدا ہے جو اپنی ذات سے قائم ہے اور یہ کہ انسان اپنے ارادہ میں آزاد نہیں ہے اور علت اولیٰ یا علت العلل کا اعتقاد خرافات میں سے ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ وحدت الموجود یا وحدت الوجود کا اعتقاد رکھتا تھا۔ یہ ملحوظ خاطر رہے کہ یہ کلمہ سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں آزاد مفکرین کے رموز میں سے تھا، کیونکہ اس پر عالم غضب اور تکفیر کا طوفان برپا ہو جاتا تھا اس کا اظہار صرف دقیق کتابوں ہی میں کیا جا سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں جتنے لوگ آزاد خیال کہے جا سکتے تھے وہ سب کے سب الٰہیین تھے، جو خدا پرستی کے تو قائل تھے مگر وحی کو نہ مانتے تھے۔

اسپینوزا کے معاصرین میں سے ایک لوک (LOCKE) ہے جس کی کتاب (ESSAY ON THE HUMAN UNDERSTANDING) کا لب لباب یہ ہے کہ علم کلیۃً تجربات کا نتیجہ ہے بہر حال میں اعتقاد کو حکم عقلی کے تابع ہونا چاہیے جو چیز حکم عقلی کے خلاف ہو اس کے ماننے سے انکار کر دو خواہ وہ وحی ہی کیوں نہ ہو جو علم صحیح نظر عقلی سے حاصل ہوتا ہے وہ وحی سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس نے ایک کتاب نصرانیت کو عقل کے

موافق بنانے کے لئے بھی لکھی تھی اسی ڈھنگ پر اس کا معاصر بائل بھی چلا جس نے فرانس سے جلاوطن ہونے کے بعد ہالینڈ میں اپنی کتاب القاموس الفلسفی (PHILOSOPHICAL DICTIONARY) مرتب کی۔ وہ کہتا ہے کہ اعتقاد کی فضیلت بس اس میں ہے کہ خدائے واحد کی قدرت اور اس کی فرمانروائی پر ایمان رکھو۔ ایک اور موقع پر کہتا ہے کہ "الیین کے لئے آرتھوڈوکس مذہب کے خدا کی صفات کو اس خدا کی صفات سے تطبیق دینا محال ہے جس کا وجود عقل سے ثابت ہوتا ہے" مگر جب آرتھوڈوکس لوگوں میں سے ایک فریق نے عقل کو حکم بنانا قبول کیا تو وہ گمراہ ہو گئے اور ان میں سے اکثر الحاد کے گڑھے میں جا پڑے۔ الیین اور اسپنیوزا اس امر میں متفق ہیں کہ آسمانی کتابوں کی تفسیر بھی اسی طرح ہوتی چاہئے جس طرح دوسری کتابوں کی ہوتی ہے

سترہویں صدی کے آخر تک الیین کے خیالات پوشیدہ رہے، پھر جب قوانین مطبوعات منسوخ ہو گئے تو انہوں نے کچھ کچھ اپنے خیالات کا اظہار شروع کیا۔ پوری آزادی اب بھی نہ تھی کیونکہ اب بھی چند مزاحمتیں باقی تھیں۔ مثلاً مذہبی پیشواؤں کو حق تھا کہ جو کوئی مسیحی تعلیمات پر اعتراض کرے یا ان کی تقالید کے خلاف رائے ظاہر کرے یا مسیح پر حرف گیری کرے اسے قید کر دیں۔ انگلستان کے لاڈ چیف جسٹس ہیل (SIR MATHEW HALE) نے ۱۶۷۶ء میں قانون عام کی یہ تعبیر کی کہ ہر وہ عمل یا قول جو کنیسہ کی تعلیم کے خلاف ہو، قانون عام کے خلاف ہو، قانون عام کے خلاف سمجھا جائے گا۔ کیونکہ نصرانیت انگریزی قانون عام کے ارکان میں ہے۔ ۱۶۹۸ء کے قانون عام میں یہ تصریح کی گئی کہ کسی نصرانی کے لئے کنیسہ کے اصول اور اس کی تعلیمات کے خلاف رائے ظاہر کرنا جائز نہیں ہے جو کوئی ایسا کرے گا اس کو پہلی مرتبہ خدمت سے محرومی کی سزا دی جائیگی اور دوسری مرتبہ عام مدنی حقوق سے محروم کر دیا جائیگا

اٹھارہویں صدی میں والٹیر اور روسو (ROUSSEAU) نے آزادی فکر کی تحریک کا بیڑا اٹھایا مؤخر الذکر کی کتاب امیل (EMILE) علانیہ پیرس میں جلائی گئی اور حکومت نے اس کے مؤلف کی گرفتاری کا حکم صادر کیا۔ تمام یورپ میں فریڈریک شاہ پروشیا کے سوا کسی نے اس کو پناہ نہ دی۔ مگر وہاں بھی مذہبی پیشوا اس کے پیچھے پڑے رہے یہاں تک کہ اسے پروشیا سے بھی نکلنے پر مجبور کر دیا۔ روسو نے اپنی کتاب العقد الاجتماعی (SOCIAL CONTRACT)

میں جو اشتراکی نظریات بیان کئے ہیں ان کا حیات اجتماعی پر بڑا اثر ہوا ہے۔ لیکن یہی کتاب اس زمانہ میں علانیہ جنیوا میں جلائی گئی تھی۔

۱۷۷۰ء میں جب بارن بیرن دی ہولباخ (HOLBACH) کی کتاب نظام طبیعت (SYSTEM OF NATURE) شائع ہوئی جس میں اس نے خدا کے وجود اور بقائے روح سے انکار کیا تھا تو تمام فرانسیسی ناظرین گھبرا اٹھے تھے۔ غرض اٹھارہویں صدی میں گو اس تحریک کی مخالفت پوری قوت پر تھی، لیکن الحاد اور آزاد خیالی اس کے علی الرغم پھیلتی چلی گئی۔

انیسویں صدی تک بھی مذہب اور آزاد خیالی میں کشمکش برپا رہی۔ چنانچہ ۱۸۱۹ء میں جب کارلائل کی کتاب عصر العقل (THE AGE OF REASON) شائع ہوئی تو اسے تین سال کے لئے قید کی سزا دی گئی۔ پھر اسی کتاب کی بدولت اس کی بیوی، بہن اور بہت سے کتب فروشوں پر مقدمہ چلایا گیا۔

غرض اٹھارھویں صدی کے وسط تک اہل یورپ کی عقلیں قدیم تقالید کی بندشوں میں بری طرح جکڑی رہیں اس زمانہ میں کیفیت یہ تھی کہ فریڈرک شاہ پروشیا کے باپ نے فیلسوف ولف (WOLFE) کو صرف اس جرم میں نکال دیا کہ اس نے کنفیوشس کے مذہب کی تعریف کی تھی۔ گویا اس فرمانروا کی رائے میں کسی شخص کو نصرانیت کے سوا کسی مذہب کی تعریف کرنے کا حق ہی نہ تھا" مگر اسی باپ کے بیٹے نے اپنے ملک کو تمام ان لوگوں کے لئے جائے پناہ بنایا جو دوسرے ممالک میں حریت فکر کی بنا پر ظلم و ستم کا تختہ مشق بن کر بھاگتے تھے ۱۷۸۱ء میں کانٹ (KANT) نے اپنی کتاب عقل صحیح (CRITIC OF PURE REASON) لکھ کر دنیا بھر میں ہلچل برپا کر دی اس نے رائے ظاہر کی کہ اس کائنات سے خدا کے وجود پر استدلال کرنا غلط ہے۔ اور بقائے روح پر جتنے دلائل قائم کئے گئے ہیں باطل ہیں اور دعویٰ کیا کہ علم کے لئے تجربہ کے سوا کوئی مصدر نہیں ہے۔ لیکن آخر میں اس نے ایک اور کتاب لکھی جو الہیت کے انداز میں تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ حیات اجتماعیہ میں اخلاق کے معیار کو برقرار رکھنا چاہتا تھا جس کے لئے بجز اس کے کوئی صورت نہ تھی کہ ایک روحانی رنگ اختیار کیا جائے

اور اساسی مصادر سے استناد کیا جائے۔

خطبہ سوم

حضرات!

گذشتہ خطبہ میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ بلادِ مغرب میں علوم جدیدہ کا عروج سترھویں صدی ہے جس میں کوپرنیکس کے نظریہ اور نظریہ جذب وکشش، اور نظریہ دوران خون، اور کیمیا و طبعیات کے جدید قوانین کا ظہور ہوا۔ اور لوگ ستاروں کے نظام اور تاروں کی کنہ اور ان سے دلالت تارو ں کی کیفیت سے واقف ہوئے ہے۔ مگر انیسویں صدی تک یہ اکتشافات ان غامض مسائل کونیہ کی تفسیر سے باز رہے جو بائیبل کے عہد جدید اور عہد قدیم میں بیان کئے گئے ہیں، اور اگر انہوں نے اس سلسلہ میں کچھ کیا بھی تو وہ بہت محدود تھا۔ پھر جب ان اکتشافات کی بنا پر مسائل کونیہ کی بحث شروع ہوئی تو اس کے ساتھ ہی اُن مذہبی روایات کی بحث بھی شروع ہو گئی جو ان کتابوں میں وارد ہوئی ہیں، مثلاً طوفان نوح اور سفر تکوین۔ چنانچہ اس صدی کے اوائل میں لاپلاس (LAPLACE) آیا اور اس نے ظاہر کیا کہ سفر تکوین میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ ہمیں وجود خالق کے نظریہ سے انکار کی طرف لے جاتا ہے پھر علم طبقات الارض کی تحقیقات نے ترقی کی اور اس نے ایسے معروضات پیش کئے جو سفر تکوین اور قصہ طوفان سے متناقض تھے۔

۱۸۶۳ء میں پروفیسر لائل (LYELL) نے اپنی کتاب "قدم الانسان" میں بیان کیا کہ انسان اس مدت سے بہت پہلے زمین پر آباد ہو چکا تھا جو توراۃ نے معین کی ہے۔ مگر اس نے یہ رائے ظاہر کی کہ ان دونوں متناقض بیانات میں اس طرح تطبیق دی جا سکتی ہے کہ شاید توراۃ میں جو مدت بیان کی گئی ہے اس کے دن بہت زیادہ طویل ہوں اور ہمارے دنوں کی طرح نہ ہوں۔ لیکن اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس کی تطبیق ان ایام پر نہیں ہو سکتی جن میں انسان پیدا کیا گیا ہے۔ کیونکہ توراۃ کے بیانات سے تو یہی مستفاد ہوتا ہے کہ وہ دن ایسے ہی تھے جیسے ہمارے موجودہ زمانے کے دن ہیں۔ بہر حال اس کے عہد کے فلاسفہ میں

عام خیال یہ پھیل گیا تھا کہ علم طبقات الارض نے اناجیل کی بنیادیں ہلا ڈالی ہیں، مگر پھر بھی یہ کہنے کے لئے دروازہ کھلا ہوا تھا کہ نوع بشری کا وجود تاریخ سے پہلے کی بات ہے۔ چنانچہ لوگ اسی مذہب پر تھے کہ علم الحیوان نے انسان کی اصل کے متعلق ایک نئی تحقیق پیش کر دی اور انسان پر قانون نشو وارتقاء اور تمام نوامیس طبیعی کو منطبق کیا خصوصاً جب سے ڈارون کی کتاب اصل اجناس (ORIGIN OF SPECIES) شائع ہوئی ہے (۱۸۵۹ء) اس کو حقائق ثابتہ میں شمار کیا جانے لگا ہے۔

۱۸۷۱ء میں جب ڈارون کی کتاب منشاء الانسان (THE DESCENT OF MAN) شائع ہوئی تھی اسی وقت سے ایک فکری شورش برپا ہو گئی تھی اور دینی و غیر دینی طبقوں کے درمیان جدال و نزاع کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ حتیٰ کہ گلیڈ اسٹون کے متعلق مشہور ہے کہ اس زمانہ میں اس نے کہا تھا کہ:۔

اگر ہم نظریۂ نشو وارتقاء کو مان لیں تو اس کے اعتبار سے خدا کی یہ حیثیت رہ جائے گی کہ وہ ایک خالق تھا جس کا کام ختم ہو گیا۔ اور اگر قوانین کونیہ کے عدم تغیر کو تسلیم کر لیا جائے اور یہ قرار دے لیا جائے کہ یہ قوانین ایک ہی حالت پر دائماً قائم رہنے والے ہیں تو دنیا میں خدا کی حکومت کی کوئی حاجت باقی نہ رہے گی۔

اگر آپ معلوم کرنا چاہیں کہ گذشتہ صدی کے وسط تک مغرب کے غیر اسلامی ممالک میں مرکز عقل اور حریت فکر کا کیا حال رہا ہے تو اس کے سلسلہ میں آپ کے سامنے صرف ایک اقتباس پیش کرنا کافی سمجھتا ہوں جس سے آپ کو معلوم ہو گا کہ ایک انگریز کارڈینل کے اعلان کا یورپ میں کس طرح استقبال کیا گیا۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ:۔

۱۸۶۳ء میں کارڈینل مانگ (CARDINAL MANNING) نے اپنے ایک اعلان سے تمام عالم نصرانیت کو حیرت زدہ کر دیا جس میں اس نے لکھا تھا کہ ہر انسان کو دینی اعتقاد رکھنا چاہئے جس کو وہ اپنی نظر و فکر کی بنا پر صحیح سمجھتا ہو اور یہ کہ کنیسہ کو عقائد پر مجبور

کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور یہ کہ امور ماوراء طبیعت کا علم ممکن ہے بلکہ اس علم کو تنہا وحی
اور کنیسہ کی رغبتوں ہی کا پابند نہ ہونا ہو چاہئے - اور یہ کہ کیتھولک فرقہ والوں کو حق ہے
کہ دوسری ملتوں سے نکل جانے والے لوگوں کو اپنے مذہب کی دعوت دیں - اور انہیں حق ہے
کہ اپنی نماز باواز بلند پڑھیں - اور یہ کہ پوپ علمی ترقی اور حریت اور مدنیت کے ساتھ تطابقت
رہ سکتا ہے "

دیکھئے تو سہی کہ مورخوں نے اس اعلان کو ان بڑے حادثوں میں شمار کیا ہے جنہوں نے عالم نصرانیت
کو حیرت زدہ اور مدہوش کر دیا حالانکہ بنظر غائر دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ کارڈینل نے اس سے زیادہ کچھ
نہیں کیا ہے جو عالم اسلامی کو اس وقت سے معلوم ہے جب سے قرآن کا نور - دلوں پر تاباں ہوا ہے - اور
اس کی وہ فطری تعلیمات عالم انسانی پر جلوہ فگن ہوئی ہیں - جو غور و فکر کو لازم کرتی ہیں کورانہ تقلید کو
قبیح ٹھیراتی ہیں، اور عقلوں پر سے پردے اٹھا دیتی ہیں -

اب تک ہم نے جو کچھ کہا ہے اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا - کہ کئی صدیوں تک فکر بشری اور
مغربی ملتوں کے درمیان کیسی سخت نزاع اور مہیب اکھیڑ پچھاڑ رہی ہے، تا آنکہ آخر کار عقل کے غالب
آجانے اور حریت فکر کے فتح یاب ہو جانے کے آثار پیدا ہو گئے ہیں - ہم نے "آثار پیدا ہو گئے ہیں" اس لئے
کہا کہ اب بھی ہم کو یورپ کے بعض ممالک بلکہ امریکہ کی دنیائے جدید میں ایسے لوگوں کی کمی نظر نہیں آتی جو
قدیم تقالید کی حمایت کرتے ہیں اور جو کچھ ان کے باپ دادا کے اعتقادات تھے ان پر جمے رہنے پر اڑے
ہوئے ہیں، اگرچہ وہ تقالید اور اعتقادات علمی مشہودات سے معارض اور منطقی حجتوں سے متناقض
ہی کیوں نہ ہوں کیا آپ بھول گئے کہ گذشتہ سال ہی امریکہ کی ایک جامعہ نے اپنے پروفیسروں میں سے
ایک نامور پروفیسر کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے؟ جب اس نے ڈارون کے مذہب کی ترجیح کی تو اس کے خلاف
زبردست شور برپا ہو گیا اور وہ اس وقت تک فرو نہ ہوا جب تک کہ اس پروفیسر کو اس جامعہ کی کرسی

سے الگ کر دیا گیا۔

خطبہ چہارم

حضرات!

جہاں تک ممالک غربیہ کا تعلق ہے یہ مختصر بیان ان حالات کی تصویر کھینچنے کے لئے کافی ہے۔ جو گذشتہ کئی صدیوں کے دوران میں عقل بشری کو پیش آئے ہیں، اور ان آلام و مصائب کا اندازہ کرنے کے لئے یہ تھوڑا سا خلاصہ ہی کافی ہے جن کا مقابلہ عقل کو اپنی حریت اور اپنے استقلال کی خاطر ممالک مغربی میں کرنا پڑا ہے۔ آئیے اب ہم ایک اوچٹتی ہوئی نظر مشرق پر بھی ڈال کر دیکھیں کہ جس وقت ممالک یونانیہ میں حریت فکر کی پو پھوٹ رہی تھی (یعنی پانچویں صدی قبل مسیح کے اطراف) اس وقت بلاد مشرق میں عقل کا کیا حال تھا۔ جب شرق ادنیٰ میں اکسینوفانیس (XENOPHANES) یونانیوں کے دیوتاؤں پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ کر کے اور ان کا مذاق اڑا کر لوگوں کو ان کی عبادت ترک کرنے کے لئے دعوت دے رہا تھا۔ اور جس زمانہ میں ہیرقلیتس اور دیمقریتوس عقول بشری کو تقلید جاہلی کی بندشوں سے نجات دلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور ان کو ملکوت ارض و سما پر غور کرنے کی تعلیم دے رہے تھے، ٹھیک اسی زمانہ میں ہم کو مشرق کے دوسرے کنارے پر ایسی عقلی و نفسی حرکت کے آثار نظر آتے ہیں۔ جس کا مقصد سوئی ہوئی ہمتوں کو بیدار کرنا اور جاہل و گمراہ قوموں کو غور و فکر کی راہ دکھانا، اور انسان کو اپنی اجتماعی زندگی کے مسائل کی بحث و تحقیق پر آمادہ کرنا تھا۔ چنانچہ ہندوستان میں بودھ اپنی تعلیمات کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔ اور چین میں کنفیوشس اس تفاوت طبقات اور اس سیاسی و اجتماعی ثنویت کے خلاف جنگ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے جس میں اس کے زمانے کی چینی قوم اور ملک چین کے ارباب حکومت مبتلا تھے، اور اس سنگ دلی، اور درشت خوئی، جور و ظلم اور استبداد کی اصلاح کرتا نظر آتا ہے جو اس کے عہد میں امراء کی امتیازی صفات تھیں۔

یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اگرچہ مشرق کے یہ دونوں علاقے اپنے زمانہ نہضت میں متحد اور اس

نہضت کی کہنہ و طبیعت میں متشابہ ہیں، مگر فرق یہ ہے کہ ہندوستان میں اس کی توجہ عام مادی احوال کے بجائے زیادہ تر نفس کو اخلاق فاسدہ کی نجاستوں سے پاک کرنے کی طرف مائل رہی ہے، اور سینین میں کنفیوشسی نہضت کا مقصد اولین یہ رہا ہے کہ حیات سیاسی و اجتماعی اور مظاہر مادی کو منضبط کرنے کے لیے دستور مقرر کئے جائیں اور ان کو ایک نظم کے تحت لایا جائے۔

بزرگو! جس طرح شرق ادنیٰ اور بلاد عربیہ میں مذہبی پیشوائی کے مدعیوں نے ان بدعات و مظالم اور ان ناروا بندشوں اور عبادات کے ان غلط طریقوں کو رواج دیا جنہوں نے خدا کے بندوں کو تکلیف میں ڈالا اور ارواح بشری کو ہلاکت کے گڑھے میں پھینکا، اور عقول انسانی کو غلامی کی قیود میں جکڑا اسی طرح چین اور ہندوستان اور دوسرے ہمسایہ ممالک میں بھی ان کے ہم پیشہ لوگوں نے یہی سب حرکات کیں اور ان کی بدولت قرون وسطیٰ دنیا کی تاریخ میں بدترین قرون بن گئیں۔ آخر کار علیم حکیم کی حکمت اور رفیق رحیم کی رحمت اس کی مقتضی ہوئی کہ اپنے ظلمت و ضلالت میں بھٹکنے والے اور جہالت کی وادیوں میں حیران و سرگردان پھرنے والے بندوں پر نور معرفت کا اشراق فرمائیے تاکہ ان کی عقلوں کے بند کھل جائیں، اور ان کے نفوس کی منزلت بلند ہو جائے اس نے انہیں محض ناکام تجربوں کی رہنمائی پر نہ چھوڑ دیا بلکہ ان کو رہائی دلانے اور راہ راست دکھانے کے لیے وحی نازل فرمائی تاکہ وہ ان مجادلات اور مصادمات سے بچ جائیں جن میں دوسری ملتوں اور مذاہب کے لاکھوں طالبان حریت و عدل و مساوات فنا ہو چکے تھے۔ اس کی حکمت نے یہ چاہا اور اسی لئے اس نے قرآن کو دین فطرت کے ساتھ بھیجا تاکہ قید و بند میں جکڑے ہوئے نفوس کو اس کے پاک احکام کے ذریعے سے آزاد کرائے، اور گمراہ عقلوں کو جہالت کے بھٹکوں سے نجات دلائے۔

اب میں جو کچھ عرض کرنے والا ہوں اس سے آپ حضرات کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ قرآن کریم نے کس طرح حریت کی راہ میں فکر بشری کی ہدایت فرمائی ہے اور وہ عقل کو کن بلند منزلوں تک اٹھاتے

گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مناسب ہوگا کہ ہم اس فرصت سے فائدہ اٹھا کر اس سوال کو بھی حل کردیں جو بعض لوگوں کے دلوں میں کھٹکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب قرآن کا دین دراصل دین فطرت ہی ہے، اور جب احکام کی صحت کا مقیاس قرآن کے نزدیک عقل اور منطق ہی ہے تو پھر دین کے بذریعہ وحی نازل فرمانے کا کیا فائدہ ہے؟ کیوں عقل بشری کو حق اور حقائق کی راہ میں مجاہدہ کرنے کے لئے تنہا نہ چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ خود ان تک پہنچے اور خیر و شر اور نافع و ضار کی بحث و تنقیب کرکے خود ان کی کنہ کو سمجھے اور ان کے حدود کا ادراک کرے اور ان کے درمیان جو مابہ الفرق و امتیاز امور ہیں ان کو پہچانے؟

ایسے لوگوں سے ہم کہیں گے کہ بلا شبہ انسانی عقل کے لئے یہ ممکن ہے کہ بحث و تنقیب اور تجربوں کے ذریعہ سے احکام اور تصورات اور نظم اجتماعی اور رسائل علمی اور آداب خلقی کے ان مراتب کمال تک پہنچ سکے جن کے لئے نفس انسانی ایک فطری شوق رکھتا ہے۔ لیکن اس راہ میں دو سخت گھاٹیاں ہیں جن کو عبور کئے بغیر اس آرزو کا تحقق نہیں ہوسکتا۔ ان میں سے ایک عادی ہے اور دوسری طبعی۔

پہلی گھاٹی یہ ہے کہ نفس بشری اپنی حقیقی مصلحت کی خاطر جن وجوہ صواب کی جستجو کرتا ہے ان تک پہنچنے کے لئے صدیوں کے تجارب اور تحقیقات درکار ہیں۔

دوسری گھاٹی ناموس نشو و ارتقا یعنی تدریجی ترقی کی گھاٹی ہے جس کی وجہ سے عالم معقولات و معنویات میں عقل بشری کسی آگے کے مرحلہ پر اس وقت تک نہیں پہنچ سکتی جب تک کہ وہ اس سے پہلے کے مراحل کو قطع نہ کرلے۔

اس کے علاوہ کچھ اور عوامل بھی ہیں جو تحقیق و بحث کی راہ میں عقل کی پیشقدمی کو روکتے ہیں، اور اکثر ایسی رکاوٹیں ڈالتے رہتے ہیں جن سے بچ کر بہت ہی کم تحقیقیں نکل سکتی ہیں ورنہ اکثر و بیشتر تو ٹھوکر کھا کر گر ہی پڑتی ہیں۔ ان عوامل میں سب سے زیادہ اہم عامل وہ نفسی انفعالات اور عصبی اضطرابات ہیں جن کے آثار ہماری اجتماعی اور عقلی اور ادبی زندگی کے شعبوں میں اتنے نمایاں ہیں کہ کوئی شخص ان سے ناواقف

نہیں ہے یہ بڑا ہی سخت مغالطہ ہوگا۔ اگر ہم اپنے افکار اور احکام اور معاملات میں کمال کو پہنچنے اور نقائص سے بری ہونے کا ادعا کریں۔ دراں حالیکہ ہمارے اندر ایک نفس امارہ اور ہمارے پہلو میں ایک متلون قلب موجود ہے اور ہم اکثر معاملات میں اپنی خواہشات کی اطاعت اور ہوا و ہوس کی پیروی کیا کرتے ہیں۔

ان وجوہ سے اور اس لئے کہ لوگوں کو سب سے قریب کے اور سب سے زیادہ سیدھے اور سب سے زیادہ محفوظ راستے پر چلایا جائے، خالق کائنات اپنی مخلوقات میں سے پاکیزہ ترین مخلوق کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجتا ہے، کیونکہ اپنے بندوں پر اس کی رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ لغزش قدم اور پریشان خوابی، اور مجرد احساسات کے فتنے سے ان کو بچائے اور ان کے سینکڑوں ہزاروں برس اس علم اس حریت و مساوات، اس عدل اور ان تمام فضائل و رسالات کی تلاش و جستجو میں ضائع نہ ہونے دے جن کے لئے ان کے نفوس فطرةً آرزو مند ہیں۔

قرآن حکیم ہر چیز میں دین فطرت لے کر آیا ہے۔ اس کے قواعد احکام اور اصول آداب و شرائع اسی طرح فطرت بشری کے مقتضیات سے مطابقت رکھتے ہیں حتیٰ کہ اس کی لائی ہوئی شریعت کے اہمات اصول میں ایک یہ بھی ہے کہ جو امور مؤثرات کی تاثیر سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور جن میں اختلاف حالات کے ساتھ پے در پے تغیرات واقع ہوتے ہیں ان میں ہر قوم کے عرف کا لحاظ کیا جائیگا۔ اس وجہ سے زمان و مکان کے اختلافات اور مختلف اقوام کے مخصوص عرف کے لحاظ سے شریعت کے فرعی و جزئی مسائل میں اختلاف ہوتا رہتا ہے اس طرح قرآن مجید مطالب عقل کے عین مطابق ہے اور انسانی فطرت سے نا آشنا نہیں ہے اور حیات اجتماعی کے شعبوں میں سے کسی شعبہ میں طبیعت بشری کے سلطان و آثار سے تجاہل نہیں برتتا۔

پھر قرآن اس سے خوب واقف ہے کہ انسان اپنے احساس و شعور کی ابتدائی حالت ہی سے ان واقعات و حالات کی علتیں معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے جن کا ادراک اسے اپنے حواس کے واسطے سے ہوتا ہے۔ اور یہ تلاش و جستجو اس کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے۔ اس لئے وہ اس کی اس فطرت کو اور

زیادہ ابھارتا اور اسے بحث و تحقیق کے نئے گوشے دکھاتا ہے۔ اور بار بار ان جامد اعشی لوگوں کو تنبیہ کرتا رہتا ہے جو تقلید کے تنگ دائروں میں اس قدر مقید ہو گئے ہیں۔ کہ ان سے نکل کر وسعت فکر کے ساتھ کائنات اور اس کی خلقت پر نگاہ نہیں ڈال سکتے۔ اس باب میں قرآن مجید نے تدبر و تفکر کی دعوت دینے کا موقع ہاتھ سے نہیں دیا ہے۔ اور کوئی حجت اور کوئی برہان ایسی نہیں چھوڑی ہے جو اس نے حریفان حق پر قائم نہ کی ہو۔

اور پھر قرآن نے رسولوں اور نبیوں پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے اور اس کے ساتھ ان احکام و شرائع اور آداب فضائل کو قبول کرنے کا حکم دیا ہے۔ جو انبیاء نے پہنچائے ہیں، تو یہ ہرگز عقل کے خلاف نہیں ہے۔ اس لئے کہ عقل جس طرح فطرۃً اس چیز کی حاجت کا شعور رکھتی ہے کہ وقتاً فوقتاً افراد اور جماعتوں کے ظلم و تعدی کو افراد اور جماعتوں ہی کے ذریعہ سے رفع کیا جاتا ہے (وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ۔ ۲۔ ۲۵۱) اسی طرح اس کی فطرت ہی اسے اس طرف رہنمائی کرتی ہے کہ وہ ہر چیز قبول یا وضع کرے جس میں اس کو نظام حیات اجتماعیہ کی بہتری نظر آئے۔ اور چونکہ انسانی عقل تشریعی ادبی اور علمی شعبوں کے معالجہ میں نارسائی، لغزش اور قلت وسائل کے خطرات سے دوچار ہے (جس کی تفصیل ایک دوسرے موقع پر بیان ہو چکی ہے) اس لئے وہ طبعاً اس طرف مائل ہے کہ کسی پر بھروسہ اور اعتماد کر کے اطمینان و سکون حاصل کرے اور کسی ایسی بات کو قبول کرے جس کے بعد اس کو بحث و تنقیب کی مشقت نہ اٹھانی پڑے، اور کسی ایسے ماہر کامل کو اپنا رہنما بنالے جو اس کو ظنون اور تجربات کی راہ میں پیش آنے والے خطرات و مہالک سے بچائے جائے۔ پھر اس اعتماد و قبول کے لئے اس ہستی کی نازل کی ہوئی وحی سے زیادہ مستحق اور کیا چیز ہو گی جو انسان کی فطرت و طبیعت کے تمام اسرار پر محیط اور ان سب امور کا عالم ہے۔ جن میں اس کی صلاح شان و سعادت مضمر ہے؟ مزید برآں انسان فطرۃً اپنے مطلوبات تک پہنچنے کے لئے سب سے قریب کا راستہ چاہتا ہے۔ اور یہی خواہش اس کو کسی ایسے رہنما کی تلاش پر آمادہ کرتی ہے جس پر وہ اعتماد

کر سکے، اور جس کی ہدایات پر وہ اطمینان و سکونِ نفس کے ساتھ چل سکے۔ پس نہ صرف عوام بلکہ خواص بھی جس کثرت کے ساتھ بعض افراد انسانی پر اعتقاد رکھنے کی طرف مائل ہو تے ہیں اور انبیاء و رسل اور ان کے پیرو داعیوں پر ایمان لاتے ہیں، اس کا اصلی راز یہی ہے کہ وہ ان کی رہنمائی سے بہ آسانی منازل کمال تک پہنچنے اور ان کی ہدایت سے سعادت و سلامتی کی زندگی بسر کرنے کی امید رکھتے ہیں۔ انسان طبعاً اس ایمان و اعتقاد کی طرف مائل ہے، اس لئے کہ وہ فضائل کی معرفت میں درجہ بدرجہ ترقی کرنے سے گھبراتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ اس قسم کی تدریجی طلب کرنے والا بسا اوقات صواب کی منزل تک نہیں پہنچتا، اور اس امر کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ وہ سلامتی کے ساتھ اس راہ سے گذر جائے گا سوہ متفرق اعمال اور تصرفات اور احکام کے برے عواقب میں پڑنے سے فطرۃً بچنا چاہتا ہے، اس لئے اس کی فطرت ہی اس کو ان نجات کی خوشخبری دینے والے اور ان عذاب سے ڈرانے والے داعیوں کی دعوت قبول کرنے کی طرف مائل کرتی ہے، اور اسے امید دلاتی ہے کہ اس کا مطلوب گم کردہ جس کو اگر وہ خود اپنی کوشش سے طلب کرے تو شاید نہ پا سکے، غالباً اس طریقہ سے مل جائے گا جس کی طرف وہ لوگ دعوت دے رہے ہیں۔

پس انسان کی فطرت سلیمہ اور اس کی آغاز عقل ہی اسے ایک ایسے ہادی اور رہنما پر اعتقاد رکھنے اور مطمئن ہو جانے کے لئے آمادہ کرتی ہے جو اسے خطا، اور لغزش اور گمراہی سے بچا کر سلامتی کی راہ پر لیجانے والا ہو۔ اور اسے خوف دلاتی ہے کہ اگر اس نے خود اپنے دلائل اور خود اپنی قوتوں پر اعتماد کیا تو اغلب ہے کہ کہیں ناواقفیت، اور فکر کی غلطی اور قدم سعی کی لغزش کی بدولت وہ اُن بہت سے اعلیٰ مطالب اور پاکیزہ رغائب تک نہ پہنچ سکے گا۔ جن تک پہنچنے کی خواہش اس کے نفس میں پنہاں ہے۔ اسی فطرت کے تقاضا سے مدرسے قائم کئے جاتے ہیں، تہذیب نفس و تہذیب عمل پھیلانے والی جمعیتیں بنائی جاتی ہیں، اور مذہبی پیشواؤں اور صوفیاء کی طرف ہر زمانے میں ہر طبقے اور ہر عمر کے لوگ رجوع کرتے ہیں۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ عقل کو حرکت میں لانے اور فکر کو آزاد کرنے کا کوئی وسیلہ ایسا نہیں ہے

جس کو قرآن مجید نے اختیار نہ کیا ہو وہ جب کسی پر فیصلہ چھوڑتا ہے تو وہ عقل ہی ہوتی ہے اور جب کوئی حجت قائم کرتا ہے تو حکم عقل ہی کی بنا پر کرتا ہے اور جب کسی پر اظہار غضب کرتا ہے تو عقل کو معطل کر دینے والے ہی پر کرتا ہے۔ اور جب کسی سے اظہار خوشنودی کرتا ہے تو وہ ارباب عقل و خرد ہی ہوتے ہیں۔ قرآن نے جہاں کہیں دوسری ملتوں اور مذاہب کے پیروؤں اور ملاحدین و دہریئین سے مجادلہ کیا ہے اور وہاں وہ برہان سے ان پر ضرب لگاتا ہے۔ اور بحث و نظر ہی کی طرف انہیں دعوت دیتا ہے، وہ کہتا ہے۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (۷: ۲۴)

وہ دل رکھتے ہیں مگر ان سے سوچتے نہیں۔ وہ آنکھیں رکھتے ہیں۔ مگر ان سے دیکھتے نہیں۔ وہ کان رکھتے ہیں مگر ان سے سنتے نہیں، وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ وہی دراصل غافل ہیں۔

ایسی بہت سی آیات ہیں جن میں قرآن نے ان گمراہیوں کو اس بنا پر زجر و توبیخ کی ہے کہ انہوں نے اپنی عقلوں کو بیکار کر دیا ہے۔ یا باپ دادا کی تقلید میں اتنا مقید کر دیا ہے کہ اگر آبائی طریقوں سے بہتر کوئی طریقہ پیش کیا جائے تو وہ اس کو محض اس بنا پر رد کر دیں کہ ان کے باپ دادا کے طریقے کے خلاف ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ۔ (۲: ۲۱)

اور جب کبھی ان سے کہا گیا کہ جو کچھ اللہ نے نازل فرمایا ہے اس کی پیروی اختیار کرو تو انہوں نے کہدیا کہ نہیں ہم تو اس طریقہ کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ لوگ انہی کی پیروی کریں گے۔ اگرچہ ان کے باپ دادا کچھ نہ سمجھتے ہوں اور نہ راہ راست پر رہے ہوں۔

اور جن آیات میں اپنی عقلوں سے کام نہ لینے والوں اور اندھے مقلدوں کی مخالفت کی گئی ہے

ان میں سے بعض یہ ہیں۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ، اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْہُ مَسْـُٔوْلًا (۱۷:۳۶)

اور جس بات کا تجھ کو علم نہیں اس کے پیچھے نہ ہو لیا کر یقین رکھ کہ کان آنکھ اور دل سب سے قیامت کے دن پوچھ گچھ ہوگی۔

اور:۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰہِ الصُّمُّ الْبُکْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ (۸:۲۲)

اللہ کے نزدیک بدترین حیوانات وہ بہرے گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔

اور:۔

وَمِنْھُمْ مَّنْ یَّنْظُرُ اِلَیْکَ اَفَاَنْتَ تَھْدِی الْعُمْیَ وَلَوْ کَانُوْا لَا یُبْصِرُوْنَ (۱۰:۴۳)

اور ان میں سے کچھ لوگ ہیں جو تیری طرف نظر لگائے بیٹھے ہیں تو کیا تو اندھوں کو راستہ دکھائے گا چاہے ان کو کچھ نہ سجھائی دیتا ہو۔

پھر تم دیکھو گے کہ جہاں کہیں حریفان حق سے محاولہ کیا گیا ہے وہاں ہر آیت کے ختم پر اس طرح کے فقرے استعمال کئے گئے ہیں۔ (بَلْ اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ) (بلکہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو علم نہیں رکھتے)۔ (قَلِیْلًا مَّا تَذَکَّرُوْنَ) (وہ بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہیں)۔ (ھَاتُوْا بُرْھَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ) (اپنی برہان پیش کرو اگر تم سچے ہو)۔ اَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ۔ (وہ کدھر بہکے چلے جا رہے ہیں) لَوْ تَشْعُرُوْنَ (کاش تم شعور رکھتے)۔ اَفَلَا یَسْمَعُوْنَ (کیا وہ سنتے ہی نہیں) اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ (سبق صرف اہل عقل و خرد ہی حاصل کرتے ہیں)۔

قرآن کریم نے جہاں کہیں اپنے پیش کردہ دین کے اقتضا کے مطابق کوئی بات پیش کی ہے وہاں اس کو خوب اچھی طرح سمجھایا ہے۔ اور جب ارکان دین میں سے کسی رکن اور عقائد میں سے

کسی عقیدہ کی طرف دعوت دی ہے تو اس میں ایسی باتوں سے پرہیز کیا ہے جن کا انسانی عقل احاطہ نہیں کر سکتی اور جن کے ادراک سے بشری فہم عاجز ہے۔ اور جب اصول دین میں سے کسی اصل کی تلقین کی ہے تو مقدمات نظری سے ابتدا کی ہے اور پھر کفر و عناد کی بنا پر اس سے انکار کرنے کے انجام سے ڈرایا ہے مثلاً ایک جگہ کہا ہے:۔

لِیَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَیِّنَةٍ وَّ یَحْیٰی مَنْ حَیَّ عَنْ بَیِّنَةٍ (۸: ۵) — تاکہ جو ہلاک ہو وہ حجت قائم ہونے کے بعد ہلاک ہو اور جو زندہ رہے وہ حجت تمام ہونے کے بعد زندہ رہے

اور ایک دوسری جگہ فرمایا:۔

لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ (۴: ۲۳) — تاکہ لوگوں کے لئے خدا پر کوئی حجت باقی نہ رہے

قرآن کا نازل فرمانے والا جلیل الحکمت خدا، جو انسان کا خالق اور دلوں اور کانوں اور آنکھوں کا مالک ہے، اپنی آیات میں اپنے آپ کو کمال مطلق کی مثال ہونے کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، جس کا اظہار اس کے اسمار حسنیٰ سے ہوتا ہے، مثلاً عدل اور حق اور خیر وغیرہ۔ اس بنا پر اس نے اپنے رسولوں کو جبار اور کوتوال بنا کر نہیں بھیجا بلکہ خوشخبری دینے اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔

فَذَكِّرْ اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُصَیْطِرٍ (۸۸) — اے پیغمبر تو لوگوں کو سمجھا کیونکہ تو فقط سمجھانے والا ہے تو ان پر داروغہ نہیں ہے۔

فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ۔ (۱۶: ۵) — تو کیا پیغمبروں پر اس سے زیادہ بھی کوئی ذمہ داری ہے کہ صاف صاف احکام الٰہی پہنچا دیں۔

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (۱۰: ۱۰) — کیا تو لوگوں کو مجبور کر سکتا ہے کہ وہ مومن بن جائیں؟

وَ مَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّا مُبَشِّرِیْنَ وَ — اور ہم تو پیغمبروں کو صرف اس لئے بھیجتے ہیں کہ نیکوں

مُنذِرِينَ وَيُجَادِلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ (۱۸ : ۸)

کو نجات کا مژدہ سنائیں اور بددل کو عذاب سے ڈرائیں وہ باطل کے بل پر جھگڑا کرتے ہیں تاکہ اس سے حق کو متزلزل کردیں۔

وَمَا أَنتَ عَلَيْهِم بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَن يَخَافُ وَعِيدِ (۵۰ : ۳)

اور تو ان پر حاکم جابر نہیں ہے۔ تو تو بس ہر اس شخص کو قرآن کے ذریعے سمجھادے جو میرے عذاب سے ڈرتا ہے۔

پہلی چیز جس کے لئے قرآن نے عقل کو حکم بنایا ہے وہ خدا کے وجود پر ایمان ہے نہ صرف قرآن بلکہ اس کے سوا علماء کلام و اصول دین بھی سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ اس عقیدہ کی طلب طریق نظر و استدلال سے ہونی چاہئے حتیٰ کہ ان میں سے بعض نے تو اللہ پر تقلیدی ایمان لانے کو قبول ہی نہیں کیا ہے۔ اور اگر امام غزالی وغیرہ نے ایمان تقلیدی کو قبول بھی کیا ہے تو وہ عوام کے لئے ایک رعایت ہے کہ وہ بحث و نظر کی استطاعت نہیں رکھتے، اور اس کے وسائل سے ناواقف ہیں، ان کے قوائے ادراکیہ اتنے قوی نہیں ہیں کہ بحث و نظر کی شرائط پوری کرسکیں۔ اس بنا پر ان سے ایمان ثابت قبول کر لیا گیا ہے۔ لیکن جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس کی کوئی سورت آپ کو ایسی نہیں ملے گی جس میں اس نے انسان کو بحث و نظر اور تعقل و تفکر کی دعوت نہ دی ہو۔ اس جگہ ان سب آیات کا استیعاب ممکن نہیں ہے۔

صرف چند آیات پیش کی جاتی ہیں:۔

وَهُوَ الَّذِي مَدَّ الْأَرْضَ وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ وَأَنْهَارًا وَمِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ جَعَلَ فِيهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجَاوِرَاتٌ وَجَنَّاتٌ

اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور دریا بنائے اور ہر طرح کے پھلوں کی دو دو قسمیں پیدا کیں اور وہی رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے۔ یقیناً اس میں غور کرنے والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں اور زمین میں ایک دوسرے سے متصل قطعے ملتے ہیں۔

مِنْ اَعْنَابٍ وَّ زَرْعٌ وَّ نَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّ غَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَّ نُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِى الْاُكُلِ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۱۲:۱)

جن میں انگوروں کے باغ اور کھیتی اور کھجور کے درخت دو شاخے اور اکہرے، سب ہی کچھ ہوتے ہیں حالانکہ سب کو ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا ہے پھر بھی ہم بعض کو بعض پر پھلوں پر برتری دیتے ہیں۔ یقیناً ارباب عقل کے لئے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔

اِنَّ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِىْ تَجْرِىْ فِى الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۲:۲)

بے شک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات دن کے اختلاف اور ان کشتیوں میں جو لوگوں کے نفع کی چیزیں لئے ہوئے سمندر میں چلتی ہیں، اور اس پانی میں جسے اللہ آسمان سے نازل کرتا اور اس کے ذریعے سے زمین کو جو مردہ ہو چکی تھی، پھر سے زندہ کر دیتا ہے اور پھر اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیتا ہے، اور ہواؤں کی گردش، اور زمین و آسمان کے درمیان گھرے ہوئے بادلوں میں، ارباب عقل کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ نُصِبَتْ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ (۸۸)

کیا لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بنایا گیا ہے اور آسمان کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بلند کیا گیا۔ اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کیسے نصب کئے گئے ہیں اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی ہے۔

وَفِىْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۵۱:۱)

اور خود تمہارے اندر کیسی نشانیاں ہیں کیا تم دیکھتے نہیں ہو

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ

ہم ان کو تمام اطراف عالم میں اور خود ان کے اپنے اندر اپنی نشانیاں دکھائیں گے تاکہ ان پر ظاہر ہو جائے

الْحَقُّ (۴۱: ۶)   کہ یہ قرآن برحق ہے۔

اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ   کیا انہوں نے آسمان و زمین کے انتظام اور خدا

وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ (۷: ۲۴)   کی پیدا کی ہوئی کسی چیز پر بھی نظر نہیں کی۔

معزز حاضرین! یہاں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ اس باب میں جتنی آیات قرآن کریم میں آئی ہیں ان سب کا استقصاء کیا جائے۔ اس لئے ہم صرف انہی اقتباسات پر اکتفا کرکے ایک دوسرے مسئلہ کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ جس میں اکثر بحث کرنے والوں نے چکر کھائے ہیں۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ ایسے شخص کے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ جس نے بحث و نظر میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور اس کے باوجود وہ دین میں عقیدۂ حق تک نہ پہنچ سکا اس مسئلہ میں علماء نے بڑی شرح و بسط کے ساتھ اظہار رائے کیا ہے۔ مگر میں یہاں ان کی بحثوں سے تعرض کروں گا اور خود قرآن مجید سے استفسار کروں گا کہ ایسے شخص کے متعلق وہ کیا کہتا ہے

قبل اس کے کہ اس بارے میں قرآن مجید سے استفسار کیا جائے، میں چاہتا ہوں کہ آپ چند مسلمات ذہن نشین کرلیں:۔

ایک یہ کہ جب کسی حکم پر دلیل صحیح قائم ہو جائے تو عقل بشری اس میں شک کرنے پر قادر نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ عقل بشری میں یہ قدرت نہیں ہے کہ دو متناقض امور کے معاً صحیح ہونے کو جائز رکھے۔

تیسرے یہ کہ جب دو حکم متعارض ہوں اور ان میں سے ایک حکم کی تائید میں قاطع حجتیں موجود ہوں تو عقل کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ اس حکم کو چھوڑ کر دوسرے حکم کو قبول کرے۔

دین فطرت نے ان تینوں قضایا کو ملاحظہ کیا ہے اور اس کی آسمانی کتاب نے ان کی تصدیق کی ہے پھر اس کے بعد علماء نے اس کی تائید کی ہے اور باوجود فرعی مسائل میں مختلف ہونے کے ان سب نے اس قاعدۂ کلیہ کو تسلیم کیا ہے کہ شرعیات میں سے جو چیز بھی بظاہر خلاف عقل معلوم ہو اس کی تاویل

اس طرح کی جائے کہ وہ حکم عقلی کے مطابق ہو جائے۔ کیا یہ مسلمات عقلیہ کے حدود پر ٹھیراؤ اور فطرت انسانیہ کے حکم پر نزول نہیں ہے؟ اور کیا اس قاعدہ کے باوجود عقائد میں جبر اور زبردستی ہو سکتی ہے؟ اور کیا دین فطرت جو دین بحث و نظر ہے ان لوگوں کو کسی عقیدہ پر مجبور کر سکتا ہے جن کی عقلیں اس عقیدہ کے ادراک سے قاصر ہوں، یا جن پر شکوک و شبہات کا اتنا ہجوم ہو کہ وہ ان کو دور کرنے اور انہیں رد کرنے سے عاجز رہ گئے ہوں؟ اور کیا وہ دین جبر اور زبردستی کا قائل ہو سکتا ہے جس نے غیر معقولات پر ایمان لانے کی سخت مخالفت کی ہے، اور جس نے ایسے ایمان کے مقابلے میں اُس یقینی عقیدہ ایمان کی بنیادیں قائم کی ہیں جو طریق عقل و نظر سے حاصل ہوتا ہے؟

اللہ تعالیٰ کا عدل اس سے بالاتر ہے کہ وہ لوگوں کو اس چیز کی تکلیف دے جس کی ان میں طاقت نہ ہو، یا ایسی چیزوں پر ایمان لانا ان پر لازم کرے جن کی طرف حجت اور برھان ان کی ہدایت نہ کرتی ہو۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کے اس قول پر غور کرنے سے اچھی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے کہ۔

لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ (۴: ۲۳) — تاکہ پیغمبروں کے آجانے کے بعد لوگوں کے لئے اللہ پر کوئی حجت باقی نہ رہے۔

اب ہم قرآن کریم کی ان آیات میں سے بعض کو پیش کرتے ہیں جو اس مقام سے مناسبت رکھتی ہیں:۔

قَالَ يَقَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلَى بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَآتَانِي رَحْمَةً مِّنْ عِندِهِ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ أَنُلْزِمُكُمُوهَا وَأَنتُمْ لَهَا كَارِهُونَ (۱۱: ۲۸) — نوح نے کہا کہ اے میری قوم کیا تم نے غور کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے کھلے رستے پر ہوں اور اس نے اپنی طرف سے مجھکو رحمت عطا فرمائی ہے۔ پھر وہ رستہ تم کو دکھائی نہیں دیتا، تو کیا ہم تمہیں زبردستی اس پر چلائیں گے درانحالیکہ تم اس کو ناپسند کرتے ہو؟

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَقُوْلُوْنَ وَمَا اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِجَبَّارٍ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ یَّخَافُ وَعِیْدِ (۵۰: ۴۵)

ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ تم ان پر کوئی حاکم جابر تو ہو نہیں۔ جو کوئی میری وعید سے ڈرے اس کو بس تم قرآن کے ذریعہ سے سمجھا دو۔

قَدْ بَیَّنَّا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا وَّ لَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ (۲: ۱۱۹)

ہم نے ان لوگوں کے لئے اپنی آیات واضح کر دی ہیں جو یقین کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہم نے تم کو دینِ حق کے ساتھ خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اور تم سے دوزخیوں کی باز پرس نہ ہوگی۔

اِنْ عَلَیْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ (۴۲: ۴۸)

تم پر خدا کا پیغام پہنچا دینے کے سوا اور کچھ ذمہ داری نہیں ہے۔

اِنَّمَا اَنْتَ نَذِیْرٌ (۱۱: ۱۲)

تم تو بس عذابِ خدا سے ڈرا دینے والے ہو۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن جو دینِ فطرت کی کتاب ہے ہرگز ایسی کوئی بات پیش نہیں کرتا جو درست اور صحیح آراء کے منافی ہو یا جس کی حکمت عقولِ سلیمہ سے پوشیدہ ہو۔ اور وہ ہرگز انسان کی عقل کو ایسی باتوں پر ایمان لانے کی تکلیف نہیں دیتا جو غیر معقول ہوں۔ اور نہ ہرگز انسان کے جسم کو اس بار کے برداشت کرنے پر مجبور نہیں کرتا جس کو اٹھانے کی اس میں طاقت نہ ہو۔ اور وہ ہرگز انسان پر ایسا کوئی فرض عائد نہیں کرتا جو اس کی فطرت کی وسعت میں نہ سماتا ہو۔ اس کا اصلی کام تو یہی ہے کہ وہ نوعِ بشری کو ہدایت کا قریب ترین راستہ دکھلائے۔ اور خدا کے بندوں کو ہلاکت کے ان گڑھوں سے بچا کر نکال لے جائے جو طریقِ وحی کے بجائے طریقِ تجربہ سے حق اور حقیقت کی تلاش کرنے والوں کی راہ میں پیش آتے ہیں اور ان شیاطین الانس ان ظالم حکام، ان گمراہ کرنے والے مذہبی پیشواؤں سے محفوظ رکھے جو حق کے راستہ میں رہزنی کرنے کے لئے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس باب میں جتنے شواہد ودلائل آپ چاہیں وہ آپ کو مل سکتے ہیں دیکھئے کہ طلاق اور تحریم شراب اور تحریم قمار کے معاملہ میں مغربی

قوموں کی عزیمت کیسے تلخ تجربوں اور کتنی مدتوں کے بعد درست ہوئی ہے[۱]؟ اور کیسے شدید مقابلوں اور کتنی طویل صدیوں کے بعد ان میں عقل کو آزادی نصیب ہوئی اور حریت فکر اور حریت اظہار رائے کو مباح تسلیم کیا گیا، اور انسان کے ابتدائی نظری حقوق تسلیم کئے گئے[۲]؟ دینی اور سیاسی شورشوں کی تاریخ سے پوچھو، وہ تمہیں بتلائے گی کہ کتنے خون اس سلسلہ میں بہائے گئے اور کتنی جانیں اس راہ میں ہلاک کی گئیں؟ اس سے دریافت کرو، وہ تمہیں ان ہنگاموں کے مصائب و آلام کی ہولناک داستان سنائے گی اور ان کلفتوں کا حال بیان کرے گی جن سے قوموں کو دوچار ہونا پڑا ہے۔

اس کے بعد مجھ کو مسئلہ ارتداد سے بحث کرنی ہے جو بہت بسط و تفصیل چاہتی ہے۔ اس لئے تنگی وقت کی بنا پر اس کو دوسرے اجتماع کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میں دو اہم مسائل پر اور بھی کلام کروں گا۔

۱۔ دین فطرت کی کتاب ہونے کے اعتبار سے معجزات اور خوارق کے باب میں قرآن کریم کا موقف۔

۲۔ ناموس نشو و ارتقا اور اس کے قوانین کی تنقیح ان دلائل کے مقابلہ میں جو قرآن نے قائم کئے ہیں اور وجود خالق پر استدلال کرتے ہوئے جن میں نظر کرنے کی طرف اس نے دعوت دی ہے۔

پھر میں تکلیف دینی اور حریت ضمیر انفرادی کے متعلق قرآن کا مسلک مختصر طور پر بیان کر کے ختم کروں گا۔

---

[۱] بلکہ حقیقتہً اب بھی درست نہیں ہوئی۔ مترجم۔

[۲] یہ خواب بھی ابھی تک محروم تعبیر ہے۔ خطیب مرحوم کی وفات کے بعد یورپ میں جو انقلابات پیش آئے ہیں وہ پھر اس پچھلے دور استبداد و قہر کی جانب رجعت کا اظہار کر رہے ہیں۔ مترجم۔

بازار ساحری

کرشمۂ کن و بازار ساحری لشکن

(از جناب مولانا عبد اللہ العمادی)

(۱)

ہر چند قرآن پاک نے پیشنگوئیوں سے بہت کم بحث کی ہے اور واقعات کی تاریخ بیان کرنے میں تو حصہ لیا ہی نہیں تاہم جہاں کہیں دیکھا کہ عوام میں کوئی ایسی بات مشہور ہے کہ اصل ایمان پر اس سے بُرا اثر پڑنے کا احتمال ہے وہاں فوراً واقعہ کی اصلیت بیان کر کے مناسب الفاظ میں شبہات کی تکذیب کر دی. گو اس زمانے کے ہوا پرستوں کو اس کے ماننے میں تامل ہوا لیکن بعد کی دریافتوں نے ثابت کر دیا کہ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَقُصُّ عَلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اَكْثَرَ الَّذِیْ هُمْ فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ وَ اِنَّهٗ لَهُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ۔[1]

یہودیوں میں مشہور تھا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام شیطانوں کی پیروی کر کے کافر ہو گئے تھے ہاروت و ماروت دو فرشتے ہیں۔ جن پر خدا نے جادو اتارا ہے اور وہ لوگوں کو جادو کر کے ہلاک کر ڈالتے ہیں۔

اس افواہ سے اوّل تو حضرت سلیمان کی رسالت میں شک پڑتا تھا اور دوسرے بڑا شبہ یہ ہوتا تھا کہ جادو جب ایسی بُری چیز ہے کہ اس کے اثر سے لوگ تباہ ہو جاتے ہیں تو خدا نے اس کو فرشتوں پر کیوں اتارا؟ تباہ و ہلاک کرنے کی قدرت تو صرف خدا میں ہے پھر دو اور شخص اس میں کیوں شریک ہو گئے؟

کلام اللہ نے اس شبہ کو دو لفظوں میں صاف کر دیا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے کفر نہیں کیا بلکہ

---

[1] تفسیر کبیر جلد ا صفحہ ۱۵۱۔

شیاطین کفر کرتے تھے۔ اور ہاروت و ماروت پر جادو خدا کی طرف سے اترا نہیں تھا اور نہ وہ اس کے ذریعہ سے کسی کو ضرر پہنچا سکتے ہیں اور نہ اس سے انہیں کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے"

ظاہر ہے کہ اس بیان کے بعد شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ لیکن ہوا پرستوں کو اس وقت تک یقین نہ آیا جب تک موسیو مورگن کو آثار بابل میں وہ کتابیں نہ ملے جن میں ہاروت و ماروت اور ان کی معشوقہ زہرہ کی سیاہ کاریوں کی پوری داستان درج ہے۔ ان کتابوں سے جو پختہ اینٹ کی سلوں پر ہیں۔ قرآن مجید کے بیان کی حرف بحرف تصدیق ہوتی ہے اور اس سے پایا جاتا ہے کہ یہ دونوں بظاہر تو ایسے فرشتہ عفت تھے کہ لوگ ان کو بادشاہ فرشتہ اور دیوتا سمجھتے تھے لیکن دراصل پھنسانے کے لئے انہیں بڑے بڑے ہتھکنڈے یاد تھے۔

کلام اللہ نے آج سے بہت پہلے اس غلط فہمی کو رفع کیا ہے اور مفسرین نے اس پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ امام رازی کہتے ہیں:۔

قرء الحسن "الملکین" بکسر اللام وھو مروی ایضاً عن ابن عباس ثم اختلفوا فقال الحسن کانا علجین اقلفین ببابل یعلمان الناس السحر وقیل کانا رجلین صالحین من الملوک[1]

حسن بصریؒ نے "ملکین" کے لام کو زیر سے پڑھا ہے اور یہی ابن عباسؓ سے بھی مروی ہے۔ اختلاف پھر اس کے بعد ہے چنانچہ حسنؒ کا قول ہے کہ ہاروت و ماروت بیدین و ناختنہ بریدہ تھے اور بابل میں لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ ایک روایت ہے کہ دونوں صالح بادشاہوں سے تھے۔

ان بزرگوں نے جن میں حضرت ابن عباسؓ اور حسن بصریؒ ایسے صحابی و تابعی شامل ہیں تصریح کر دی کہ ہاروت و ماروت فرشتے نہیں تھے آدمی تھے اور یہی مشہور مفسر ضحاک کا بھی قول ہے

[1] تفسیر کبیر جلد ۱ صفحہ ۱۵۱

فتح البیان میں ہے۔

قال الضحاک هما ای ماروت و ماروت علجان من اهل بابل ۔[1]

ضحاک کا قول ہے کہ ہاروت و ماروت بابل کے دو بیدین آدمی تھے۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ ہاروت و ماروت کا قصہ یہودیوں سے ماخوذ ہے اور ایک روایت یہ ہے کہ یہ دونوں فرشتہ نہ تھے بلکہ فرشتہ صفت ہونے کی وجہ سے ان کا یہی لقب پڑگیا تھا۔ فرماتے ہیں۔

وَمَا روی انهما مثلا بشرین ورُکّب فیهما الشهوة ...... فحکی عن الیهود... وقیل رجلان سُمّیا ملکین باعتبار صلاحهما ویُوَیّده قراءة الملکین بالکسر وَقیل "ما انزل" نفی معطوف علی ماکفر وتکذیب للیهود فی هذه القصة[2]

یہ جو روایت ہے کہ ہاروت و ماروت فرشتے آدمی بنائے گئے اور ان میں شہوت دی گئی ...... تو یہ یہودیوں سے مروی ہے ...... ایک روایت میں ہے کہ یہ دونوں آدمی تھے اور زہد و تقویٰ کی وجہ سے لوگ انہیں فرشتہ کہتے تھے اور "ملکین" بالکسر کی قرءات اسی کی تائید کرتی ہے ۔ اور ایک روایت یہ ہے کہ "ما انزل" نفی ہے اور "ماکفر" پر عطف ہے اور اس قصہ میں یہودیوں کی تکذیب[2] ہے ۔

صاحب تفسیر مظہری یہ لکھ کر کہ "ما انزل علی الملکین" میں "ما" نفی کے لئے ہے یعنی سحر خدا کی جانب سے نہیں اترا تھا۔ قصہ ہاروت و ماروت کے متعلق فرماتے ہیں۔

وهذه القصة من اخبار الاحاد[3] بل من الروایات الضعیفة الشاذة ولا دلالة علیها فی القرآن بشیٔ.... وان

یہ قصہ خبر احاد[3] بلکہ ضعیف و شاذ روایت سے منقول ہے اور قرآن میں اس پر کوئی دلیل نہیں.... اسی قسم کی کوئی حدیث بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ تو

---

[1] فتح البیان جلد ۱ صفحہ ۱۴۲
[2] بیضاوی شریف صفحہ ۱۷۰
[3] خبر احاد وہ حدیث جس کا راوی اوّل صرف ایک شخص ہو ایسی خبریں یقین کے لئے مفید نہیں ہوتیں۔

هٰذہ الاخبار لم یروِ منہا شیٌٔ صحیح ولا سقیم عن النّبی صلے اللہ علیہ وسلم۔ صحیح مروی ہے اور نہ غلط۔

ابن جریر نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ "ملکین" سے مراد جبرئیل و میکائیل ہیں "اور ہاروت و ماروت" "شیاطین" سے بدل ہے۔

ان کے خاص الفاظ یہ ہیں۔

اِتَّبعُوا مَا تَتلُو الشَّیٰطِینُ عَلیٰ مُلکِ سُلیمٰانَ وَمَا کَفَرَ سُلَیمٰانَ وَمَا اَنزَلَ اللہُ عَلَی المَلَکَینِ وَلٰکِنَّ الشَّیَاطِینَ کَفَرُوا یُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحرَ بِبَابِلَ ھَارُوتَ وَ مَارُوتَ۔ فیکُونَ معنیًا بالملکین جِبرِیلَ وَمیکائیل لان سحرۃ الیھود فیما ذکرکانت تزعم ان اللہ انزل السحر علی لسان جبرئیل ومیکائیل الی سلیمان بن داؤد فاکذبھم اللہ بذلک واخبر نبیّہ صلی اللہ علیہ وسلم ان جبریل ومیکائیل لم ینزلا بسحر وبرّا سلیمان مِمّا نحلوہ من السحر واخبرھم ان السحر من عمل الشیٰطین وانہا تعلم الناس ذٰلک ببابل وان الّذِینَ یُعلمونھم ذٰلک رجلان احدھما ھاروت والاٰخر ماروت فیکون ھاروت و ماروت علی ھٰذہ التاویل ترجمۃ عن الناس وردًّا علیھم۔

یعنی یہودیوں کا گمان تھا کہ خدا نے جبرئیل و میکائیل کے ذریعہ سے حضرت سلیمان پر جادو اتارا ہے۔ خدا نے اس کی تکذیب کی کہ ان دونوں فرشتوں پر کچھ نہیں اترا۔ جادو تو شیاطین سکھایا کرتے ہیں۔ اور بابل میں ہاروت ماروت نامی دو خاص آدمی ہیں جن کا یہی نام ہے۔

اس مطلب کو علامہ قرطبی نے بھی پسند کیا ہے اور ان کے نزدیک اس کے سوا کوئی تاویل قابل

لہ تفسیر مظہری صفحہ ۸۷۔

التفات نہیں۔ لکھتے ہیں۔ هذا اولى ما قيل فيها ولا ملتفت الى سواه[1]

(۲)

سحر کی تاثیر میں ہم خود کلام کرنا نہیں چاہتے۔ ہاں امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ البتہ فرماتے ہیں کہ۔

"انه خداع لا اصل له ولا حقيقة"[2] یعنی سحر ایک قسم کا فریب ہے جس کی کوئی اصلیت و حقیقت نہیں۔

یہ امر کہ "سحر اگر کوئی چیز نہیں تو تخت بلقیس کے اٹھا لانے کا عفریت نے کیونکر دعویٰ کیا" خارج از بحث ہے اس لئے کہ مجاہد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ طرفۃ العین میں تخت کے اٹھا لانے سے بہت جلدی اٹھا لانا مراد ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں:۔

اختلفوا فی قوله قبل ان یرتد الیك طرفك على وجهين الاول انه اراد المبالغة في السرعة كما تقول لصاحبك افعل ذلك فى لحظة وهذا قول مجاهد[3]۔

غرض کہ ہاروت ماروت کو بعضوں نے فرشتہ لکھا ہے اور بعضوں نے آدمی۔ لیکن اس آیت کو کسی نے متشابہ نہیں بتایا ہے۔

(۳)

اس ضمن میں ہم یہ بھی دکھانا چاہتے ہیں کہ سحر و جادو سے حقیقی عربی تمدن کو بھی تعلق نہ تھا یہ بلائے فساد عرب میں غیر قوموں کے طفیل سے دخیل ہوئی۔

اہل عرب ان چیزوں کو جو لطیف المآخذ اور دقیق الصنعت ہوتیں "سحر" کہا کرتے تھے۔

---

[1] فتح البیان ج ۱ ص ۱۳۳۔ [2] عینی ج ۷ ص ۵۲۱۔ طبع قسطنطنیہ۔ و فتح البیان ج ۱ ص ۱۳۲۔ طبع مصر

[3] تفسیر کبیر ج ۶ ص ۵۶۶۔

اور جن چیزوں میں چابکدستی اور سحر کی سی گرفت ہوتی کہ چیز اپنی اصلی حقیقت کے خلاف نظر آتی اس کو "شعبدہ" کہتے تھے۔ یہ لفظ معرب ہے جس کے معنی افسون کے ہیں۔ سحر میں اصلی چیز فریب ہے جس شخص پر سحر ہوتا اس کو فریفتہ (فریب دادہ) کہتے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی علیہ الرحمۃ اپنی تفسیر عزیزی میں آلات صنعت و مکانیکس اور یورپ کی گھڑیوں کو بھی ایک قسم کے سحر میں شمار کرتے ہیں[1]۔

جاہلیت میں عرب کے قرب و جوار میں جو قومیں رہتی تھیں ان کا گمان یہ تھا کہ سحر و شعبدہ کا استفادہ جواہر کے خواص اور حسابی امور میں اور مطالع نجوم کے علم سے ہوتا ہے۔ جس پر سحر کرنا ہوتا اس کی صورت کا ایک ہیکل بناتے اور اس کے لئے ایک مخصوص وقت کے منتظر رہتے جس میں خاص ستارے نکلتے ہیں اور اس کے ساتھ کچھ بیلے ملا کر شیطانوں سے فریادی ہوتے تھے۔ جس شخص پر سحر ہوتا ان کے خیال میں ان سب باتوں کی وجہ سے اس کی عجیب حالت ہو جاتی اور حقیقت بدل جاتی۔ اس غرض کے لئے جن و شیاطین کو غلام بنانے کے لئے قربانی اور بھینٹ چڑھایا کرتے تھے اور اس فن میں بہت سی کتابیں بھی تصنیف کی تھیں جن میں ابن وحشیہ کلدانی کی کتاب الفلاحۃ زیادہ مشہور ہے جس کو اس نے عربی میں ترجمہ کیا تھا۔

عہد تمدن میں جب غیر قومیں اسلام کے زیر اثر آئیں اور مسلمانوں سے ملنے جلنے کا اتفاق ہوا اور اکثر لوگ مسلمان بھی ہوئے تو مسالہ سحر کی اصلاح پر بھی توجہ کی اور اب یہ کہنے لگے کہ ہم لوگ خدا کی عبادت میں مستغرق رہتے ہیں تضرع کیا کرتے ہیں، شیاطین وارواح کو اس کے نام کی قسم دیتے ہیں، اور نفسانی خواہشوں کو ترک

---

[1] شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہٗ کی اصل عبارت یہ ہے:۔ قسم ہفتم سحر حیل است با ستعانت آلات عجیبۃ الصنعۃ غریبہ حادث کنندہ اتخاذ آن آلات مبنی بر تعمق در دقائق علم الحیل است، ورنہ فرق بین الوضعین کثیر است ولا یعرفہ الا البصیر۔ غریبہ حادث کنندہ اتخاذ آن آلات مبنی بر تعمق در ریاضات مبنی می باشد مثل حیل بنی موسیٰ و آلات ساعت شناسی کہ فرنگیان می سازند۔ (فتح العزیز مطبوعہ ۱۲۶۸ھ صفحہ ۲۵۸)۔

عربی میں "حیل" آلات کو کہتے ہیں اور بنی موسیٰ سے مراد موسیٰ بن شاکر کے تینوں بیٹے محمد، احمد و حسن ہیں جو بہت سے عجیب و غریب آلات کے موجد گزرے ہیں۔

کرکے عبادت کا التزام رکھتے ہیں لہذا جن و شیاطین و ارواح ہماری اطاعت و خدمت کرتے ہیں۔ ہمارے امر و نہی کے مطابق تصرف کیا کرتے ہیں اور خدا کے نام سے قسم دینے کی وجہ سے مطیع رہتے ہیں اس لئے کہ اسمار الٰہی کی خاصیت یہ ہے کہ ان کو مطیع کرسکتے ہیں۔"

قدیم زمانہ کفر و جہالت میں جادوگروں نے بہت سی کتابیں سحر میں لکھی تھیں۔ مثلاً کتاب آریوس بن اصطفان بن بطلینس رومی جو رومی افسونگروں میں سب سے بڑا عالم اور سربرآوردہ قوم کے لقب سے ملقب تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں جنوں اور دیووں کے حسب نسب اور ابلیس کی اولاد اور ملکوں میں ان کے متفرق ہونے کا تذکرہ کیا ہے اور ان میں ہر جنس سے جو علل وار واح و استہلاکات و افعال مخصوص ہیں سب کو بیان کیا ہے۔ ایک دوسری کتاب لوہق ساحر کی ہے جس میں جنوں کی سرشت و موالید و مواخید اور سرکش ارواح کا بیان ہے یہ کتاب آریوس رومی کی کتاب سے بڑی ہے۔

محمد بن اسحاق صاحب مغازی و سیر کا بیان ہے کہ خلفائے بنی عباس کے زمانہ میں اور خصوصاً بعہد خلیفہ مقتدر باللہ عباسی افسانوں اور خرافات سے بڑی دلچسپی لی جاتی تھی۔ اس وجہ سے افسانہ نویسوں نے خرافات میں کتابیں تصنیف کیں اور جس قدر جی میں آیا ان میں جھوٹ لکا۔ اس قسم کے خرافات بہت سے لوگ بنایا کرتے تھے جن کو علامہ ابن الندیم بغدادی نے مع نام و لقب بیان کیا ہے علمی کتابوں کے ضمن میں جب سحر کی کتابیں بھی عربی میں ترجمہ ہوئیں تو عوام پوری طرح سے ادھر ملتفت ہوگئے۔ اس لئے کہ وہم یہ سمایا ہوا تھا کہ سحر کے ذریعہ سے ہر قسم کے عجیب غریب کام مثلاً ابھارنا۔ توجہ دینا۔ تسلط بٹھانا۔ فوجوں کو شکست دینا۔ دشمنوں کو قتل کر ڈالنا۔ پانی پر چلنا اور دور و دراز مسافتوں کو تھوڑی دیر میں قطع کرنا ممکن ہے یہی وجہ ہے کہ سحر میں اکثر کتابیں تالیف ہوئیں۔

اس کا بادی ابن ہلال تھا۔ پیشتر اہل عرب ان امور سے ذرا بھی واقف نہ تھے۔ یہ دروازہ اسی نے کھولا۔ وہ اس فن میں سرآمد تھا اور اس نے اکثر کتابیں لکھی تھیں۔ مثلاً

۱۔ ارواح پراگندہ۔

۲۔ مفاخر اعمال۔

۳۔ تفسیر اقوال شیاطین بحضرت سلیمان علیہ السلام۔

۴۔ عہد سلیمانؑ با شیاطین[1] اس کے بعد ابن ہلال کے بہت سے مقلد نکل آئے جنہوں نے اپنی تصانیف میں اس کی پیروی کی۔ مثلاً ابن امام۔ صالح مدیری۔ عقبہ آذرمی۔ ابو خالد خراسانی۔ ابن ابی رصاصہ۔ خلف بن یوسف۔ عماد بن مرہ۔ وغیرہ وغیرہ جن کے نام گنانے سے کچھ حاصل نہیں۔

مسلمانوں میں شعبدہ کا بھی رواج نہ تھا۔ پہلے پہل عبید الکلیس (فرزانہ) اور ایک اور شخص نے جو قطب الرحا کے نام سے مشہور تھا اس بازی گری میں نام پیدا کیا۔ اس فن میں ان دونوں کی کئی کتابیں ہیں۔ مثلاً عبید فرزانہ کی کتاب شعبدہ و کتاب الخرافات اور قطب الرحا کی کتاب جس میں چابکدستی اور ریزہ ریزہ کر ڈالنے اور بیخ کنی کا بیان ہے اور ایک اور کتاب جس میں تلوار اور لکڑی اور پتھر اور چونہ نگل لینے اور صابون و شیشہ چبانے اور کھانے کا تذکرہ ہے اور ان سب کی تدبیریں اور طریقے لکھے ہیں[2]

غرض کہ اسلام کو ان نکمے خرافات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ آلائش جس سے اس کا دامن آلودہ ہوا یونانی اور رومی تمدن کا بقیہ تھی اور اس پر علمار اسلام نے سخت اعتراضات کئے اور سحر و شعبدہ میں مشغول ہونے والوں کی بڑی توبیخ کی۔

---

[1] کتاب الفہرست صد ۳۱۲ طبع لیپزک۔

[2] کتاب الفہرست صد ۳۱۲

کرشمۂ قدرت

(از مولانا عبداللہ العمادی)

کائنات کی ہر چیز اپنی قدرت و اقتدار کی نمائش چاہتی ہے مگر مُبدع کائنات کی قدرت کاملہ کی نموداریوں کو دیکھتی ہی نہیں، اور اگر غلط انداز نظروں سے دیکھ بھی لیا تو آمادۂ تکذیب ہوگئے۔ آج کی صحبت میں اسی قدرت کاملہ کا ایک نمونہ پیش خدمت ہے جس کو سمجھنے اور جس سے عبرت حاصل کرنے کے لئے پہلے آپ سورۂ رحمان کی تلاوت کریجئے اور پھر اُس رحمان ورحیم کی قدرت دیکھئے۔

(۱)

سورۂ رحمان میں جابجا فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ کا تنبیہی فقرہ وارد ہوا ہے جس کے معنی۔ "اے جماعت جن وانسان تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہو گے" بتلائے جاتے ہیں۔ اس فقرہ کا نسق اس طرح واقع ہوا ہے کہ پہلے خدا کی نعمتیں مذکور ہیں۔ پھر ان پر تنبیہ کیا گیا ہے۔ مثلاً۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ فِيهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانِ۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔

اور (اسی خدا نے) خلقت کے (فائدہ کے) لئے زمین بنادی ہے کہ اس میں میوے ہیں اور کھجور کے درخت ہیں جن (کی گیلوں) پر (قدرتی) غلاف چڑھے ہوتے ہیں اور (طرح طرح) کے اناج جو (بھوسی کے خول میں ہوتے ہیں اور خوشبودار پھول ہیں۔ تو (اے جماعت جن وانسان) تم دونوں اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں سے مکرتے رہو گے؟

لیکن مشکل یہ ہے کہ اس فقرہ کے قبل جا بجا ایسی ترتیب وتہدید کی آیتیں بھی وارد ہیں جن سے نعمت ورحمت کا مفہوم بمشکل سمجھ میں آسکتا ہے۔ مثلاً:

سَنَفْرُغُ لَكُمْ أَيُّهَا الثَّقَلَانِ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ۔ يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ فَانْفُذُوا لَا تَنْفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطَانٍ۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ۔ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِنْ نَارٍ وَنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرَانِ۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ۔ فَإِذَا انْشَقَّتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ۔ فَيَوْمَئِذٍ لَا يُسْأَلُ عَنْ ذَنْبِهِ إِنْسٌ وَلَا جَانٌّ۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ۔ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُونَ بِسِيمَاهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِي وَالْأَقْدَامِ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ هٰذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُونَ يَطُوفُونَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيمٍ آنٍ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ۔ (آیت ۱۵-۴۴)

اے دونوں گروہو عنقریب ہم تمہاری طرف کلیۃً[1] متوجہ ہونے والے ہیں۔ تو اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں سے تم دونوں مکرتے رہوگے۔ اے گروہ جن وانس اگر تم سے ہو سکے کہ آسمانوں اور زمین کے کناروں سے ہو کر کہیں کو نکل بھاگو تو نکل دیکھو مگر کچھ ایسا ہی زور ہو تو نکلو (اور وہ تم میں نہ ہے اور نہ ہوگا) تو اے دونوں گروہو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے۔ تم پر آگ کی کچی پکی لو برسائی جائیگی کہ تم اس کو دفع نہ کر سکوگے۔ تو اے دونوں گروہو تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں سے مکرتے رہوگے پھر جب (قیامت کے دن) آسمان پھٹا اور تیل کی طرح (اس کی رنگت) لال ہوئی (وہ آخری فیصلہ کا دن ہوگا) تو اے دونوں گروہو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے تو اس دن نہ تو گنہگار کے گناہ کی بابت کسی آدمی سے پوچھا جائے گا اور نہ کسی جن سے تو اے دونوں گروہو تم خدا کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے؟ اس دن گنہگاروں کو ان کی صورت سے پہچان لیا جائے گا۔ پھر (ان کے

---

[1] یہ ترجمہ ہم نے سب سے الگ ہو کر اس لئے کیا ہے کہ امام رازی نے اس آیت کی ترکیب میں ایک مشکل پیدا کر کے اس کے دو جواب دیئے

پٹھے اور پاؤں پکڑے جائیں گے۔ تو اے دونوں گروہو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہو گے، یہ ہے وہ جہنم جس کو گنہگار لوگ جھٹلاتے ہیں (اور قیامت کے دن) اس میں اور کھولتے ہوئے پانی میں (بیقرار پڑے) پھریں گے۔ تو اے دونوں گروہو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہو گے۔

اس مشکل کو آسان کرنے کے لئے کوشش ہونے لگی کہ جس طرح ہو سکے وعید آخرت و عذاب جہنم وغیرہا سے بھی نعمت کی شان پیدا کی جائے اور ثابت کیا جائے کہ لوگ جس چیز کو عذاب سمجھ رہے ہیں اس میں بھی نعمت و رحمت کی ادائیں ہیں۔ اس بنا پر تاویلات ذیل غور طلب ہیں:-

(الف) جن و انس کی جانب عذاب و ثواب پہنچانے کے لئے خدا کا متوجہ ہونا خود ہی نعمت ہے۔ اس سے بڑی اور نعمت کیا ہوگی کہ مطیع کو ثواب اور منکر کو عذاب دیا جائے گا۔ [۱]

(ب) آسمان و زمین کے دائرہ سے باہر نکل جانے کی دھمکی بھی نعمت ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ خدا نے جن و انس کے درمیان اس بات میں برابری کی نعمت عطا فرمائی ہے کہ اس کے ارادات و احکام کے خلاف نہ جن کوئی کام کر سکتے ہیں اور نہ انسان [۲]

(ج) آگ کی لپٹ کی بوچھار کئے جانے اور آسمان پھٹنے اور لال ہونے میں کوئی تاویل نہ چل سکی اور نعمت کا مفہوم ان چیزوں میں کسی طرح نہ نکل سکا۔ اس لئے علامہ ابن جریر نے اس آیت میں نعمت کی تاویل نظر انداز کر دی [۳]، مگر دوسرے مفسرین یہی کہتے چلے جاتے ہیں اور نعمت کا مطلب نکالنے کے باب میں خاموش

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۷) احق ان یجعل ما ھو دالیہ الضمیر قبل الفعل میقال تقدیرہ ؛ فالمذنب یومئذ لا یسئال عن ذنبہ انس ولا جان ؛ ملاحظہ ہو جلد ۸۔ صفحہ ۲۵۔

[۱] ابن جریر۔ جلد ۲۷۔ آخر صفحہ ۷۱۔ [۲] ابن جریر جلد ۲۷ آخر صفحہ ۷۲ و اول صفحہ ۷۳۔

[۳] ابن جریر۔ صفحہ ۷۴۔

ہو جاتے ہیں۔

(د) گنہگار کے گناہ کی بابت کسی دوسرے سے سوال نہ ہونا اس لئے نعمت ہے کہ صرف گنہگار پر عذاب ہوگا اور بے گناہ بری رہیں گے۔[۱]

(ھ) گنہگاروں کی پہچان قائم رہنا اور ان کی پکڑ دھکڑ ہونا بھی نعمت ہے کہ انہیں کی ذلت واہانت ہوئی اور دوسرے بچ گئے۔[۲]

(و) گنہگاروں کا جہنم سپرد کرنا اور انہیں کھولتے پانی میں ڈالنا بھی نعمت ہے اس لئے کہ وہ اس کے مستحق تھے۔[۳]

(ز) نعمتیں کئی قسم کی ہوتی ہیں۔

ایک نعمت ضروریات زندگی کا پیدا کرنا ہے مثلاً زمین جس پر ہم رہتے ہیں۔ اس کا پیدا کرنا بھی نعمت ہے یہ نہ ہوتی تو جگہ رہنے کے لئے کہاں سے آتی۔

نعمت کی دوسری قسم میں وہ چیزیں داخل ہیں جن کو بلا واسطہ ضروریات زندگی میں داخل کرنا تو مشکل ہے۔ مگر ہماری ضرورتوں میں کاربرآری کے لئے اُن کا ہونا بھی لازمی ہے۔ مثلاً نظام شمسی کی حرکت اور سیاروں کی چال کہ بغیر ان کے نہ موسم بدل سکتے ہیں۔ اور نہ غلہ پیدا ہو سکتا ہے۔

تیسری قسم کی نعمت وہ ہے کہ گو محتاج الیہ نہ سہی مگر مفید ضرور ہے مثلاً دریاؤں کا پیدا کرنا اور کشتیاں چلانا۔

چوتھی قسم کی وہ نعمت ہے کہ چاہے مفید نہ ہو۔ مگر ان سے ایک طرح کی آرائش ہو جایا کرتی ہے جیسے لعل و گوہر

یہ چاروں نعمتیں تو قوائے جسمانی کے متعلق ہوئیں۔ پانچویں نعمت جو سب سے بڑی ہے یہ ہے کہ خدا نے یہ جسمانی نعمتیں بھی انسان کو عنایت کیں اور ان سب سے اعلیٰ ایک روحانی نعمت بھی عطا فرمائی یعنی علم و

---

[۱] ابن جریر صفحہ ۷۵، [۲] ابن جریر صفحہ ۷۵۔ [۳] ابن جریر صفحہ ۷۶۔

تعلیم ، الرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ،

یہی وہ تاویلیں جن کی بنا پر فَبِاَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ میں لفظ آلاء کو نعمتوں کا مرادف ثابت کیا گیا ہے۔ لیکن کیا اس حد تک پہنچ کر تحقیق کا خاتمہ ہو گیا اور آگے کے لئے کوئی بات باقی نہیں رہی۔ اس کی تنقیح کے لئے ایک ذرا تامل کرنا چاہئے۔

(۲)

ان تاویلات کے متعلق ہم کچھ نہیں کہنا چاہتے اس لئے کہ منکروں پر عذاب ہونا ممکن ہے کہ مطیع بندوں کے لئے رحمت و نعمت ہو کہ بارے اس بلا و مصیبت میں وہی مبتلا ہوئے جو اس کے مستحق تھے اور غیر مستحق بچ گئے تو ہے لیکن سوال یہ ہے کہ عذاب جہنم کی وعید تو صرف منکروں سے مخصوص ہے۔ مطیع و مومن کو اس سے کیا تعلق۔ آگ کی کچی پکی تو انہیں جن و انس پر برسائی جائے گی جنہیں خدا کی خدائی سے انکار تھا اور دنیا میں وہ اس کی عظمت و جبروت کو جھٹلایا کرتے تھے۔ آیات میں انہیں منکروں سے خطاب بھی ہے اور انہیں کو ڈرایا بھی گیا ہے ظاہر ہے کہ ان کا گرفتار بلا ہونا دوسروں کے لئے نعمت ہو تو ہو خود ان کے لئے کسی طرح بھی نعمت نہیں۔ اور دوسروں کا جب یہاں تعلق ہی نہیں تو یہ بیل منڈھے چڑھے تو کیونکر ؟ خطاب ہے منکرین و مکذبین سے مستحق عذاب ہوں منکرین و مکذبین عذاب میں خود ان کے لئے کسی قسم کی نعمت و رحمت کا شائبہ نہو۔ با ایں ہمہ صرف پرائی نعمت کو یاد دلا کے ان پر مار پڑے۔ رہی مثل ہوئی کہ ہمسایہ کو خلعت ملا اور مجھ پر پڑی کہ تو اس نعمت کی قدر نہیں کرتا اور احسان نہیں مانتا۔ رہی نعمتوں کا فیلسوفانہ تقسیم۔ تو اس میں ہزار نکتے نکالے جائیں مگر یہ باتیں اسی وقت مفید ہو سکتی ہیں جب پہلے یہ ثابت ہولے کہ منکروں کا آگ میں جلایا جانا خود ان منکروں کے لئے زحمت نہیں ہے رحمت ہے۔ یہ کیا کہ رحمت کا تعلق مومنین سے ہو اور اس کا احسان کفار پر جتایا جائے یہ تو لسان الغیب کی داد خواہی ہوئی کہ ۔۔

خارا داد من لبستاں از وائے شحنۂ مجلس کہ مے با دیگراں خوردست و با من سر گراں دارد

---

۱ تفسیر کبیر جلد ۸ صفحہ ۔

(۳)

واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کا ہر آیہ اور ہر سورہ اپنے ماقبل و مابعد سے مربوط و منتظم ہے۔ سورۂ رحمٰن سے پہلے سورۂ قمر ہے جس میں چاند جیسے عظیم الشان کرّہ کے پھٹنے، سفلے آسمان کے پٹ کھولنے اور بڑی بڑی جبار اقوام کے پامال و فنا کر دینے کے اشارے ہیں اور ان سب کے تذکرہ سے خدا نے بندوں پر اپنی عظمت و جلال و قدرت کا سکہ بٹھایا ہے۔ سورۂ رحمٰن کے بعد سورۂ واقعہ ہے جس میں قیامت ہونے۔ زمین کے دہل اٹھنے پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہو جاتے بہشتیوں اور دوزخیوں پر رحمت اور عذاب ہونے سڑی گلی ہڈیوں پر گوشت و پوست پہنا کر آدمی بنانے مخلوقات کی شکل و ہستی بدل دینے۔ و مثل ذٰلک کے تذکرے ہیں اور ان کی بھی یہی غرض ہے کہ کمزور بر خود غلط انسان کو جناب باری کی عظمت و اقتدار کا اندازہ ہو سکے۔ ان دونوں کے بیچ میں سورۂ رحمٰن ہے جس کا افتتاح اس پر ہے :۔

اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ خَلَقَ	اس بڑے رحم والے (معبود) نے قرآن کی تعلیم دی۔ انسان کو پیدا کیا۔
الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ اَلشَّمْسُ	اُسے بولنا سکھایا۔ سورج اور چاند ایک حساب کے
وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ وَّالنَّجْمُ[1] وَالشَّجَرُ	ساتھ (گردش میں) ہیں۔ اور بوٹے اور درخت سر

[1] نجم ستارہ کو بھی کہتے ہیں اور پیڑوں کی جھاڑی کو بھی لیکن ستارے کی نسبت درخت کے ساتھ کم لگتی ہے۔ یہی مناسبت امام ابن جریر نے حضرت ابن عباس و سعید و سُدی و سفیان سے بھی روایت بھی کیا ہے کہ اس آیت میں شجر سے تنا ور درخت مراد ہے اور نجم سے بغیر تنا کی جھاڑی۔ خود ابن جریر بھی اختلاف کا تذکرہ کر کے لکھتے ہیں۔ واولی القولین قول من قال عنی بالنجم ما نجم من الارض من نبت لعطف الشجر علیہ فکان بان یکون معناہ لذٰلک ما قام علی ساق وما لا یقوم علی ساق یسجد ان للّٰہ بمعنی انہ تسجد لہ الاشیاء کلھا المختلفۃ الھیئات من خلقہ یعنی نجم کے معنی میں ستارہ اور بوٹوں کی جھاڑی کے دو قول جو ہیں تو ان دونوں میں یہ قول زیادہ صحیح و صائب ہے کہ نجم سے مراد وہ نباتی جھاڑیاں ہیں جو زمین سے اگتی ہیں اس لئے کہ لفظ "شجر" اسی پر معطوف ہے۔ گویا مطلب یہ ہوگا کہ درخت جو ساق والے ہوتے ہیں اور جھاڑی جو بے ساق کی ہوتی ہے دونوں خدا کے آگے سربسجود ہیں۔ یعنی اس کے مخلوقات میں تمام چیزیں جن کی شکل و ہیأت خواہ کتنی ہی مختلف ہو سب اس کی فرمانبرداری

يَسْجُدَانِ[1] وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ
الْمِيْزَانَ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ
وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا
الْمِيْزَانَ۔ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا
لِلْاَنَامِ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخْلُ
ذَاتُ الْاَكْمَامِ۔ وَالْحَبُّ
ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ۔ فَبِاَيِّ
اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ خَلَقَ
الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ
وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ رَبُّ
الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ۔ فَبِاَيِّ
اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ

سجود ہیں[1] اور اسی نے آسمان کو اونچا کیا اور ترازو بنا دی ہے کہ تم لوگ
تولنے میں (حد اعتدال سے) تجاوز نہ کرو۔ اور انصاف کے ساتھ
سیدھی تول تولو اور کم نہ تولو۔ اور اسی نے خلقت کے فائدے
کے لئے زمین بنا دی ہے کہ اس میں میوے ہیں اور کھجور کے درخت
ہیں جن کی گیلوں پر (قدرتی) غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔ اور خوشبودار
پھول ہیں۔ تو اے جن و انسان کے دونوں گروہو! تم اپنے پروردگار
کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے۔ اسی نے انسان (اول)
کو ٹھیکری کی طرح بجنے والی مٹی سے پیدا کیا اور جنوں کو آگ کی لو
سے۔ تو اے دونو گروہو! تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں
سے مکرتے ہوگے، (وہی جاڑے اور گرمی میں) آفتاب کے نکلنے کے
دو (مختلف مقاموں) اور (ایسے ہی) ڈوبنے کے دو (مختلف) مقاموں
کا مالک ہے۔ تو اے دونو گروہو! تم اپنے پروردگار کی کون کون سی
نعمتوں سے مکرتے رہوگے" اسی نے دو (طرح کے) دریا نکالے کہ

---

[1] سجدہ سر جھکانے کو کہتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ نہ درخت سر جھکاتے اور نہ جھاڑیاں سجدہ کرتیں۔ لیکن علامہ ابن جریر طبری نے ابورزین وسعید سے روایت کی ہے ظلهما سجودهما۔ یعنی درختوں اور جھاڑیوں کا سجدہ یہی ہے کہ ان کا سایہ پڑا پھرتا ہے۔ (ابن جریر صفحہ ۶۲/۲۷) اصل میں سجدہ کے مفہوم میں غایت انکسار و تذلل و فرمانبرداری مضمر ہے۔ اس لئے آیت میں سجدہ سے سر جھکانے کی ہیئات مراد نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم مقصود ہے۔ علامہ ابو السعود صفحہ ۷/۲۰ میں لکھتے ہیں:۔

"یسجدان ای ینقادان له تعالیٰ فیما یرید بهما طبعاً انقیاد الساجدین من المکلفین طوعاً"

(جلد ۸) درخت اور جھاڑیاں سجدہ کرتی ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ خدا جس بات کو چاہتا ہے وہ قدرتی طور پر اس امر میں حکم الٰہی کی مطیع رہتی ہیں اور یہ اطاعت ان کی اسی رنگ کی ہے جس رنگ میں کہ خدا کے مکلف بندے اظہار اطاعت کے لئے سجدہ کرتے ہیں۔)

يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ فَبِأَيِّ
آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ۔ يَخْرُجُ مِنْهُمَا
اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبَانِ۔ وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَآتُ
فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبَانِ۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقَىٰ
وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ
فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (۱۳-۱)

آپس میں ملتے ہیں (اور پھر بھی) دونوں میں ایک پردہ (رہتا) ہے کہ (اُس سے ایک دوسرے کی طرف) بڑھ نہیں سکتے[۱]۔ تو (اے دونوں گروہو) تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں سے مکرتے رہوگے (نکلتے ہیں[۲] اُن دونوں میں سے بڑے اور چھوٹے موتی[۳] تو (اے دونوں گروہو) تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے۔ اور اسی کے ہیں جہاز جو دریا میں پہاڑوں کی طرح اونچے کھڑے (دکھائی دیتے) ہیں تو (اے دونوں گروہو) تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمتوں سے مکرتے رہوگے۔ اس کرۂ زمین پر جتنے متنفس ہیں سب فنا ہونے والے ہیں اور (صرف) تیرے پروردگار کی ذات باقی رہ جائے گی جو بڑی عظمت والی اور بزرگ (ذات) ہے۔ تو (اے دونوں گروہو) تم اپنے پروردگار کی کون کونسی نعمتوں سے مکرتے رہوگے۔

---

[۱] دو دریا نکالنے کے متعلق عجیب عجیب اختلافات پیدا ہوگئے ہیں جن کی خشک پسند طبیعتوں کے نزدیک معمولی دریاؤں میں کوئی خاص اہمیت نہ تھی کہ قرآن میں ان کا تذکرہ ہوتا اس لئے بات یہ پیدا کی کہ دو دریاؤں سے ایک وہ دریا مراد ہے جو آسمان میں ہے اور ایک وہ جو زمین ہے۔ یہ دونوں سال میں ایک مرتبہ ملجایا کرتے ہیں۔

دوسرے فریق نے غالباً یہ سمجھ کر کہ بحر فارس و بحر روم سے مسلمانوں کے تعلقات نہایت وسیع ہیں تعین کردی کہ "مرج الْبَحْرَيْنِ" میں خدا نے انہیں دونوں دریاؤں کا ارادہ کیا ہے۔

ابن جریر نے صفحہ ۶۸ میں یہ دونوں روایتیں نقل کی ہیں۔ اور خود ان کی رائے میں پہلی روایت کو ترجیح ہے۔

لیکن اس خشک پسندی میں پھنسنے کی ضرورت کیا ہے جس چیز کا تعین خدا اور رسولؐ نے نہ کیا ہو اور عقل و علم بھی اس کے حامی نہ ہوں اس کو ماننا کیا ضرور ہے۔ کیوں نہ وہ تمام دریا اس سے مراد ہوں جو باہم ملتے ہیں اور پھر بھی جدا رہتے ہیں (باقی بر صفحہ ۶۴)

(بقیہ)

تاریخ شاہد ہے کہ عجمیت کے غلبہ نے عربیت کے خط و خال تک بدل دیئے اس طوفان میں عربی زبان اور اس کے اسلوب کا برقرار رہ جانا کچھ آسان نہ تھا، الفاظ تو وہی رہے، مگر معانی تبدیل ہوگئے لغویین تو اکثر سب عجمی تھے اِلّا ماشاء اللہ وہی بدلے ہوئے معانی لغت میں ثبت کردیئے کس کو فرصت کہ کلام جاہلیت کا تتبع کرے اور سمجھے کہ کلام اللہ جس زبان میں نازل ہوا اس کے کلمات کا مفہوم اس زبان میں کیا تھا۔

یہی دیکھئے کہ لفظ آلاء کے معنی سب نے نعمتوں کے قرار دیئے ہیں۔ علامہ زمخشری عربی زبان کے ایک مشہور ادیب ہیں اور عربیت میں ان کی دستگاہ مسلّم ہے اگر اپنی تفسیر میں وہ بھی اس سے قدم نہیں بڑھاتے۔

(بقیہ صفحہ ۶۳) کمال اتصال پر بھی ایک دوسرے سے ممتاز رہیں اور کسی ایک کو دوسرے پر زیادتی کا موقع نہ ملے۔

۵ امام رازی نے یہ مانکر کہ آیت مذکورہ میں دو دریاؤں سے میٹھے اور کھارے پانی کے دو دریا مراد ہیں۔ خود ہی یہ اعتراض کیا ہے کہ ان دونوں قسم کے دریاؤں سے موتی کیونکر پیدا ہو سکتے ہیں۔ موتی تو محض دریائے شور میں پیدا ہوتے ہیں میٹھے پانی کے سمندروں میں تو پیدا نہیں ہوتے اس اعتراض کا امام صاحب نے کئی طرح سے جواب دیا ہے۔

(۱) قرآن جب دعویٰ کر رہا ہے کہ دونوں قسم کے سمندروں سے موتی نکلتے ہیں تو اس کے خلاف انسانی تجربہ ناقابل تسلیم ہے

(۲) بالفرض دریائے شور ہی میں موتی پیدا ہوتے ہوں لیکن آخر پیدا تو صدف کے اندر مینہ کے قطرہ ہی سے ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ مینہ کو آسمان ہی کے دریا سے تعلق ہے۔

(۳) دونوں دریاؤں سے موتی پیدا ہونے کا یہ منشا نہیں ہے کہ ہوں تو دونوں ہی ہوں۔ کسی ایک میں بھی اگر پیدا ہوں تو مطلب نکل آیا۔ محاورہ میں کہتے ہیں۔ خرج فلان من بلاد کذا۔ ودخل بلاد کذا۔ بلاد بلدہ کی جمع ہے۔ حالانکہ اس شخص کا داخلہ یا خروج کسی ایک خاص شہر سے ہوا کرتا ہے (تفسیر کبیر جلد ۸ صفحہ ۱۴۱ و ۱۵۰)

ان تاویلوں کے متعلق دریافت طلب یہ ہے کہ:۔ (۱) قرآن نے کب اور کہاں یہ دعویٰ کیا کہ مرج البحرین میں "بحرین" سے دریائے شور و دریائے شیریں مراد ہیں اور ان دونوں سے موتی پیدا ہوتے ہیں۔ (۲) صدف میں مینہ کے قطرے سے موتی کا پیدا ہونا خلاف تحقیق ہے۔ (۳) آخری تاویل قرین قیاس ہے بشرطیکہ تاویل کا مبنیٰ ضعیف نہ ہو۔

۶ محاورۂ عرب میں بڑے موتیوں کو لؤلؤ اور چھوٹے کو مرجان کہتے ہیں۔ ابن جریر نے حضرت ابن عباس اور قتادہ و ضحاک کی روایتیں بھی اس کی تائید میں نقل کی ہیں۔ (تفسیر ابن جریر جلد ۲ صفحہ ۹۱)

اہل لغت میں صاحب لسان العرب کا خاص پایہ ہے مگر وہ بھی آگے نہیں بڑھتے [۱]
اکیلے ایک ابن جریر طبری ہیں کہ آلاء کے معنیٰ "قدرۃ" لکھتے ہیں۔

لیکن اس معرکۂ جدل میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے ؟ کلام اللہ جس زبان میں نازل ہوا آئیے اسی زبان اور اسی صدی کی زبان میں دیکھیں کہ اہل زبان اس کے کیا معنیٰ سمجھتے تھے۔

کمیت اپنے گھوڑے کی صفت کرتا ہے۔

فرضیتُ آلاءَ الکمیت فمن یبع ۔۔۔ فرساً فلیس جوادنا بمباعٍ [۲]

حماسی اپنے ممدوح ولید بن ادہم کے اقتدار کا مرثیہ خواں ہے۔

اذا ما امرؤٌ اثنیٰ بآلاءِ میّتٍ ۔۔۔ فلا یبعد اللّٰہ الولید بن ادھما

نضالہ فقر کی برائیاں گناتا ہے:۔

وفی الفقر ذلٌّ للرقاب، وقلّما ۔۔۔ رأیتُ فقیراً غیر نکس مُذَمَّم

یلاموان کان الصواب بکفہ ۔۔۔ وتُحمد آلاءُ البخیل المدرھم [۳]

لطف یہ ہے کہ خود صاحب لسان العرب نے مادّہ "نبہ" میں طرفہ کا یہ شعر نقل کیا ہے:۔

کاملٌ یجمعُ آلاءَ الفتی ۔۔۔ نَبَہٌ سیدُ سادات خضم [۴]

کلام میں تدبر کرنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ اس زمانہ میں "الاء" کو قدرت و اقتدار کے معنے میں استعمال کرتے تھے جو نعمت و عذاب دونوں پر یکساں حاوی ہے، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اوصاف مراد لیتے تھے یہی معانی کلام عرب سے مترشح ہیں، اور کلام اللہ میں، ٹھیک اترتے ہیں۔

---

[۱] لسان العرب ج ۱۸ ص ۴۷۔ [۲] کتاب الاقتضاب للبطلیوسی ص ۴۵۹۔ [۳] کتب المعرین ۸۵

[۴] لسان العرب ج ۱۷ ص ۴۴۴۔

—(۵)—

ایک بات کہنے سے رہ گئی، منشار غلط نابغہ کا یہ شعر تھا:۔

هم الملوك وابناء الملوك لهم فضل على الناس في الآلاء والنعم

عجمی اہل لغت "نعم" "یہ آلاء" کو قیاس کرکے دونوں کو مترادف سمجھے، اور اس ترادف کو وصت بلور کرنے کے لیے پورا دیوان عجم بھرا پڑا تھا۔

فردوسی کہہ چکا ہے:۔

بہ زیخ انگبیں ریزی و شہد ناب

سمجھے کہ انگبیں و شہد ایک ہے تو "آلاء" اور "نعم" کیوں نہ ایک ہوں، اسلوب عرب سے گر آگاہ ہوتے تو مترادفات کا خیال ہی نہ آتا جس سے ادب عرب کو سروکار ہی نہ تھا۔ جاہلیت کا کوئی دیوان دیکھئے ایک بیت میں ایک معنے کے لئے دو لفظ کبھی نہ لائیں گے اگر کسی نے یہ غلطی کی تو ساقط الاعتبار ہوگیا لہ نابغہ کا مطلب صاف ہے کہ "آلاء" یعنے اقتدارات اور نعمات دونوں میں اس کے ممدوحین کی افضلیت مسلم ہے۔

حاشیہ۔ لہ آلاء جمع ہے الا، الی، واحد، واحد کی صورت میں جب مکسور الاول لاتے ہیں تو اس سے عہد و پیمان مراد لیتے ہیں۔ اعشیٰ کہتا ہے۔

ابیض لا یرهب الهزال ولا يقطع رحما ولا يخون إلا

جمع کی صورت میں جب آلاء کو غیر ممدود لاتے ہیں تو اس سے ایک درخت مراد لیتے ہیں جس کے پھل دیکھنے میں تو خوش مزہ مگر چکھنے میں بہت تلخ ہوتے ہیں بشر بن ابی خازم کہتا ہے۔

فانکم ومدحکم بجیرا ابا لجاء کما امتدح الالاء

نعمت سے آلاء کی تاویل بھی خوش منظر ہے، لیکن اہل ذوق کو اندیشہ ہے آلاء کی طرح یہ بھی تلخ نہ ہو

(۶)

مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہو کہ سورۂ رحمان کی ابتدا جہاں خدا کی رحمت سے ہوئی ہے کہ سابق و لاحق کی جلال و جبروت کی باتوں سے انسان مرعوب ہو کر از خود رفتہ نہ ہو جائے۔ وہیں ساتھ کے ساتھ ایسے واقعات بھی یاد دلائے ہیں جو قدرت خداوندی کے عظیم الشان نمونے ہیں اور جن و انس کو ان پر متنبہ کیا ہے کہ وہ قادر مطلق جس کی قدرت اس قدر وسیع ہو اُس کے کون کون سے اقتدار سے مکر سکتے ہو۔ علامہ ابن جریر فرماتے ہیں:۔

حدثنی یونس قال اخبرنا ابن وھب قال قال ابن زید فی قوله۔ فَبِاَيِّ آلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ۔ قال " الآلاء القدرة فَبِاَيِّ آلائه تکذب خلقکم کذا و کذا فَبِاَيِّ قدرة الله تکذبان ایھا الثقلان الجن والانس۔	مجھ سے یونس نے روایت کی کہ ابن وہب نے انہیں اطلاع دی کہ۔ فَبِاَيِّ آلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ کے متعلق ابن زید لکھتے ہیں کہ " آلاء " کے معنے قدرت کے ہیں۔ یعنی خدا نے تمہیں اس طرح پیدا کیا۔ تم اے جماعت جن و انس خدا کی کون کون سی قدرتوں کو جھٹلاؤ گے۔[۱]

امام رازی خَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ انسان کو جو نعمتیں خدا نے دی ہیں جب ان کا گنانا مقصود تھا تو " جن " کے پیدا کرنے میں کون سی نعمت ٹھیری۔ اس اعتراض کے تین جواب دیئے ہیں۔ اور آخر میں لکھتے ہیں:۔

ان الاٰیة مذکورة لبیان القدرة لا لبیان النعمة[۲]	یہ آیۃ نعمت کا تذکرہ کرنے کے لئے نہیں ہے بلکہ قدرت کا تذکرہ کرنے کے لئے ہے[۲]

ایک دوسرے مقام پر یَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ (ان دو طرح کے دریاؤں

[۱] تفسیر ابن جریر جلد ۲۷ صفحہ ۷۵ [۲] تفسیر کبیر جلد ۸ صفحہ ۱۳

میں سے بڑے چھوٹے موتی نکلتے ہیں) کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

ای نعمۃ عظیمۃ فی اللؤلؤ	بڑے چھوٹے موتی میں کون ایسی بڑی نعمت
المرجان حتی یذکرھما اللہ	ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی تعلیم اور انسان کی
تعالیٰ مع نعمۃ تعلم القرآن	آفرینش کے ساتھ میں اس کا بھی تذکرہ کیا ؛

وخلق الانسان ؛

اس اعتراض کے دو جواب دیئے ہیں۔ ایک وہ جس میں نعمتوں کی تقسیم کی ہے اور جس کو حرف (ز) کے تحت ہم نقل کر چکے ہیں۔ دوسری توجیہ حسب ذیل ہے :۔

ھذہ بیان عجائب اللہ تعالیٰ	یہ اللہ تعالیٰ کے عجائب قدرت کا بیان ہے۔
لا بیان النعم[1]	نعمتوں کا بیان نہیں ہے۔[1]

الاء کو قدرت کا مماثل مان لینے کے بعد کسی تاویل کی حاجت نہیں رہتی۔ رحمت و نعمت و عذاب ان سب کا مفہوم اسی قدرت کے تحت آجاتا ہے ؛

---

[1] تفسیر کبیر، ص ۱۵

غرانیق علےٰ

(از جناب مولانا عبداللہ العمادی)

(۱)

غرانیق، غرنیق یا غرناق یا غرنوق کی جمع ہے۔ جس سے گورے رنگ کے خوبرو نرم و نازک نوجوان مراد ہیں۔

اذا انت غرناق الشباب میال ذوردا بتین ینفان السربال

امیر المومنین علیؓ بن ابی طالب فرماتے ہیں۔

کأنی انظر الی غرنوقٍ من قریشٍ یتشحط فی دمة

بھری جوانی کا مفہوم بھی آتا ہے:۔

الا ان تطلاب الصبی منات زلّةٌ وقد فات ریعان الشباب لغرانق

فربہ وجسیم کو بھی کہتے ہیں۔

قلتُ لسعدٍ وھو بالازارقِ علیك بالمحض وبالمشارقِ

واللھو عند بادنٍ غرانقِ

ایک طرح کی مرغابی کا نام بھی ہے:۔

اجار اینا لجّۃ بعد لجّۃٍ اذل کعونیق الضحول عمّوّجُ

اسی نام کا ایک پودا بھی ہے۔

ابن الانباری کہتے ہیں:۔

الغرانیق العلیٰ ھی الاصنام وھی فی غرانیق علےٰ سے بت مراد ہیں اصل میں یہ مرغابیوں کا

الاصل الذکر من طیر الماء وکانوا یزعمون ان الاصنام تقربھم من اللّٰہ وتشفع لھم الیہ فشبھت بالطیور التی تعلو وترتفع فی السماء۔

نام ہے۔ مشرکین کو گمان تھا کہ جناب الٰہی میں بت ان کے ذریعہ تقرب ہیں اور اس بارگاہ میں ان کی شفاعت کرتے ہیں، اسی بنا پر بتوں کو ان چڑیوں سے تشبیہ دی جو بلند ہوں اور اونچے اڑیں اور آسمان کی خبر لیں۔

—— ۲ ——

یہ تو لفظ کے معنی ہوئے اب مطلب کو دیکھئے کہ مظہر عجائب و مطلع غرائب ہے۔

اس لفظ کو آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام سے منسوب کرتے ہیں کہ یوں تو آپ ہمیشہ بتوں کے دشمن تھے، لیکن ایک دن شیطان نے قابو پا کر آپ کی زبان سے بھی بتوں کی تعریف کرا ہی لی۔

کیا شیطان کو اتنی قدرت ہے کہ انبیائے کرام بھی اس کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکیں؟ مفسرین اس سوال کے جواب میں مذبذب ہیں، اور اس تذبذب کی وجہ سورہ حج کی یہ آیت ہے:۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّا اِذَا تَمَنّٰۤى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْۤ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۲۲ : ۶ آیت ۳۶)

ہم نے تمہارے قبل کوئی رسول و نبی ایسا نہیں بھیجا کہ اس نے جب تمنا کی ہو تو شیطان نے اس میں وسوسہ نہ ڈالا ہو، خدا شیطانی وسوسہ کو مٹا کر اپنی نشانیوں کو استوار کرتا ہے اور خدا دانا حکیم ہے

یعنی پیغمبر جب تقرب الی اللہ کے لئے کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو شیطان اس کے خلاف وسوسے پیدا کرتا ہے۔ پیغمبر اس صورت میں خدا سے رجوع کرتا ہے۔

اس کی نظیر ایک دوسری آیت ہے۔

ان الذین اتقوا اذا مسھم طائف من الشیطان تذکروا فاذا ھم مبصرون۔
(سورہ ۷، رکوع ۲۴، آیت ۱۷۹)

پرہیزگاروں کو جب شیطان کی کسی گروہ نے چھو لیا (یعنی برے خیالات کے دل میں آئے) تو انہیں نے (اللہ کو) یاد کیا تھا کہ ناگاہ بینش والے ہو گئے

ایک اور آیت میں ہے:۔

وامّا ینزغنك من الشیطان نزغٌ	شیطان جب تیرے دل میں کوئی وسوسہ ڈالے تو
فاستعذ باللہ (۷: ۲۴)	خدا سے پناہ مانگ

غرض یہ ہے کہ پیغمبران مرسل کو خدا نے اگرچہ دانستہ خطا سے معصوم بنایا ہے لیکن جواز سہو اور وسوسہ شیطانی سے وہ معصوم نہیں۔ اس باب میں جو تمام آدمیوں کا حال ہے وہی ان کا بھی ہے بجز ان امور کے جو وہ جان کر کریں۔ سہو میں ان کی پیروی نہ کرنی چاہیئے جو کام وہ بالقصد کرتے ہیں استوار و محکم ہی ہے ابو مسلم کہتے ہیں کہ آیت کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے انسان کے لئے انہیں میں سے پیغمبر بنا کر بھیجے ہیں اور فرشتے نہیں بھیجے ہیں۔ اور کوئی پیغمبر ایسا نہیں کہ وحی کی تلاوت میں شیطانی وسوسہ سے بچا ہو۔ شیطان اس کے ذہن میں وحی کی منافی باتیں ڈال دیتا ہے۔ اور اسے یاد کرنے نہیں دیتا۔ لہذا اللہ تعالیٰ پیغمبر کو وحی اور حفظ وحی پر ثابت قدم کر دیتا ہے اور اسے یہ بتا دیتا ہے کہ یہ امر درست ہے اور شیطان کی جانب سے جو بات ہوتی ہے اس کو مٹا دیتا ہے (رازی ج ۲ ص ۲۵)

(۲)

مفسرین اس کی شان نزول میں روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر جب قوم کا رخ پھیرے ہوئے رہنا گراں گذرا تو آپ کے جی میں آیا کہ ایسی وحی نہ اترتی جس سے قریش متنفر ہوں۔ اس لئے کہ آپ کو ان کے ایمان لانے کی بڑی تمنا تھی، ایک روز آپ قریش کی ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ سورۃ وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ اترا، آپ نے اس کو پڑھنا شروع کیا۔ جب اس آیت پر پہنچے۔ اَفَرَاَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی۔ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰی۔ اور وہ خواہش دل میں موجود تھی تو شیطان نے آپ کی زبان پر جاری کر دیا کہ۔ تلك الغرانیق العلے وان شفاعتهن لترتجیٰ۔ (یعنی ان نازک اندام و عالیشان بتوں سے شفاعت کی امید ہے) قریش نے جب یہ سنا تو خوش ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

بدستور پڑھتے رہے حتیٰ کہ جب سورۃ ختم ہوئی تو آپ نے آخر میں سجدہ کیا اساتھ ہی مجلس میں جتنے مسلمان و کافر تھے سب نے سجدہ کیا۔ قریش کی خوشی کا کیا کہنا کہنے لگے کہ محمدؐ نے ہمارے معبودوں کو خوبی سے یاد کیا ہے حضرت جبریل ؑ آئے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ نے یہ کیا کیا کہ خدا کی جانب سے میں جو الفاظ نہیں لایا تھا وہ آپ نے پڑھ دیئے اس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم رنجیدہ ہوئے اور بہت ڈرے تو اللہ نے یہ آیت اتاری۔

اس واقعہ کو ابن ابی حاتم طبری وابن منذر نے شعبہ کی سند سے اور بزار وابن مردویہ نے امیہ بن خالد سے روایت کیا ہے اور وہ بھی شعبہ ہی سے روایت کرتے ہیں۔ ابن اسحاق نے اس کو تفصیلاً سیرۃ النبیؐ میں محمد بن کعب کی سند سے اور موسی بن عقبہ نے مغازی میں ابن شہاب کی سند سے اور ابو معشر نے محمد بن کعب کی سند سے روایت کیا ہے۔

حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ " معنی سب کے ایک ہیں اور بجز سعید بن جبیر کے یہ حدیث اور جتنے طریقوں سے روایت ہوئی ہے سب یا تو ضعیف ہیں یا منقطع ہیں۔ لیکن کثرت طرق سے پتہ چلتا ہے کہ قصہ کی کچھ نہ کچھ اصلیت ہے۔ اس کے دو طریقے اور بھی ہیں جو مرسل ہیں۔ اور ان کے راوی ویسے ہی ہیں جیسے صحیحین کے ایک روایت تو وہ ہے جو طبری نے یونس بن یزید کی سند سے ابن شہاب سے روایت کی ہے اور دوسری وہ ہے جو معتمر بن سلیمان وحماد بن سلمہ کی سند سے روایت کی ہے۔ ابوبکر بن العربی نے حسب عادت بڑی جراُت سے کہا ہے کہ طبری نے اس بارے میں بہت سی لغو بے اصل روایتیں درج کی ہیں " اور عیاض نے کہا ہے کہ اس حدیث کو اہل صحت میں کسی ثقہ نے بسند صحیح متصل روایت ہی نہیں کیا ہے۔ اس کے ناقل جتنے ہیں سب ضعیف ہیں روایتیں مضطرب ہیں اور سند منقطع ہے۔ تابعین ومفسرین میں جن لوگوں نے

لہ حدیث مرسل وہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے یا یہ کہا ہے اور صحابی جس کے واسطے سے اس کی حدیث روایت کرنی چاہیئے اس کا نام نہ ہو۔ حدیث مرسل کے قابل استدلال ہونے میں اہل علم مختلف ہیں۔ امام شافعی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ اگر کسی دوسرے درست طریقے سے بھی مرسل کی تقویت ہوتی ہو تو مان لینا چاہیئے ورنہ نہیں لہ +

اس قصہ کو بیان کیا ہے کسی نے سند نہیں پیش کی اور نہ اصل راوی تک مرفوع کیا۔ اس کے اکثر طریقے ضعیف ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ "یہ تمام اقوال خلاف قاعدہ ہیں۔ اس لئے کہ روایت کے طریقے جب کثیر ہوں اور ماخذ مختلف ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کوئی اصلیت ہے اور پہلے بیان ہو چکا ہے کہ ان میں تین حدیثوں کی سندیں صحیح کے قاعدے پر ہیں اور یہ تینوں مرسل ہیں۔"[1]

(۴)

حقیقت یہ ہے کہ "ایسی حالت میں حدیث مرسل سے استدلال صحیح نہیں روایت جب فاسد ہے تو گو اس کے بہت سے طریقے ہوں اور مختلف ماخذ ہوں لیکن بنائے استدلال اس کو قرار دینا بنائے فاسد علی الفاسد ہے ابن العربی و قاضی عیاض نے جو لکھا ہے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی جلالت شان کے وہی مناسب ہے اس لئے کہ آنحضرتؐ کی عصمت اور اس قسم کے رذائل سے منزہ و مبرّا ہونے پر اُمّت کا اجماع ہے اور دلیل قائم ہو چکی ہے۔ نعوذ باللہ نہ ایسی بات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دل میں آسکتی ہے اور نہ زبان پر کہ پیغمبر ہو کر عمداً یا سہواً خدا پر جھوٹ باندھیں۔ یہ تو عقلاً و عرفاً بھی محال ہے اس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو بہت سے مسلمان مرتد ہو جاتے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔ اور جو مسلمان وہاں موجود تھے۔ ان سے یہ واقعہ مخفی کیونکر رہا؟"[2]

حافظ ابن حجر نے اسی وجہ سے ایک مقام پر خود کہا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اثنائے قرأت میں شیطان کا القا کرنا نہ تو از روئے عقل صحیح ہے اور نہ از روئے نقل۔[3]

از روئے عقل اس لئے نہیں کہ جس نے یہ جائز رکھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بتوں کی تعظیم کی اس کا یہ قول کفر ہے۔ اس لئے کہ بداہۃً معلوم ہے کہ آپ کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ بتوں کا ازالہ ہو۔ اگر اس کو جائز سمجھیں تو شریعت سے امن و حفاظت اٹھ جائے اور تمام احکام و قوانین اسلام میں ماننا پڑے کہ ایسے ہی ہیں اور خدا کا یہ قول غلط ہو جائے کہ:-

---

[1] فتح الباری، جلد ۸ صفحہ ۳۳۳۔ [2] عینی، جلد ۹ صفحہ ۴۱۔ [3] فتح الباری، جلد ۸ صفحہ ۳۴۲ و ۳۴۳۔

يَآأَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ۔

اے پیغمبر تمہارے پروردگار نے جو تم پر اتارا ہے اس کی تبلیغ کرو، اور اگر تم نے نہ کی تو پیغامبری نہ کی اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچائے رہے گا۔ (سورہ ۵ رکوع ۹ آیت ۶۲)

اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ وحی میں کم کرنا یا بڑھانا دونوں یکساں ہے۔

نقلاً یہ واقعہ اس لئے صحیح نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ

ہم پر اگر وہ بعض باتیں گڑھ کر کہتا تو ہم اس سے مواخذہ کرتے اور اس کے دل کی رگ کاٹ دیتے۔

(سورہ ۶۹۔ رکوع اول۔ آیت ۱۹ اور ۲۰)

اور دوسری آیت میں ہے :۔

قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوْحٰٓى إِلَيَّ ؕ

اے پیغمبر کہدو کہ یہ مجھ سے کہاں ممکن کہ وحی کو میں اپنے جی سے بدل دوں مجھ پر جو وحی آتی ہے اسکی پیروی کرتا ہوں۔

خود اسی سورۃ النجم میں ہے :۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ؕ (سورہ ۵۳۔ رکوع ۲۔ آیت ۱ و ۲)

پیغمبر احکام الٰہی میں اپنی خواہش سے نہیں بولتا بلکہ اس کا کلام وحی ہوتا ہے۔

اس آیت کے بعد اگر تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى پڑھتے اور بتوں کی تعریف کرتے تو اسی وقت اللہ کی تکذیب ہو جاتی اور یہ کوئی مسلمان نہیں کہہ سکتا۔

(۵)

حدیث میں ہے کہ محمد بن اسحاق بن خزیمہ سے اس قصہ کی بابت استفسار کیا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ "اس کو بے دینوں نے وضع کیا ہے۔ اور پھر اس کے ابطال میں ایک کتاب بھی تصنیف کی"

بیہقی نے فرمایا ہے "کہ حدیث سے یہ قصہ ثابت نہیں" اس کے جتنے راوی ہیں بیہقی نے سب میں کلام کیا ہے اور سب کو مطعون ٹھیرایا ہے[۱]۔

حدیث میں صرف اس قدر ابن مسعود سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ النجم کو پڑھ کر سجدہ کیا، بجز ایک قریشی سردار کے کہ اس نے مٹھی بھر کنکری یا مٹی اٹھا کر پیشانی پر مل لی" عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ وہ بحالت کفر قتل ہوا یہ حدیث بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کی ہے

اور ابن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ النجم کے آخر میں سجدہ کیا اور آپ کے ساتھ مسلمان و کافر جن وانس یعنی سب نے سجدہ کیا۔ یہ حدیث بخاری نے روایت کی ہے

ان روایات صحیح میں کہیں نہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ کہے یا پڑھے تھے۔

جو واقعہ مفسروں نے اس قصہ میں ابن عباس سے روایت کیا ہے تو ابن عباس سے اس کا راوی کلبی ہے اور وہ نہایت ضعیف بلکہ متروک و ناقابل اعتبار ہے۔ ایک دوسری سند سے نحاس نے بھی اس کو روایت کیا ہے جس کے راوی واقدی ہیں اہل حدیث میں ان کے نام ہی کا آنا اس حدیث کے بے سروپا ہونے کے لئے کافی ہے۔

امام بزار کہتے ہیں ہم نہیں جانتے کہ یہ حدیث رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بسند متصل مروی ہو"

ابن کثیر کہتے ہیں "بہت سے مفسرین نے قصہ غرانیق بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ اکثر مہاجرین حبشہ سے اس گمان کی وجہ سے لوٹ آئے کہ مشرکین مسلمان ہو گئے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث کی تمام سند کے جتنے طریق ہیں سب مرسل ہیں، میں نے کوئی بھی صحیح طور پر مستند نہیں دیکھا[۲]"

خلاصہ یہ کہ اس باب میں جتنی روایتیں ہیں سب یا تو مرسل ہیں اور یا منقطع السند ہیں جن میں ایک بھی قابل استدلال نہیں۔ جن صاحبوں کو یہ تمام حدیثیں دیکھنا ہوں وہ سیوطی کی درمنثور میں دیکھیں[۵]۔

---

[۱] زرقانی جلد ۱ صفحہ ۳۵۴ و ۳۶۴ [۲] فتح البیان جلد ۶ صفحہ ۱۸۰ و ۱۸۱۔

کلام القرآن

(از جناب مولوی اکرم علی محمدی صاحب)

قرآن مجید کی آیات کو روزمرہ کی بول چال میں رواج دینے کی تجویز ایک عمدہ تجویز ہے جسے بعض احباب نے پیش کیا ہے۔ اب اس چیز کا رواج مسلمانوں سے اُٹھ گیا ہے۔ مگر ایک زمانہ میں جب کہ قرآن سے مسلمانوں کا شغف بہت بڑھا ہوا تھا قرآنی آیات اور قرآنی الفاظ بکثرت زبانوں پر چڑھ گئے تھے۔ اور عام طور پر بول چال میں استعمال ہوتے تھے۔ بعض بزرگوں کے متعلق تو مشہور ہے کہ وہ آیات قرآن ہی میں بول چال کیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابن المبارک نے خود اپنا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ جو ایک ضعیفہ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ سفر حج سے واپسی پر ایک سن رسیدہ خاتون سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے اس کو سلام کیا تو اس نے جواب دیا۔ سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيمٍ۔ پھر حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

ابن المبارک۔ آپ کس شغل میں ہیں؟

ضعیفہ۔ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ (اعراف) یعنی جس کو اللہ نے بھٹکا دیا ہو اس کے لئے کوئی رہبر نہیں (مطلب یہ تھا کہ میں راستہ بھول گئی ہوں)۔

ابن المبارک۔ آپ کہاں جانے کا ارادہ رکھتی ہیں؟

ضعیفہ۔ سُبْحَانَ الَّذِيْ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰى (بنی اسرائیل) یعنی پاک ہے وہ خدا جو اپنے بندے کو ایک رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ لے گیا (اس سے معلوم ہوا کہ وہ حج سے فارغ ہو کر بیت المقدس جانا چاہتی تھیں)

ابن المبارک ۔ آپ یہاں کتنے روز سے مقیم ہیں؟

ضعیفہ ۔ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا (مریم) یعنی مسلسل تین راتیں گذر گئی ہیں۔

ابن المبارک ۔ میں آپ کے پاس کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں دیکھتا؟

ضعیفہ ۔ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ۔ (شعراء) یعنی خدا ہی مجھے کھلاتا پلاتا ہے۔

ابن المبارک ۔ اس جنگل میں وضو کیسے کرتی ہوں گی؟

ضعیفہ ۔ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا (مائدہ) یعنی حکم ہے کہ اگر پانی نہ ملے تو مٹی سے تیمم کر لیا کرو۔

ابن المبارک ۔ میرے پاس کھانا ہے۔ آپ نوش فرمائیں گی؟

ضعیفہ ۔ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّیْلِ ۔ (بقرہ) یعنی روزوں کو رات آنے تک پورا کرو۔ (مطلب یہ تھا کہ میں روزے سے ہوں)۔

ابن المبارک ۔ مگر یہ رمضان کا مہینہ تو نہیں ہے

ضعیفہ ۔ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاکِرٌ عَلِیْمٌ ۔ (بقرہ) مطلب یہ تھا کہ یہ نفل روزہ ہے۔ رضا کارانہ رکھا گیا ہے۔

ابن المبارک ۔ سفر میں تو اللہ نے افطار کی اجازت دی ہے۔ پھر آپ روزے کی تکلیف کیوں اٹھاتی ہیں؟

ضعیفہ ۔ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔ (بقرہ) اگر تم سمجھ سے کام لو تو معلوم ہو جائے کہ روزہ رکھنا تمہارے لئے اچھا ہے۔

ابن المبارک ۔ میں جس طرح بات کرتا ہوں اس طرح آپ کیوں نہیں کرتیں؟

ضعیفہ ۔ مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ (ق) آدمی کی زبان سے جو

لفظ بھی نکلتا ہے اس کی نگرانی کے لیے ایک فرشتہ تیار بیٹھا ہے۔

ابن المبارک۔ آپ کس قبیلے سے ہیں؟

ضعیفہ۔ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ۔ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل) جس بات کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ۔ کان، آنکھ، دل سب سے سوال کیا جائے گا۔

ابن المبارک۔ معاف فرمائیے۔ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی کہ ایسا سوال کیا۔

ضعیفہ۔ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ۔ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ (یوسف) اب تم پر کچھ سرزنش نہیں اللہ تمہیں معاف کرے۔

ابن المبارک۔ آپ چاہیں تو میں آپ کو اپنی اونٹنی پر بٹھا دوں تاکہ قافلے سے جا ملیں۔

ضعیفہ۔ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ۔ (البقرہ) تم جو نیکی بھی کرو گے اللہ اس کو جانتا ہے۔

چنانچہ وہ ضعیفہ سوار ہو گئیں اور یہ آیت تلاوت کی۔ سُبْحَانَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ وَاِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ (زخرف)۔

ابن المبارک فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں بلند آواز سے اشعار پڑھ کر اونٹ کو دوڑانے لگا تو اس ضعیفہ نے مجھ کو تنبیہ فرمائی فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ۔ (مزمل) جہاں تک ہو سکے قرآن پڑھو۔

آخر ہم چلتے چلتے قافلے سے جا ملے میں نے پوچھا آپ کے رشتہ دار کون کون ہیں؟

ضعیفہ۔ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ (کہف) اس سے معلوم ہوا کہ قافلے میں ان کا سامان اور ان کے بیٹے ہیں۔

ابن المبارک۔ آپ کے بیٹے کیا کام کرتے ہیں؟

ضعیفہ۔ وَعَلٰمٰتٍ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ (نحل) مطلب یہ کہ قافلہ والوں کے رہبر ہیں۔

ابن المبارک۔ ان کے نام بتائیے۔

ضعیفہ۔ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا۔ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا۔ يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ۔

حضرت ابن المبارکؒ سمجھ گئے کہ ان کے بیٹے ابراہیم، موسیٰ اور یحییٰ نامی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے قافلہ میں ان لوگوں کے نام لے کر پکارا اور وہ اپنی ماں کے گرد جمع ہو گئے۔ ماں نے بیٹوں کو خطاب کر کے کہا۔

فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ۔ (کہف)

تم اپنے میں سے کسی کو یہ سکہ دیکر شہر کی طرف بھیجو کہ وہ دیکھے کس کے ہاں اچھا کھانا ہے۔ اور اس سے کھانا لے آئے۔

اس حکم کے مطابق ایک لڑکا بستی میں گیا اور کھانا لے آیا۔ ابن المبارکؒ کہتے ہیں کہ میں نے ان سے کہا کہ کھانا کھانے سے پہلے مجھ کو ان اعجوبہ روزگار ضعیفہ کے حالات بتاؤ۔ انہوں نے کہا کہ یہ ہماری ماں ہیں۔ چالیس برس ہو چکے ہیں کہ انہوں نے بجز آیات کلام اللہ کے اور کوئی لفظ زبان سے نہیں نکالا ہے۔ جو کچھ گفتگو کرتی ہیں۔ قرآن ہی سے کرتی ہیں۔ یہ سن کر میں ششدر رہ گیا۔ اور یہ کہتا ہوا انکے خیموں سے واپس ہوا کہ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔

آج دنیا میں سینکڑوں ہزاروں علما اور حفاظ قرآن موجود ہیں۔ مگر کلام اللہ پر اتنے عبور کی مثال شاید ہی کہیں مل سکے۔

باغ جنت

(از مولانا عبداللہ العمادی)

—— (۱) ——

إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ یہ جنت تو وہ ہے جو مومنین کو بعد موت نصیب ہوگی اس پر ہم سب کا ایمان ہے لیکن اس کے علاوہ ایک اور جنت بھی ہے جس کا اسی دنیا سے تعلق ہے۔

سورۂ بقر کے دوسرے رکوع آیت نمبر ۲۵ میں نیک کردار ایمانداروں کو بشارت دی گئی ہے کہ ان کے لئے باغ ہوں گے۔ جاری نہریں ہوں گی۔ پاکیزہ بیویاں ہوں گی جب کوئی میوہ ملے گا تو عام روایت کے مطابق اس کو نیا دیکھکر طبیعت رک نہ جائے گی کہ نہ معلوم کیسا ہو کیسا نہ ہو۔ جتنے میوے ہوں گے۔ صورت میں سب یکساں ہوں گے اور مزے میں ہر ایک کے ذائقے جدا جدا نکلیں گے کہ یکساں ہونے سے طبیعت مانوس رہے گی اور ذائقہ میں تفاوت سے سب میں نیا مزہ آئے گا۔ یہ حالت پائدار ہوگی اور یہ نیک بندے اسی حالت میں ہمیشہ رہیں گے۔ مفسرین نے اس کی تشریح یوں کی ہے۔

الف۔ باغ سے مراد باغ بہشت ہے [۱]

ب۔ بہشت کے جتنے درخت ہوں گے جڑ سے شاخ تک برابر و باترتیب یکساں ہوں گے [۲]

---

[۱] روی ابن جریر قال حدثنا کریب عن الاشجعی عن سفیان عن عمرو بن مرۃ عن مسروق قال نخل الجنۃ نضید من اصلھا الی فرعھا وثمرھا امثال القلال کلما نزعت ثمرۃ عادت مکانھا اخری وماءھا یجری فی غیر اخدود۔ [۲] عن مجاھد قال حدثنا یزید قال خبرنا مسعر بن کدام عن عمرو بن مرۃ عن ابی عبیدۃ لنحوہ۔

ج۔ درختوں کے میوے مٹکے برابر ہوں گے [۱]

د۔ جہاں کوئی میوہ توڑا گیا کہ فوراً دوسرا میوہ وہاں لگ جائے گا۔ [۲]

ھ۔ باغ بہشت میں بغیر نالیوں کے پانی رواں رہے گا۔ [۳]

و۔ باغ بہشت کے خوشے بارہ بارہ گز کے ہوں گے [۴]

ز۔ درخت ایسے ہوں گے کہ ان کے سایہ میں مسافر سو برس تک چلا جائے اور پھر بھی سایہ طے نہ ہو۔ [۵]

ح۔ باغ بہشت میں جب کوئی میوہ لے کر کھانا چاہے گا تو وہ میوہ اس کے منہ تک نہ پہونچنے پائے گا۔ کہ خدا تعالیٰ ویسا ہی دوسرا میوہ بجائے اس کے لادے گا [۶]

ان کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سن لینے کی بات ہے:۔

لا یشبہ شیء مما فی الجنۃ ما فی الدنیا إلا الاسماء [۷] بہشت کی چیزوں میں کوئی چیز دنیا کی چیزوں سے اگر مشابہ ہوگی تو برائے نام مشابہ ہوگی

دوسری روایت میں ہے:۔

لیس فی الدنیا مما فی الجنۃ إلا الاسماء [۸] بہشت کی چیزوں میں سے دنیا میں کچھ نہیں ہے اگر ہے تو نام ہی نام ہے

ایک اور حدیث میں ہے:۔

لیس فی الدنیا من الجنۃ شیء إلا الاسماء نام کے سوا دنیا میں بہشت کی اور کوئی چیز نہیں ہے [۹]

---

[۱] عن محمد بن بشار قال حدثنا ابن مهدی قال حدثنا سفیان قال سمعت عمرو بن مرۃ یحدث عن ابی عبیدۃ فذکر مثلہ۔
[۲] عن مسروق و ابی عبیدۃ۔ [۳] عن مسروق و ابی عبیدۃ۔ [۴] اورد النیسابوری والخطیب الشربینی وغیرهما حدیثاً فی صفۃ ثمار الجنۃ وعناقیدها فقالا "العنقود اثنا عشر ذراعاً" [۵] قال النیسابوری۔ "یرون الشجرۃ یسیر الراکب فی ظلها مائۃ عام لا یقطعہ" [۶] زعم الخطیب الشربینی فی تفسیرہ المسمی بالسراج المنیر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال" والذی نفس محمد بیدہ ان الرجل من اهل الجنۃ یتناول الثمرۃ لیاکلها فما هی واصلۃ الی فیہ یبدل اللہ مکانها مثلها۔
[۷] ابن جریر عن محمد بن بشار قال حدثنا مؤمل قال جمیعاً حدثنا سفیان عن الاعمش عن ابن عباس الخ
[۸] ابن بشار فی حدیثہ عن مؤمل [۹] ابن جریر عن عباس بن محمد قال حدثنا محمد بن عبید عن الاعمش۔ عن ابی ظبیان عن ابن عباس الخ۔

بہر حال اصل آیت یوں ہے :-

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۔ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۔ (سورہ بقرہ آیت ۲۱، رکوع ۲)

اے پیغمبر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل (بھی) کئے ان کو خوشخبری سنا دو کہ ان کے لئے (بہشت) کے باغ ہیں جن کے تلے نہریں (پڑی) بہ رہی ہوں گی۔ جب ان کو ان میں کا کوئی میوہ کھانے کو دیا جائیگا تو کہیں گے۔ تو ہم کو پہلے بھی (کھانے کے لئے) مل چکا ہے اور (یہ اس لئے کہیں گے کہ) ان کو ایک ہی صورت (و شکل) کے میوے ملا کریں گے اور وہاں ان کے لئے بیویاں ہوں گی پاک (وصاف) اور وہ ان (باغوں) میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے[1]

(۲)

اس آیت میں کئی باتیں قابل تنقیح ہیں۔

الف۔ جنت (باغ) سے کیا مراد ہے؟

ب۔ هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ (یہ تو وہی) جو ہمیں پہلے نصیب ہو چکا ہے) سے کیا مراد ہے؟

ج۔ اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا (میوہ ان کو یکساں دیا جائیگا) سے کیا مراد ہے؟

د۔ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (وہ ان باغوں میں ہمیشہ رہیں گے) سے کیا مراد ہے؟

الف۔ تمام مفسرین نے جنت سے بہشت مراد لی ہے حتیٰ کہ سید احمد خاں نے بھی اسی کو صحیح ان کر آیت کے مفہوم کو واقعات بعد الموت سے وابستہ کیا ہے۔ یعنے نیک کردار ایمان والوں کو یہ نعمتیں

---

[1] یہ ترجمہ مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم سے ماخوذ ہے۔ مولوی صاحب نے جنت کا ترجمہ باغ کیا ہے مگر اس کے ساتھ بہشت کا لفظ بھی اضافہ کر دیا ہے آیت میں میوہ کھانے نہ کھانے کا کچھ تذکرہ نہیں ہے اور اس کے لئے کوئی لفظ وارد نہیں ہے۔ لیکن مطلب سمجھانے کے لئے جناب موصوف نے اس کو بڑھا دیا ہے۔ خلدون کا ترجمہ محض لطف کلام کے لئے "ہمیشہ ہمیشہ" کیا ہے حالانکہ یہ ترجمہ اگر ہو سکتا ہے تو خلدون ابدًا کا ہو سکتا ہے۔

جیتے جی نہیں گی مرنے کے بعد ملیں گی خاتمۂ آیت (هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ) سے یہ خیال اور بھی پختہ ہوگیا کیوں کہ بظاہر خلود کے معنی ہمیشگی کے ہیں اور دنیا کی زندگی میں کوئی ایسی نعمت موجود نہیں ہے اور نہ ہوسکتی ہے جس کے لئے ہمیشگی و لبقائے دوام ممکن ہو۔ مطلب یہ ہوا کہ خدا کے فضل سے جن کو بہشت ملے گی وہ ہمیشہ پرلطف زندگی لبسر کریں گے اور جو نعمتیں انہیں ملیں گی وہ سب دوامی ہوں گی البتہ سید صاحب نے اتنی بات بڑھائی ہے کہ بہشت اور اس کی نعمتوں کی حقیقت و ماہیت کچھ اور ہے۔ ان کی رائے بہشت اور اس کی نعمتوں کے بیان کرنے سے "صرف اعلیٰ درجہ کی راحت کا بقدر فہم انسانی خیال پیدا کرنا مقصود تھا۔ نہ واقعی ان دونوں چیزوں کا دوزخ و بہشت میں موجود ہونا"۔ اس لئے کہ "یہ سمجھنا کہ جنت مثل ایک باغ کے پیدا کی ہوئی ہے۔ اس میں سنگ مرمر کے اور موتی کے جڑاؤ محل ہیں۔ باغ میں سرسبز شاداب درخت ہیں۔ دودھ اور شراب و شہد کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ ہر قسم کا میوہ کھانے کو موجود ہے ساقی اور ساقنین نہایت خوبصورت چاندی کے کنگن پہنے ہوئے جو ہمارے ہاں کی گھوسنیں پہنتی ہیں شراب پلا رہی ہیں۔ ایک جنتی ایک حور کے گلے میں ہات ڈالے پڑا ہے۔ ایک نے ران پر سر دھرا ہے۔ ایک چھاتی سے لپٹا رہا ہے ایک نے لب جان بخش کا بوسہ لیا ہے۔ کوئی کسی کونے میں کچھ کر رہا ہے کوئی کسی کونے میں۔ کچھ ایسا بیہودہ پن ہے جس پر تعجب ہوتا ہے۔ اگر بہشت یہی ہو تو بے مبالغہ ہمارے خرابات اس سے ہزار درجہ بہتر ہیں"[۵]۔

ب۔ هٰذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ کی تاویل میں سب نے یہی لکھا ہے۔ کہ جب کسی کو نیا پھل کھانے کو دیا جائے جو اس نے کبھی نہ دیکھا ہو تو اس کے کھانے سے رکتا ہے کہ نہیں معلوم کیا ہے۔ جنتیوں کو جو ایک ہی صورت کے پھل ملیں گے تو وہ ان کے کھانے میں تامل نہیں کر

---

۵ تفسیر القرآن (طبع لاہور) جلد ۱ صفحہ ۴۴۔ ۵۲ ایضاً جلد ۱ صفحہ ۳۲۔

سکتے۔ جانتے ہیں کہ ایسا تو ہم پہلے بھی کھا چکے ہیں۔ ہاں شاید صورت کے دھوکہ میں آکر چنداں لالچ بھی نہ
آئے کہ چلوا چو ایکبار خور دندلیں۔ تو چکھنے کے بعد دوسرا ذائقہ ملے گا۔ اور ان کے دل زیادہ خوش
ہوں گے کہ خلاف توقع مزہ ملا" یہ تو جسمانیت اور مادیت کی باتیں ہوئیں۔ لیکن امام رازی کی رائے
میں ان تمام باتوں کا تعلق روحانیت سے ہے جسمانیت کو اس میں کچھ دخل نہیں ہے۔ فرماتے ہیں۔

فی الآیة قول ثالث علی لسان اهل
المعرفة وهو ان کمال السعادة لیس
الا فی المعرفة ذات الله تعالیٰ و
معرفة صفاته ومعرفة افعاله من
المَلٰئکة الکروبیة والملائکة الروحانیه
وطبقات الارواح وعالم السمٰوٰت
وبالجملة یجب ان یصیر روح الانسان
کالمرآة المحاذیة العالم القدس ثم
ان هٰذه المعارف تحصل فی الدنیا
ولا یحصل بها کمال الالتذاذ والابتهاج
لما ان العلائق البدنیة تعوق عن
ظهور تلك السعادة فاذا زال هذا
العائق حصلت السعادة العظیمة و
الغیطة الکبریٰ۔ فالحاصل ان کل
سعادة روحانیة یجدها الانسان

آیت میں اہل معرفت کی زبان سے ایک تیسری بات بھی
مذکور ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کمال نعمت اور سعادت
صرف خدا کی ذات وصفات وافعال کے پہچاننے
میں ہے کہ کرّوبیان عالم بالا و فرشتگان روحانی و
طبقات ارواح و عالم سمٰوات کے متعلق انسان کو
شناسائی حاصل ہو۔ اور لازم ہے کہ اس کی روح ایک
ایسے آئینہ کے مماثل ہو جائے۔ جو عالم قدس کے
ٹھیک سامنے ہو۔ یہ معرفت دنیا میں بھی حاصل ہوتی
ہے لیکن اس میں پوری لذت اور کافی خوشی نہیں
ہوتی اس لئے کہ جسمانی تعلقات اس لذت و
سعادت کے ظاہر ہونے میں سنگ راہ بن جاتے
ہیں اور اگر یہ روک اُٹھ جائے تو اصلی وحقیقی لُطف
حاصل ہو۔ ماحصل یہ ہے کہ جو روحانی نعمتیں اور
لذتیں انسان کو مرنے کے بعد حاصل ہوں گی تو وہ
کہے گا کہ یہ وہی نعمتیں ہیں جو دنیا میں بھی حاصل

بعد الموت فانه یقول هٰذا هی التی کانت حاصلة فی الدنیا الا انها فی الدنیا ما افادت اللذة و البهجة والسرور وفی الاخرة افادت هذه الاشیاء لزوال العایق ۔

تھیں۔ مگر دنیا میں یہ بات نہ تھی کہ وجہ سے مزہ و دلچسپی وخوشی ہوتی ہو۔ آخرت میں یہ سب باتیں حاصل ہوگئیں اس لئے کہ جو روک تھی وہ مٹ گئی[1]

ج۔ واُتوا به مُتَشَابِهًا کے معنی تو یہی لئے گئے ہیں۔ کہ اہل جنت کو جو میوے ملیں گے وہ سب کے سب شکل وصورت میں یکساں ہوں گے اور دنیا کے میووں سے ان کی شکلیں ملتی جلتی ہوں گی۔ لیکن حسن بن الحسن البصری وقتادہ وابن جریج سے متعدد حدیثیں اس مفہوم کی بھی روایت کی گئی ہیں کہ بہشت کے میوؤں کا ہر ایک حصہ اور ہر ایک جزو دوسرے جز کے متشابہ (ملتا جلتا) ہوگا۔ یعنے جنت کے میوے چھلکے سے لے کر مغز تک بے داغ و بے عیب ہوں گے دنیاوی میوں کی سی کیفیت نہ ہوگی کہ میوے کا کچھ حصہ تو اچھا ہوتا ہے اور کچھ ناقص رہتا ہے[2]۔ قاضی بیضاوی نے اس جسمانی کیفیت کو بھی روحانیت پر محمول کیا ہے لکھتے ہیں:۔

ان للآیة الکریمة محملاً آخر وهو ان مستلذات اهل الجنة فی مقابلة ما رُزِقُوا فی الدنیا من المعارف والطاعات متفاوتةٌ فی اللذة بحسب تفاوتها فیحتمل ان یکون المراد من هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا انه ثوابه ومن تشابهما تماثلهما فی الشرف والمزیة وعلو الطبقة فیکون

آیت کریمہ کا ایک اور مطلب بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ معرفت وعبادت کے ضمن میں جو مزے دنیا میں حاصل تھے ان کے مقابلہ میں بہشت کے مزوں اور لذتوں میں فرق ہوگا ہو سکتا ہے کہ آیۃ "یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے نصیب ہو چکا ہے" سے مراد دنیاوی عبادت ومعرفت کا ثواب ہو یعنی جو لذت دنیا میں خدا کی عبادت ومعرفت میں ملتی تھی

[1] تفسیر کبیر (طبع خیریہ مصر ۱۳۰۸ھ) جلد ۱ صفحہ ۲۴۴ [2] تفسیر ابن جریر (طبع میمنیہ مصر) جلد ۱ صفحہ ۱۳۲، ۱۳۵

ھذا فی الوعد نظیر قولہ ذوقوا ما کنتم تعملون۔ فی الوعید لہ

بہشت کی لذت اس سے بڑھ کر ہوگی، اور ان کو میوہ یکساں دیا جائے گا، میں یکساں ہونا مقصود ہو۔ اس صورت میں یہ وعدہ اس وعید کی نظیر ہوگا جس میں دھمکی دی گئی ہے کہ اب اپنے کئے کو چکھو" [۱]

اور خطیب شربینی بھی اس قول میں قاضی بیضاوی کے ہم زبان ہیں۔ [۲]

د۔ هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ کا مطلب بالاتفاق یہی بیان کیا گیا ہے کہ اہل بہشت کی ہمیشہ انہیں نعمتوں میں بسر ہوگی اور اس حالت میں کوئی تغیر و تبدل نہ ہونے پائے گا۔

(۳)

اس باب میں تحقیقات کا دائرہ صرف پہلی اور آخری تنقیح تک وسیع ہے جس کے ضمن میں آیت کا مفہوم و مدعا بھی واضح ہو جائے گا۔ پہلی تنقیح کا انحصار لفظ جنت کی تشریح پر ہے۔ اور دوسری تنقیح میں ھم فیھا خالدون پر بحث ہوگی۔

لغت میں جنت کے معنے اس باغ کے ہیں۔ جس کے درخت گھنیرے ہوں شاخ در شاخ و پیچ در پیچ ہوں اور آپس میں لپٹے نظر آئیں۔ اصطلاح میں جنّت کو صرف باغ آخرت سے مخصوص سمجھ لیا گیا ہے اور اصل میں حقیقی جنت وہی ہے بھی لیکن کلام اللہ نے آخرت کے باغوں کو بھی جنت کہا ہے اور دنیاوی باغوں کے لئے بھی جنت ہی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ سورۂ انعام میں ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ	اور وہی (قادر مطلق) ہے جس نے باغ پیدا کئے
وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ	(بعض تو ٹٹیوں پر) چڑھائے ہوئے (جیسے
مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ	انگور کی بیلیں) اور بعض نہیں چڑھائے ہوئے
مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ۔ كُلُوْا مِنْ	اور کھجور کے درخت اور کھیتی جن کے پھل مختلف

---

[۱] تفسیر البیضاوی (علی ہامش الخطیب الشربینی) جلد ۱ صفحہ ۹۲۔ [۲] تفسیر الخطیب الشربینی جلد ۱ صفحہ ۴۱۔

ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۭ وَلَا تُسْرِفُوْا ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ۔ (سورۃ الانعام ۔ رکوع ۱۷ ۔ آیت (۱۴۲)

(قسموں کے) ہوتے ہیں اور زیتون و انار کہ بعض تو صورت و شکل و مزہ میں) ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور بعض نہیں بھی ملتے جلتے (لوگو!) یہ سب چیزیں جب پھلیں تو ان کے پھل بے تأمل) کھاؤ اور (ان نعمتوں کے شکریہ میں) ان کے کاٹنے (اور توڑنے) کے دن حق اللہ (یعنی زکوٰۃ ان میں سے) دے دیا کرو۔ اور فضول خرچی نہ کرو کیونکہ فضول خرچی کرنے والوں کو خدا پسند نہیں کرتا۔

ایک اور مقام پر ہے :-

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۔ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (سورۃ ۶ ۔ آیت ۹۹ رکوع ۱۲)

اور وہی (قادر مطلق) ہے جس نے پانی اُتارا پھر اس کے (بعد ہم (ہی) نے اس سے ہر قسم (کی روئیدگی) کے کوئے نکالے پھر کویوں سے ہم نے ہری بھری ٹہنیاں نکال کھڑی کیں کہ اُن سے ہم گتھے ہوئے دانے نکالتے ہیں اور کھجور کے گابھے میں گچھے جو (مارے بوجھ کے جھکے پڑتے ہیں اور انگور کے باغ اور زیتون اور انار (ظاہر میں ایک دوسرے سے) ملتے جلتے اور (مزے کے اعتبار) سے ملتے جلتے نہیں (لوگو!) ان میں سے ہر ایک چیز جب پکتی ہے تو اس کا پھل اور پھل کا پکنا (قابل دید ہے۔ اور اس کو نظر غور سے) دیکھو بیشک جو لوگ (خدا پر) ایمان

رکھتے ہیں ان کے لئے ان (سب چیزوں) میں (قدرت خدا کی بہتری) نشانیاں (موجود) ہیں۔

سورہ یٰس میں ہے۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ۔ سورہ ۳۶۔ رکوع ۳ (آیت ۲۵ و ۲۶)	اور ان (لوگوں) کے (سمجھنے کے) لئے ہماری (قدرت) کی ایک نشانی مری ہوئی (یعنی پڑتی پڑی ہوئی) زمین ہے کہ ہم نے اس کو (پانی برسا کر) جلا اٹھایا اور اس سے اناج نکالا اسی میں سے یہ (لوگ بھی اپنی قسمت کا) کھاتے ہیں۔ اور زمین میں ہم نے کھجوروں کے اور انگوروں کے باغ لگائے اور اس میں (پانی

کے) چشمے بہائے تاکہ باغ کے پھلوں میں سے یہ (لوگ اپنی قسمت کا) کھائیں اور (معلوم ہے کہ) یہ (پھل) ان کے ہاتھوں کے بنائے ہوئے نہیں۔ تو کیا یہ (لوگ اس نعمت کا) شکر نہیں کرتے

سورہ قٓ میں ہے:۔

وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۔ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ۔ (سورہ ۵۰ رکوع آیت ۲)	اور ہم نے آسمان سے برکت کا پانی اُتارا (اپنے) بندوں کو روزی دینے کے لئے اس (پانی) کے ذریعہ سے باغ اُگائے اور کھیتی کا اناج اور لانبی لانبی کھجوریں جن کی گیلیں خوب گتھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور (نیز) ہم نے مینہ کے ذریعہ سے مری ہوئی (یعنی پڑتی پڑی ہوئی) بستی کو جلا اٹھایا۔ اسی طرح (لوگوں کو) نکلنا ہوگا

سورۂ نوح میں ہے۔

اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا۔ يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّ يُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا۔

(سورہ ۷۱ رکوع اول ۔ آیت ۵)

گناہوں کی اپنے پروردگار سے معافی مانگو کہ وہ بڑا بخشنے والا ہے۔ تم پر موسلا دھار مینہ برسائے گا۔ اور مال اور اولاد سے تمہاری مدد کریگا اور تمہارے لئے نہریں بنائے گا۔

سورۂ مؤمنون میں ہے :۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَاَسْقَيْنَاهُ فِى الْاَرْضِ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ۔ (سورہ ۲۳۔ رکوع اول آیت ۸ و ۹)

ہم نے ایک انداز کے ساتھ آسمان سے پانی برسایا پھر اس کو زمین میں (جمع کرکے) ٹھیرائے رکھا۔ اور ہم اس (پانی) کے (اڑا) لے جانے پر (بھی) قادر ہیں پھر اس (پانی) کے ذریعہ سے ہم نے تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کے باغ بنا کھڑے کئے تمہارے لئے ان میں سے بہت سے میوے پیدا ہوتے ہیں اور ان میں سے (بعض کو) تم کھاتے (بھی) ہو۔

سورۂ شعرا میں ہے :۔

فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ وَّ كُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ (سورہ ۔ ۲۶ رکوع ۴ آیہ (۱۱)

غرض ہم نے (فرعون اور اس کی قوم کو) باغوں اور چشموں سے اور خزانوں (سے) اور عزت کی جگہ سے) نکال باہر کیا۔

سورۂ دخان میں ہے :۔

كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا

یہ لوگ کتنے ہی باغ اور (کتنی ہی) نہریں اور کتنی ہی کھیتیاں (اور کتنے ہی) عمدہ عمدہ مکانات (اور کتنی ہی)

فِیْهَا فَاكِهِیْنَ۔ كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِیْنَ فَمَا بَكَتْ عَلَیْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِیْنَ۔ (سورہ ۴۴ رکوع اول آیت ۱۳ و ۱۴)

آرام (و آسائش کے) سامان چھوڑ مرے جن میں مزے اڑایا کرتے تھے (واقع میں) ایسا ہی رہوا) اور ہم نے دوسرے لوگوں کو اس (تمام ساز و سامان) کا وارث بنا دیا تو ان لوگوں پر آسمان و زمین (کسی) کو (بھی تو) رقت نہ آئی اور نہ ان کو توبہ و ندامت ہی) کی مہلت ملی۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ یَنْۢبُوْعًا اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِیْرًا (سورہ ۱۷، رکوع ۱۰۔ آیت ۹۲)

اور انہوں نے کہا کہ ہم تو اس وقت تک تم پر ایمان لانے والے نہیں کہ (یا تو ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ (بہا) نکالو یا کھجوروں اور انگوروں کا تمہارا کوئی باغ ہو اور اس کے بیچ بیچ میں تم (بہت سی نہریں جاری کر دکھاؤ)۔

سورۂ فرقان میں ہے:۔

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ یَاْكُلُ الطَّعَامَ وَیَمْشِیْ فِی الْاَسْوَاقِ لَوْلَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مَلَكٌ فَیَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِیْرًا۔ اَوْ یُلْقٰۤى اِلَیْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ یَّاْكُلُ مِنْهَا وَقَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا (سورہ ۲۵، رکوع اول آیت ۸)

اور انہوں نے (یعنی کافروں نے) کہا کہ یہ کیسا پیغمبر ہے کہ کھانا کھاتا اور بازاروں میں پھرتا ہے اس کے پاس کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیجا گیا کہ اس کے ساتھ ہو کر (وہ بھی لوگوں کو عذاب خدا سے) ڈراتا۔ یا اس پر کوئی خزانہ ڈالا ہوتا (یا زیادہ نہیں تو) اس کے پاس ایک باغ (ہی) ہوتا کہ اس سے کھاتا (پیتا) اور یہ ظالم (مسلمانوں سے) کہتے ہیں کہ تم بس ایسے آدمی کے پیچھے ہو لئے جس پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔

سورہ کہف میں ہے :-

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ ..... كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ آتَتْ أُكُلَهَا ...... وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ لِنَفْسِهِ ..... وَلَوْلَا إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاءَ اللَّهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ ..... فَعَسَىٰ رَبِّي أَنْ يُؤْتِيَنِ خَيْرًا مِنْ جَنَّتِكَ

.... (سورہ ۱۸ رکوع ۵ آیت ۳۲، ۳۳، ۳۵، ۳۹، ۴۰)

اور ان لوگوں سے ان دو شخصوں کی مثال بیان کرو جن میں سے ایک کو ہم نے دو باغ دے رکھے تھے .... دونوں باغ اپنے اپنے پھل لائے .... وہ باغ میں ایسی حالت میں داخل ہوا کہ اپنے نفس پر آپ ہی ظلم کر رہا تھا..... ...اور جب تو اپنے باغ میں آیا تو تو نے (یوں) کیوں نہ کہا کہ یہ (سب) تو خدا کے چاہے سے ہوا ہے (ورنہ مجھ میں تو بے مدد خدا کچھ بھی طاقت نہیں ...... تو عجب نہیں میرا پروردگار تیرے باغ سے (بھی) بہتر باغ مجھکو عطا فرمائے۔

سورۂ سبا میں ہے :-

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ جَنَّتَانِ عَنْ يَمِينٍ وَشِمَالٍ ...... وَبَدَّلْنَاهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ أُكُلٍ خَمْطٍ وَأَثْلٍ وَشَيْءٍ مِنْ سِدْرٍ قَلِيلٍ - (سورۂ ۳۴ - رکوع ۲ - آیت ۱۵ و ۱۶)

قوم سبا کے لئے ان کے (اپنے ہی) گھروں میں (قدرت خدا کی، البتہ ایک (بڑی) نشانی (موجود تھی - داہنے ہات اور بائیں ہات دو دو باغ تھے .... اور ہم نے ان کے دو باغوں کے بدلے میں دو باغ (تو) دیئے مگر ایسے کہ ان کے پھل بد مزہ تھے اور ان (کچھ) جھاؤ تھا اور قدر قلیل بیری۔

باغ بہشت کے حق ہونے میں کلام نہیں جس کا وعدہ موت کے بعد ہے یہاں کہنے کی بات صرف اتنی ہی ہے کہ ان آیتوں میں جنت سے مراد باغ دنیا ہے - اور اگر اسی ضمن میں دو آیتیں

بھی شامل کرلی جائیں۔ جن میں حضرت آدم و حوا (علیہما السلام) کے جنت میں داخل ہونے اور نکلنے کا تذکرہ ہے تو نظیروں کا شمار نہایت وسیع ہو جاتا ہے اس لئے کہ بعض نامور محققین نے حضرت آدم کی جنت کو بھی باغ دنیا قرار دیا ہے۔ اس معنے کے تسلیم کرنے پر خدا کے مطیع بندوں (مسلمانوں) کو آیت مذکورۂ بالا میں جس جنت کی بشارت دی گئی ہے وہ ایماندار و نیک کردار ہونے کی شرط پر دنیا میں بھی انہیں مل سکتی ہے اور اگر چاہیں تو پکے مسلمان بن کر اسی دنیا میں اپنے آپ کو بہشت کا مستحق بنا سکتے ہیں جس کے بعد بشرط ایمان و عمل صالح اُس بہشت موعود (جنت آخرت) کے ملنے میں کیا کلام ہے ؎

من کہ در کعبۂ حق منزل و ماوی دارم		گر دہر جائے بفردوس برینم چہ شود

لیکن جہاں "آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا" کی دشواریاں درپیش ہوں وہاں کیا یہ ممکن ہے کہ يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللهِ وَرَسُولِهِ - (اے ایمان والو اللہ اور رسول پر ایمان لاؤ) کا خطاب دائرۂ عمل میں آجائے گا اور مسلمان بھی کسی دن مسلمان بن جائیں گے ؎

خواہم از زلف بتاں نافہ کشائی کردن		فکر دور است ہمانا کہ خطائے بینم

———— (۴) ————

دوسری تنقیح (هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ۔ یعنے اہل جنت ہمیشہ اُسی میں رہیں گے) میں خلود (ہمیشگی) پر بڑا زور دیا گیا ہے کہ آیت میں جنت سے اگر جنت دنیا مراد ہوتی تو اس میں ہمیشگی کی شرط کیوں کی جاتی۔ دنیا تو خود ناپائیدار ہے پھر اس کی نعمتیں کیونکر پائدار ہو سکتی ہیں لیکن اصل میں یہ ایک طرح کی غلط فہمی ہے خلود کے معنی بقائے دوام کے نہیں ہیں۔ بقائے طویل کے ہیں[۵]۔ امام رازی فرماتے ہیں۔

قال اصحابنا الخلد هو الثبات الطويل		ہمارے علماء کہتے ہیں کہ خلود (ہمیشگی) کے معنے دیر

---

[۵] سراج المنیر (طبع خیریۂ مصر) صفحہ ۴۳ - جلد ۱

سواءً دام اولم یدم واحتجوا فیه بالآیۃ والعرف اَمَّا الآیۃ فقوله تعالیٰ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ولو کان التابید داخلاً فی مفهوم الخلد لکان ذالک تکرارا۔ واما العرف فیقال حبس فلان فلانا حبسا مخلدا اولانه یکتب فی صکوک الاوقاف وقف فلان وقفا مخلدا[1]

تک پائیدار رہنا ہے چاہے ہمیشہ ہمیشہ رہے یا نہ رہے اس باب میں قرآن و محاورۂ عرب کی دلیل لاتے ہیں قرآن کی دلیل تو یہ ہے کہ بہشت میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ لقائے دوام کے معنی اگر ہمیشگی کے مفہوم ہوتے تو دوبارہ ہمیشہ ہمیشہ کہنا کیا ضرور تھا۔ محاورہ میں کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے فلاں کو ہمیشہ کے لئے بند رکھا ہے اور وقف ناموں میں لکھتے ہیں، فلاں شخص نے ہمیشہ کے لئے جائداد وقف کی ہے حالانکہ دنیا اور اس کی کوئی چیز بھی ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے[1]

قاضی بیضاوی لکھتے ہیں:۔

الخلد والخلود فی الاصل الثبات المدید دام اولم یدم ولذالک قیل للاثافی والاحجار خوالد وللجزء الذی یبقی من الانسان علی حاله مادام حیا خلد ..... بخلاف مالو وضع للاعم منه فاستعمل فیه بذالک الاعتبار کاطلاق الجسم علی الانسان مثل قوله تعالیٰ: وَمَا جَعَلْنَا لِرَجُلٍ مِنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ"[2]

خلد اور خلود اصل میں دیر تک ثابت رہنے کو کہتے ہیں چاہے یہ کیفیت دوامی ہو یا نہو۔ اسی لئے چولہے اور پتھروں کو بھی خوالد (ہمیشہ رہنے والے) کہتے ہیں۔ اور انسان کے جسم کا وہ جز جو بجائے خود باقی رہتا ہے اسے بھی خلد کہا جاتا ہے ..... لیکن جہاں کہیں عام ترین معنے کے لئے یہ لفظ رکھا گیا ہو وہاں اسی اعتبار سے استعمال بھی ہوتا ہے۔ مثلاً یہ آیت ہم نے تجھ سے پہلے کسی شخص کے لئے ہمیشگی نہیں بنائی ہے[2]

---

[1] تفسیر کبیر جلد ۱ صفحہ ۲۳۵۔

[2] انوار التنزیل و اسرار التاویل للقاضی البیضاوی علی ہامش السراج المنیر جلد ۱ صفحہ ۹۳۔

نظام نیشاپوری نے لفظ خلد کے معنے بقائے دوام کے ہونے کے متعلق یہ بھی تشریح کی ہے کہ صرف معتزلہ نے خلد خلود کے معنے بقائے دوام کے لئے ہیں ورنہ اشاعرہ اہل سنت کا اتفاق ہے کہ اس کے معنے دیر تک ثابت رہنے کے ہیں[1] ہیں ہم اس ضمن میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ خلود کے معنی بقائے دوام نہ ہی مگر دراصل جنت میں بقائے دوام ہی ہوگا اس تاویل کی ضرورت یہ تھی کہ جس کو بہشت نصیب ہوگی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نصیب ہوگی لیکن سوال یہ ہے کہ جب قرآن نے جنت کو باغ دنیا کیلئے بھی استعمال کیا ہے۔ اور خلود کے معنی بھی بقائے دوام کے نہیں ہیں تو پھر ان تاویلات کی کیا حاجت ہے؟ اور کیا غرض ہے کہ اس دنیاوی جنت کی نعمتوں کو بھی روحانی مانا جائے جسمانی نہ مانا جائے؟

اس بیان توضیحی کا نتیجہ یہ ہے:۔

(الف) آیت میں مہذب و صالح مسلمانوں کو بشارت دی گئی ہے اور اس بشارت سے پہلے شرط کر دی گئی ہے کہ ان میں اسلامی تقویٰ و تہذیب (کہ حقیقت میں یہی ایک تہذیب ہی اور شائستگی و صلاحیت ہونا ضروری ہے۔

(ب) مدعای بشارت یہ ہے کہ جو مسلمان صالح و نیک کردار اور شریفانہ اخلاق سے آراستہ ہوں گے خدا ان کو جنت اور اس کی نعمتیں عطا کرے گا۔

ج یہ دور ترقی بہت دیر تک قائم رہے گا۔ اور اسی لحاظ سے اس کو خالد کہا جائے گا۔

(۵)

یہ تمہید تھی۔ ناظرین اب اس کے بعد منشار آیت ملاحظہ فرمائیں۔

آیت میں اسلامی ترقی کے وعدے کو ایمان و عمل صالح سے مشروط کیا گیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ایمان کے معنے کیا ہیں۔

ایمان یہ نہیں ہے کہ زبان تو لا الٰہ الا اللہ کہہ رہی ہو۔ اور دل میں ؎

صنمے در دل ما بانت راہ نحن لا نعبد الا ایاہ

سے ناپاک جذبات بھرے ہوں کہنے کو اپنے تئیں مسلمان کہا جائے مگر اسلام کے احکام سے مطلقاً کچھ علاقہ نہ ہو۔ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ

---

[1] غرائب القرآن در غائب الفرقان للنظام النیساپوری (علی ہامش جامع البیان لابن جریر الطبری) جلد ا صفحہ ۱۹۴

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جگہ رسم ورواج کو دیجائے اور مذہبی وقومی پیشوائی کی منزل جو پہلے قرآن کریم کو اور صرف قرآن کریم کو حاصل تھی اب علماء کے قیاسات ومفروضات کو عطا کی جائے۔ ایمان کا مفہوم یہ ہے کہ انسان خدا کی خدائی کا معتقد ہو۔ اور علم النفس میں یہ امر ثابت ہو چکا ہے کہ اعتقاد وہی ہے جس کے آثار انسان کے کردار وگفتار سے ظاہر ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ ایمان ہرگز ایمان نہیں ہے جس میں بندے کے افعال خدا کے احکام سے بے پرواہ ہیں۔ قرآن میں جہاں کہیں بھی اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (وہ لوگ جو ایمان لائے) کے الفاظ وارد ہیں ساتھ کے ساتھ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (اور انہوں نے نیک کام کئے) بھی موجود ہے[1]۔ اور جن آیات میں اٰمَنَ (ایمان لایا) کا تذکرہ ہے اسی کے بعد وَعَمِلَ صَالِحًا (اور نیک کام کیا) کی شرط بھی لگا دی ہے[2] جس کا مطلب یہ ہے کہ ظاہری ایمان کافی نہیں ہے اسی کے ساتھ حسن عمل بھی لازم ہے۔ سورۂ نور میں ہے

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ۔ قُلْ لَّا تُقْسِمُوْا طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔ (سورہ ۲۴ - رکوع ۷، آیت ۵۳)

اور انہوں نے اللہ کی بڑی پکی پکی قسمیں کھائیں کہ اگر حکم ہو تو ہم بلا عذر گھر بار سب چھوڑ کر باہر نکل کھڑے ہوں (ان سے) کہو کہ قسمیں نہ کھاؤ۔ پسندیدہ فرمانبرداری چاہیے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی سب خبر ہے (یعنی جو ایمان کا مدعی ہو اس کو زبانی ڈھونگ نہ کرنے چاہئیں بلکہ عمل سے اپنی ایمانداری کا ثبوت دینا چاہیے)

سورہ حجرات میں ہے:۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ

ایماندار تو صرف وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر (کسی طرح کا) شک وشبہ کیا (نہ) اور اللہ کی راہ میں اپنی جان ومال سے کوشش کی (حقیقت میں سچے یہی

[1] دیکھو سورہ رعد، شوریٰ، مائدہ، فتح، ابراہیم، حج، یونس، بقرہ، طلاق، آل عمران، نساء، شعراء، نور، سجدہ، جاثیہ۔

[2] سورہ بقرہ، مائدہ، کہف، مریم، طٰہٰ، قصص، سبا۔

هُمُ الصَّادِقُوْنَ -سورہ ۴۹ -رکوع ۲ آیت ۱۵) ہیں (یعنی جن لوگوں میں یہ دونوں شرطیں موجود ہوں ان کا ایمان تو سچا ہے اور جو ایسے نہ ہوں وہ جھوٹے بے ایمان ہیں)۔

یہ معیار ایمان اگر صحیح ہے - اور ضرور صحیح ہے - تو ہم میں کتنے ہیں جو ایماندار کہے جا سکتے ہیں - اگر ہم اپنے ایمان کے دعوے میں سچے ہوتے تو کیا یہ نہ دیکھتے کہ مسلمان کس روز میں گرفتار ہیں اسلامی دنیا پر نامسلمان کیوں کر غالب آتے جاتے ہیں - اور ہر ایک بر اعظم میں مسلمانوں کی کیا گت بن رہی ہے جہالت کی ہم کو شکایت ہے لیکن اس عمارت کی بنیاد خود ہمارے ہاتھوں سے پڑی ہے - قومی تنزل کا گلہ ہے مگر اس طوق کو ہمارے اعمال ہی نے گلوگیر بنایا ہے - ترقی کی خواہش ہے لیکن ایمان کا دل میں نشان تک نہیں - عزت و سربلندی کی تمنا ہے مگر عمل صالح سے بے پروا ہیں - گھر کی بضاعت ہے تو سود خواروں کے لئے وقف ہے - ذاتی آمدنی ہے تو بے اصول کاموں میں صرف ہو رہی ہے - وقت ہے تو رائیگاں جا رہا ہے نہ دماغ کی کسی طرح کی تربیت کی جاتی ہے - نہ دماغی و ذہنی قوتوں کے نشو و نما کے لئے تعلیم دی جاتی ہے - نہ قوم کی فلاح مطلوب ہے - نہ اخلاق درست ہیں - نہ درست کرنے کی فکر ہے - اور پھر ان بے اصولیوں کے ہوتے ہوئے ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور اسلام کے جو لوازم ہیں (یعنی ترقی و سربلندی) اُن کے خواہاں رہتے ہیں !!!

یہ سادہ دل بشارت قرآن سے شاد ہے مومن نہیں ہو انتم الاعلون یاد ہے

(۶)

بے شبہ قرآن کریم کا وعدہ ہے اور نہایت سچا وعدہ ہے کہ :-

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا (سورہ طٰہٰ - رکوع ۶ آیت ۱۱۱)

اور جو نیک عمل کرے گا اور وہ ایمان بھی رکھتا ہوگا تو اس کو نہ کسی طرح کے ظلم و ستم کا خوف ہوگا اور نہ کسی طرح کی حق تلفی کا۔

لیکن اس وعدے کے وفا ہونے کے لئے جو شرط کی گئی ہے کیا ہم اس پر بھی متفق ہونا چاہتے ہیں اور دل

کو ایمان دماغ کو تہذیب نفس اور تمام اعضائے جوارح کو عمل صالح کا پابند بنانے پر آمادہ ہیں؟ ہمارے اخبار ہماری قومی حق تلفیوں کے شکوہ سنج رہتے ہیں مظالم کے داد خواہ ہوتے ہیں۔ قوم کی تباہی کا مرثیہ سناتے ہیں اور تلافی کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن کیا سوچنے کی بات نہیں ہے کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے ہماری بدبختیوں کا نتیجہ ہے۔ مسلمان ایماندار ہوں۔ نیک کردار ہوں۔ تو نہ ان پر ظلم ہو سکتا ہے اور نہ ان کی حق تلفی ممکن ہے۔ لیکن جب اس خصوصیت سے بیگانہ ہیں تو ظلم و ستم کا گلہ کیا اور حق تلفی کی شکایت کیوں؟ اے نور چشم من بجز از کشتہ ندروی ٭

(۷)

عمل صالح کا تعلق صرف ظواہر سے نہیں ہے عمل صالح اگر ہے تو اخلاق کو مہذب رکھنا اور اعمال کو ایسے معیار تقوی پر لانا ہے جس سے خود اس کو اور اس کی قوم کو فائدہ پہنچے اور وہ فائدہ بھی منشائے قرآن کے مطابق ہو۔ جو تباہی ہم کو محیط ہے وہ اسی معیار کو نظر انداز کرنے سے لاحق ہوئی ہے دنیا میں نظر کرو دنیاوی ممالک پر نگاہ دوڑاؤ جزائر یونان کو دیکھو۔ جزائر بحر روم کو دیکھو سسلی کو دیکھو۔ سارڈینیا کو دیکھو۔ ہسپانیہ کو دیکھو پرتگال کو دیکھو۔ جنوبی فرانس کو دیکھو۔ جنوبی ایطالیہ کو دیکھو۔ اور پھر بتاؤ کہ ان ممالک کے مسلمان کیا ہوئے اور کہاں گئے۔ الجزائر میں جاؤ جہاں آج کل فرانس کی حکومت ہے اور دیکھو کہ کیسی کیسی مسجدیں کلیسا کی شکل میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ بزرگوں کے مزاروں اور روضوں پر صلیبیں نصب ہیں اور مدرسوں اور خانقاہوں کے مشنری ہاؤس بنے ہوئے ہیں۔ خود اسی ہندوستان کو دیکھو اور بتاؤ کہ قطب مینار جس فاتحانہ عظمت و سربلندی کی داستان سنا رہا ہے تاج محل جس تمدن کا نوحہ خواں ہے تو قوۃ اسلام جس جلالت و جبروت کی عزادار ہے جونپور کا پل اور قلعہ اور مسجدیں جس فر و شکوہ کی سوگوار ہیں احمد آباد لاہور کی عبادت گاہیں جس دینداری کا ماتم کر رہی ہیں۔ وہ سب باتیں کیا ہوئیں اور کدھر گئیں ہندوستان اب بھی وہی ہے لیکن اب وہ جاہ و جلال کہاں ہے جو محمد بن قاسم کے ساتھ آیا تھا۔ وہ فلسفہ کہاں ہے جس کی ملا محمود جونپوری نے بنیاد ڈالی تھی۔ وہ فلسفہ کی درسگاہیں کیا ہوئیں جو بہار و جونپور میں قائم تھیں۔ کیا ان سب کے فنا ہونے کا باعث یہی نہیں تھا کہ بزرگوں نے عمل صالح کا جو میراث چھوڑا تھا وہ برباد گیا اور ہم اس سے بے خبر رہے ہم اپنے

اخلاق و عادات کو اگر مہذب بناتے اور مہذب رکھتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ دنیا ہماری غلام نہ ہوتی، اور زمانے پر ہمارا سکہ نہ بیٹھا رہتا۔ ہم ایک ریگستان (عرب) سے نکل کر اپنی اخلاقی طاقتوں کی بدولت ساری دنیا پر چھا گئے تھے اب تقویٰ نہ ہونے کی وجہ سے ساری دنیا میں پھیلے بھی ہیں اور پھر بھی مٹی خراب ہو رہی ہے عبرت پذیر دل کے لئے کیا یہ خون ہو جانے کی باتیں نہیں ہیں اور کیا اس انحطاط کی مصیبتوں میں بھی ہم کو خدا یاد نہ آئے گا۔ اور ہم اپنے ایمان و اخلاق کو محکم نہ بنائیں گے بےشبہ ہم اب بھی ترقی کر سکتے ہیں۔ خدا نے جو وعدے کئے تھے وہ ابتدائی صدیوں کے لئے مخصوص نہ تھے وہ پاک و مقدس وعدے ہمیشہ کے لئے ہیں اور اب بھی ان کا وہی اثر ظاہر ہو سکتا ہے۔ دنیا ہمارے لئے ہے اور دنیا کی تمام علمی و اخلاقی و مادی و روحانی ترقیاں بھی ہمارے ہی لئے ہیں۔ لیکن ان ترقیات کے لئے شرط کیا ہے؟ شرط محض اتنی ہے کہ ہمارے اخلاق و اعمال میں شائستگی و تہذیب و صلاحیت ہونی چاہیے۔ یہی شرط اگلی قوموں سے بھی ہوئی تھی اور اسی کو خدا نے یاد بھی دلایا ہے کہ :-

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ۔
(مائدہ (۵) رکوع ۸۔ آیت ۶۶)

وہ اگر توراۃ و انجیل کو قائم رکھتے (یعنی ان کے احکام کے پابند ہوتے) اور وہ جو ان کے پروردگار کی جانب سے ان پر اترا ہے اس کی پیروی کرتے تو انہیں اتنی نعمت و روزی ہوتی کہ اوپر سے اور پاؤں تلے سے کھاتے (یعنی ہر سمت ان کے لئے نعمت ہی نعمت ہوتی)، لیکن افسوس ہے کہ جس طرح ان اقوام نے اس شرط کو فراموش کر دیا وہی حالت آج ہماری ہے۔ کہ ایمان و عمل صالح کی پابندی پر ہم کو ترقی کی بشارت دی گئی تھی مگر ہم ہیں کہ دونوں کو بھولے اور نظر انداز کئے ہوئے ہیں اور پھر بھی ترقی کے متمنی ہیں کیا یہ کامیابی کی صورتیں ہیں اور کیا ایسی حالت میں ترقی ممکن ہے؟

آیت الکرسی

(از مولانا عبداللہ العمادی)

(۱)

اللہ تعالٰے نے قرآن میں جو بات بیان کی ہے کھول کر بیان کی ہے۔ اس کو دنیا کے ہر ایک طبقہ کی ہدایت کرنا ہے اس لئے انداز بیان اس قدر واضح شگفتہ اثر ریز اور دل نشین ہے کہ اعلیٰ و ادنیٰ سب اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور نئی فرنگی جمعیت سے لے کر پرانی امیر کافی جماعت تک کو اس کی تعلیمات سے فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل ہے، لیکن دشوار پسند طبیعتیں اتنی ساری توضیح پر بھی قرآن کے مفہوم میں اس قدر مختلف ہیں اور ان اختلافات نے اتنے دور از کار جھگڑے پیدا کر رکھے ہیں کہ ایک ایک کے مقابلہ و تکذیب پر آمادہ ہے۔

یہ اختلافات بیشتر ایسے ہیں جو قرآن کے طرز ادا میں غور نہ کرنے کی وجہ سے واقع ہوئے ہیں۔ قرآن کے انداز بیان و اسلوب کلام میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے پیچیدہ طبیعتیں خود اس کو پیچ در پیچ بناتی جاتی ہیں۔ بجائے اس کے کہ الفاظ سے مطلب نکالا جاتا فلسفہ کی نظر سے اس میں نکتہ آفرینی کی جاتی ہے اور مضمون میں اور بھی گرہیں پڑتی جاتی ہیں۔

ذوق عشق است کہ دشوار پسند افتادست
ورنہ سودائے سر زلف تو دشوار نبود

مثلاً:۔

قرآن نے ایک مقام پر توضیح کی ہے کہ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (خدا کی کرسی آسمان وزمین کو وسیع ہے) اہل نظر کو کرسی کا مفہوم متعین کرنا تھا اس لئے خوب خوب توجیہیں کی گئیں سادہ ہر کسے بحسب فہم گمانے دارد کا نظارہ اچھی طرح آنکھوں کے سامنے آگیا۔ یہ اختلافات قابل دید ہیں۔

الف[1]۔ کرسی اس جگہ کا نام ہے جس پر قدم لٹکاتے ہیں۔

ب[2]۔ کرسی اس جگہ کا نام ہے جہاں خدا کے پاؤں ٹکے ہیں یہ جگہ (کرسی) عرش کے روبرو ہے۔

ج[3]۔ خدا کی کرسی اتنی بڑی ہے کہ آسمان وزمین اس کے جوف میں سما سکتے ہیں۔

د[4]۔ خدا کا عرش کرسی سے بھی بڑا ہے اور اس قدر بڑا ہے جیسے ایک میدان میں لوہے کا چھوٹا سا حلقہ بے حقیقت سا نظر آرہا ہو۔

ھ[5]۔ عرش وکرسی دونوں ایک ہیں۔

و[6]۔ خدا کی کرسی آسمان کے اوپر ہے۔

ز[7]۔ خدا کی کرسی زمین کے نیچے ہے۔

---

[1] عن علی بن مسلم الطوسی عن عبد الصمد بن عبد الوارث عن ابیہ عن محمد بن جحادہ عن سلمۃ ابن کہیل عن عمارۃ بن عمیر عن ابی موسی قال الخ۔

[2] عن موسیٰ بن ھارون عن عمرو عن اسباط عن السدی۔

[3] عن السدی۔

[4] عن یونس عن ابن وھب عن ابن زید عن ابیہ و بروایۃ اخری عن ابی ذر۔

[5] عن المثنی عن اسحاق عن ابی زھیر عن جویبر عن الضحاک عن الحسن۔

[6] عن الحسن وقال النیسابوری قد وردت الاخبار بان الکرسی دون العرش وفوق السماء السابعۃ۔

[7] روی النیسابوری فی رغائبہ عن السدی ان الکرسی تحت الارض۔

حاشیہ۔ خدا کی کرسی میں زمین و آسمان سب سما سکتے ہیں۔ خدا اس پر بیٹھا کرتا ہے اور اس کرسی میں اس کی پوری سمائی ہو جاتی ہے۔ چار انگل بھی زیادتی نہیں ہونے پاتی۔ اس سے چرچراہٹ کی آواز بھی آتی ہے اجس طرح کسی بھاری بھرکم آدمی کے بیٹھنے سے چرچراہٹ پیدا ہوتی ہے۔

ان اختلافات سے کرسی کا مفہوم تو کیا واضح ہوتا خدا کی خدائی میں شک پڑ گیا۔ کرسی کو ایک مقام یا محل مانو۔ خدا کو جسم قرار دو۔ اس کی نشست کے لئے تخت و کرسی بناؤ۔ اور انسان سے خدا کی مشابہت ثابت کرنے کے لئے اس قدر مبالغہ کرو کہ کرسی پر بیٹھنے میں بعض اوقات چولوں سے جو آواز نکلتی ہے اس کی تحقیقات بھی کر چھوڑو۔ اب بات کیا رہ گئی۔ خدا سے ایک یارانہ واتحاد کا ثبوت دینا باقی تھا۔ شاعری نے اس کی تکمیل بھی کر دی "وہ کہے اللہ ہو اور میں کہوں اللہ ہو"

———(۲)———

اہل علم کے لئے یہ موقع نہایت نازک تھا۔ انہیں چار ناچار کسی طرح بات کو سلجھانا پڑا۔ علامہ زمخشری و قفال مروزی نے اس کی نہایت لطیف توجیہ کی ہے صاحب رغائب فرماتے ہیں۔

قیل المقصود من الکلام تصویر عظمة الله	بعض لوگ کہتے ہیں کہ کلام کی غرض دراصل خدا کی عظمت و
وکبریائه ولا کرسی ثمه ولا تعود ولا قاعد	جلال کی تصویر کھینچنا ہے۔ ورنہ حقیقت میں نہ وہاں کرسی ہے
واختاره جمع من المحققین کالقفال	نہ نشست ہے اور نہ کوئی بیٹھنے والا ہے۔ اس توجیہ کو قفال زمخشری
والزمخشری تقریره انه یخاطب الخلق فی	جیسے محققوں کی ایک جماعت نے پسند بھی کیا ہے اس کی
تعریف ذاته وصفاته بما اعتادوا فی	تقریر یوں ہے کہ خدا اپنی ذات و صفات سے روشناس کرانے
ملوکهم فمن ذلك انه جعل الکعبه	کے لئے مخلوقات سے اسی طرح خطاب کرتا ہے جس طرح کے
بیتاً له یطوف الناس به کما یطوفون	خوگر بادشاہوں کے ساتھ لوگ ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً

ا عن عبد الله بن ابان البلد الصطوائی عن عبید الله بن موسی عن اسرائیل عن ابی اسحاق عن عبد الله بن خلیفة

بیوت ملوکهم وامر الناس بزیارته کما
یزور الناس بیوت ملوکهم وذکر الحجر الاسود
انه یمین الله فی ارضه ثم جعله مقبل
الناس کما یقبل ایدی الملوک وکذلك
ما ذکر فی القیامة من حضور الملائکة والنبیین
والشهداء ووضع الموازین وعلی هذا القیاس
اثبت لنفسه عرشا فقال: الرحمن علی
العرش استوی" ووصف عرشه فقال
"وکان عرشه علی الماء" ثم قال: و
تری الملائکة حافین من حول العرش"
ثم قال: ویحمل عرش ربك فوقهم یومئذ
ثمانیة" ثم اثبت لنفسه کرسیا ولما
توفقنا ان المراد من الالفاظ الموهمة
للتشبیه فی الکعبة و الطواف والحجر
هو تعریف عظمة الله وکبریائه فکذا
الالفاظ الواردة فی العرش والکرسی

جس طرح لوگ اپنے بادشاہ کے محل میں آمد ورفت رکھتے
ہیں۔ اور اس کے گرد پھرتے ہیں اسی طرح خدا نے بھی کعبہ کو
اپنا گھر قرار دیا ہے کہ اس کا طواف کیا جائے اور سلاطین
کے گھروں کی طرح اس کی بھی زیارت ہو۔ حجر اسود کو کہا کہ
زمین پر یہ خدا کا داہنا ہاتھ ہے پھر اس کو بوسہ گاہ بنایا
اور اسی طرح جیسے کہ بادشاہوں کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے
ہیں۔ قیامت میں فرشتوں، پیغمبروں، اور شہیدوں کا
حاضر ہونا اور میزان (ترازو) کا رکھا جانا۔ یہ سب اسی
رنگ میں ہے۔ اور اسی انداز میں خدا نے اپنے لئے ایک
تخت کا بھی ثبوت دیا ہے۔ اور فرمایا ہے "خدا تخت پر
قائم ہے" تخت کی کیفیت بھی بیان کی ہے کہ "خدا کا
تخت پانی پر تھا" پھر فرمایا ہے "تو دیکھے گا کہ تخت کے گرد
کو فرشتے گھیرے ہوئے ہیں" ایک اور مقام پر ہدایت کی ہے کہ
"تیرے پروردگار کے تخت کو اس دن آٹھ فرشتے اٹھائے
ہوئے ہوں گے" ان سب کے بعد خدا نے اپنے لئے ایک
کرسی کا بھی ثبوت دیا ہے۔ چونکہ ہمارا اتفاق یہ ہے کہ
کعبہ، طواف، حجر کے الفاظ جن سے تشبیہ کا وہم پیدا ہوتا ہے اصل میں ان الفاظ سے خدا کی عظمت و کبریائی
کو روشناس کرنا مقصود ہے اس لئے عرش وکرسی کے باب میں جو الفاظ وارد ہیں۔ اُن سے بھی یہی مراد ہوگی[1]

[1] غرائب القرآن ورغائب الفرقان للنیساپوری (علی هامش ابن جریر) جلد ۳ صفحہ ۱۹

یہ تاویل ماننے کے قابل ہے لیکن پہلے یہ فیصلہ ہو جانا چاہئے کہ جن الفاظ کی تاویل کی جاتی ہے وہ آیا واقع میں تاویل طلب ہیں؟ اور طواف کعبہ۔ بوسۂ حجر اسود۔ قیامت میں فرشتوں پیغمبروں اور شہیدوں کا دربار۔ انسانی اعمال کو تولنے والی ترازو عرش کرسی۔ ان سب کا آیا وہی مفہوم ہے جس کو ہم لوازمۂ انسانی سمجھ رہے ہیں؟ اور خدا کی خدائی کو اس سے منزہ و مبرا مان کر بات بنانے کی فکر میں ہیں اگر یہ فیصلہ ہو گیا تو مسائل خود بخود واضح ہو جائے گا۔ اور قرص آفتاب کو مشعل لے کر ڈھونڈھنے کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔

(۳)

اس مقام پر ہم کو صرف آیۃ زیر بحث کی تحقیق کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ کرسی کے لفظ سے تاویل کی شاخیں پھوٹی ہیں۔ اس لئے پہلے اسی معمے کو حل کر لینا چاہئے۔ وہ مشہور آیت جس میں یہ لفظ وارد ہوا ہے تمام کمال یوں ہے :۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ	اللہ وہ ذات پاک ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔
سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا	زندہ (کارخانہ عالم کا) سنبھالنے والا۔ نہ اس کو اونگھ آتی
فِی الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗ	ہے اور نہ نیند۔ اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو
اِلَّا بِاِذْنِهٖ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ	کچھ زمین میں ہے۔ کون ہے جو اس کے اذن کے بغیر اس
وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ	کی جناب میں (کسی کی) سفارش کرے۔ جو کچھ لوگوں کے
عِلْمِهٖ اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ	پیش آ رہا ہے (وہ) اور جو کچھ ان کے پیچھے ہو گزرا ہے
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا	(وہ) اس کو سب معلوم ہے اور لوگ اس کے معلومات
وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ۔	میں سے کسی چیز پر بھی حاوی نہیں مگر جتنے پر وہ چاہے اس

کی کرسی آسمان و زمین (سب) پر حاوی ہے۔ اور (آسمان و زمین کی حفاظت اس پر (مطلق) گراں نہیں اور وہ

بڑا عالیشان رہے اور اس کی بڑی بارگاہ ہے[1]۔

اس آیت میں اتنی باتیں مذکور ہیں۔

الف۔ اکیلا ایک خدا ہی معبود سمجھنے کے لائق ہے۔ اس لئے کہ شان معبودی صرف اسی کی ذات سے مخصوص ہے۔

ب۔ وہ زندہ ہے اور سارے جہان کے کام سنبھالے ہوئے ہے۔

ج۔ غفلت کا اس میں دخل تک نہیں۔ کام میں لگا ہوا ہے۔

د۔ ارادہ کا پکا ہے۔

ھ۔ اس کا علم نہایت وسیع ہے۔

و۔ آگے پیچھے سب کا اس کو علم ہے۔

ز۔ اس کا علم ایسا نہیں ہے کہ کوئی اپنی طاقت کے بل سے اس پر حاوی ہو جائے۔

ح۔ اس کی کرسی میں آسمان و زمین سب کی سمائی ہے۔

ط۔ آسمان و زمین کتنے ہی بھاری بھرکم ہوں لیکن خدا ان کی حفاظت سے نہیں تھکتا۔

ی۔ وہ بڑا برتر و بلند مرتبہ ہے۔

اس ترتیب پر غور کرو اور دیکھو کتنا اچھا تسلسل ہے:۔

لوگوں کو توجہ دلائی ہے کہ خدائے واحد کو معبود مانو۔ اس لئے کہ معبود ہونے کے لئے جتنے اوصاف ہو سکتے ہیں وہ اس کی ذات میں اور صرف اُسی کی ذات میں پائے جاتے ہیں۔

یہ اوصاف درجہ بدرجہ بیان کئے ہیں جن میں صفت علم پر سب سے زیادہ زور دیا ہے اور کئی طرح سے

---

[1] یہ ترجمہ مولوی نذیر احمد صاحب کے ترجمہ سے منقول ہے مولوی صاحب موصوف نے کرسی کے معنی اپنی تفسیر میں سلطنت کے بیان کئے ہیں عظیم کے معنی (بڑی بارگاہ) بتلاتے ہیں جو محض غلط ہیں عظیم کے اصلی معنی تو صاحب عظمت کے ہیں۔

اس خصوصیت پر روشنی ڈالی ہے۔

اوصاف کی جو تدریجی رفتار قائم کی ہے اس کا اسلوب دیکھنے کے قابل ہے۔ ہر ایک صفت کا نچلا سرا اپنے بعد والی صفت کے اوپری حلقہ سے لگاؤ رکھتا ہے لیکن صفت (ح) کو (ط) سے تو لگاؤ ہے۔ مگر (ی) سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ علم کے ساتھ کرسی کو کیا مناسبت ہے؟

کرسی سے اگر بیٹھنے ہی کی کرسی مراد ہے اور وہ بھی اتنی بڑی کہ آسمان و زمین کو حاوی ہو تو جہاں یہ صفت بیان کی تھی کہ خدا آسمان و زمین کی حفاظت سے نہیں تھکتا۔ وہاں اسی ذیل میں کرسی کا تذکرہ کیوں نظر انداز کر دیا گیا۔ کرسی تو آسمان و زمین سب سے بڑی تھی۔ بڑی چیز کو چھوڑ کر چھوٹی چیز کے بار اٹھانے کے تذکرہ میں کیا بلاغت ہو سکتی ہے؟

(۴)

واقعہ یہ ہے کہ کلام عرب میں دراصل "کرسی" وہ ہے جس کا لوگ سہارا لیتے ہیں، زجاج کا قول ہے:۔

الذی تعرف من الکرسی فی اللغۃ الشیٔ الذی یعتمد علیہ (کرسی کے متعلق زبان میں جو معروف ہے وہ اسی قدر ہے کہ کرسی وہ ہے جس کا سہارا لیں) اسی لحاظ سے جس پر حکومت غالب تھی اور حکومت ہی کو سب سے بڑا سہارا مانتا تھا اس نے "کرسی" کے معنی حکومت قرار دیئے، جو بیٹھنے کی چیز کے سہارے پر قانع تھے وہ اس سے کرسی متعارف سمجھے، اور جن کی نظر خالص کلام عرب پر تھی ان کے نزدیک سب سے بڑا انسانی سہارا علم تھا اس لئے "کرسی" کے معنی علم کے ہو گئے، قدمائے اہل زبان میں علم کے لئے کرسی کا لفظ متداول تھا، کہتے تھے۔

کرس الرجلُ۔ ای ازدحم علمہ علی قلبہ۔[1]

آؤ اس کے فیصلہ کے لئے سلف صالح کو حکم بنائیں۔

علامہ ابو جعفر ابن جریر طبری جن کی وفات کو ایک ہزار برس سے زیادہ زمانہ گزر چکا ہے[2] ہر ایک

[1] لسان العرب۔ ج ۸۔ ص ۷۷۔ [2] ابن جریر طبری نے ۳۱۰ھ ۹۲۲ء میں وفات پائی۔ ان کی تفسیر کی نسبت علامہ ابو حامد اسفرائنی

باقی بر صفحہ ۱۰۶

بات میں روایت کے پابند ہیں اور گو ان کا خاص ذوق یہ ہے کہ حدیث کے نام سے چاہے کیسی ہی بات کہی جائے وہ سب کی روایت کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں، تاہم بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر ایک بات کے متعلق مختلف انداز کی روایتیں جمع کر دیتے ہیں جن سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ صحابہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم، فلاں آیت کا کیا مطلب سمجھتے تھے اور ان کی اس بات میں کیا رائے تھی۔ اس آیت کی تفسیر میں بھی حسب معمول متعدد روایتیں بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

اما الذی یدل علی صحته ظاهر القرآن فقول ابن عباس الذی رواه جعفر بن ابی مغیرة عن سعید بن جبیر عنه انه قال: "هو (ای الکرسی) علمه" وذلک لدلالة قوله تعالیٰ ذکره: "ولا یؤده حفظهما" علی ان ذلک کذالک فاخبر انه لا یؤده حفظ ما علم و احاط به مما فی السمٰوٰت والارض وکما اخبر عن ملائکته انهم قالوا فی دعائهم: "ربنا وسعت کل شیئ رحمة وعلما" فاخبر تعالیٰ ذکره

لیکن وہ بات جس کے صحیح ہونے پر کھلم کھلا قرآن دلالت کر رہا ہے تو وہ ابن عباس کا قول ہے جسے جعفر بن مغیرہ نے سعید بن جبیر کے حوالے سے بیان کیا کہ ابن عباس کہتے تھے کہ، آیۃ الکرسی میں "کرسی سے مراد خدا کا علم ہے"۔ ابن عباس نے یہ بات اس لئے کہی کہ آیت: "آسمان و زمین کی نگہبانی خدا کو نہیں تھکاتی" خود اس پر دلیل ہے۔ خدا نے اطلاع دی ہے کہ آسمان و زمین میں جو کچھ بھی ہے خدا کو سب کا علم ہے اور سب پر وہ محیط ہے ان میں سے کسی کی حفاظت اس کو تھکا نہیں سکتی۔ اسی طرح اپنے فرشتوں کے متعلق خبر دی ہے کہ وہ اپنی دعائیں کہتے ہیں: "اے ہمارے پروردگار تیری رحمت اور تیرا علم ہر ایک چیز کو وسیع ہے"۔ اس مذکورہ سے یہ آگاہ کرنا مقصود تھا کہ

(بقیہ صفحہ ۱۰۵) کی رائے ہے کہ لو سافر رجل الی الصین حتی یحصل له کتاب تفسیر محمد بن جریر لم یکن ذلک کثیرا۔ (تفسیر ابن جریر کے لینے کے لئے اگر کوئی شخص چین تک چلا جائے تو یہ کوئی بڑی بات نہ ہوگی۔ ملاحظہ ہو طبقات الشافعیہ لابن السبکی۔ ۱۳۲۱ھ میں یہ تفسیر مصر کے مطبع میمنیہ میں چھپ گئی ہے۔)

ان علمه وسع کل شئ فکذلك قوله.	خدا کا علم ہر چیز کو حاوی ہے لہٰذا اسی طرح آیت اس کی کرسی
ووسع کرسیه السموٰت والارض؛	آسمان وزمین کو حاوی ہے" میں کرسی سے مراد علم ہی ہے یعنی خدا کا
واصل الکرسی العلم ومنه قیل	علم آسمان وزمین میں جو کچھ ہے سب کو حاوی ہے" کرسی کے اصلی معنی
للصحیفة یکون فیها علم مکتوب	بھی علم ہی کے ہیں۔ کراسہ اسی لفظ سے نکلا ہے۔ جس کے
کراسة ومنه قول الراجز فی	معنی جزو کتاب کے ہیں جس میں علمی باتیں لکھی ہوتی ہیں۔ راجز شاعر
صفة قانص:-	نے اسی بنا پر ایک شکاری کی صفت میں کہا تھا۔
"حتیٰ اذا ما احتارها تکرس"	"حتی اذا ما احتارها تکرس"
یعنی علم۔ ومنه یقال للعلماء	اس میں تکرس سے" علم ہی مراد ہے۔ علما کو بھی اسی لئے کرسی کہتے
الکراسی لانهم المعتمد علیهم کما	ہیں۔ کیونکہ انہیں پر اعتماد ہوا کرتا ہے۔ انہیں "اوتاد الارض"
یقال اوتاد الارض یعنی بذلك	زمین کی میخ بھی کہا جاتا ہے اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ ان علما
انهم العلماء الذین تصلح بهم	میں ہیں جن کی بدولت زمین سنبھلی ہوئی ہے۔ ایک شاعر کہتا
الارض ومنه قول الشاعر۔	ہے:-
تحف بهم بیض الوجوہ وعصبة	تحف بهم بیض الوجوہ وعصبة
کراسی بالاحداث حین تنوب	کراسی بالاحداث حین تنوب
یعنی بذلك علماء بحوادث الامور	اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسے کرسی یعنی عالم ہیں جن کو حادثوں
ونوازلها۔ ؎	اور مصیبتوں کی خبر رہا کرتی ہے۔

قدیم بزرگان اہل تشیع کو بھی اس معنے سے اتفاق ہے اور ائمہ اثنا عشر میں دو امام ابو جعفر و ابو عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے یہی مطلب ماثور ہے۔ اس فرقے کے سب سے بڑے مفسر علامہ طبرسی ہیں جن کی کتاب

؎ تفسیر ابن جریر ج ۳- ص ۷، ۸-

مجمع البیان میرے سامنے ہے وسع کرسیہ کی چار تاویلیں کی ہیں جن میں پہلا نمبر یہ ہے کہ کرسی کے معنی علم ہیں

وسع علمہ السمٰوٰت والارض عن ابن عباس ومجاھد وھو المروی عن ابی جعفر وابی عبد اللہ۔ [1]

ابن عباس اور مجاہد کی روایت میں کرسی سے علم مراد ہے امام ابو جعفر اور امام ابو عبد اللہ سے بھی یہی معنی مروی ہیں۔

اسمٰعیلی بھی اسی معنی کے قائل ہیں۔ "مجالس مویدیہ" کی ایک مجلس اسی کے لئے مخصوص ہے صوفیہ بھی اسی جانب مایل ہیں، شیخ اکبر محی الدین بن عربی صاحب فصوص و فتوح اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:-

وسع کرسیہ السمٰوٰت والارض ای علمہ اذالکرسی مکان العلم الذی ھو القلب کما قال ابو یزید البسطامی "لو وقع العالم ومافیہ الف الف مرۃ فی زاویۃ من زوایا قلب العارف ما احس بہ لغایتہ سعتہ" [2]

"وسع کرسیہ" میں کرسی سے مراد اللہ کا علم ہے۔ کرسی محل علم ہے اور اسی کا نام قلب ہے بلو بایزید بسطامی فرماتے ہیں کہ "عارف کے کسی ایک گوشۂ قلب میں اگر تمام جہان مع اپنے تمام موجودات کے ایک ہی مرتبہ نہیں بلکہ ہزار ہزار مرتبہ جا پڑے تو کمال وسعت قلب کے باعث عارف کو یہ محسوس تک نہ ہو۔"

اس تصریح نے تمام عقدے حل کر دیئے اور بتا دیا کہ جس زبان میں قرآن نازل ہوا ہے اُس میں کرسی کا مفہوم کیا تھا اور کن مطالب کے لئے اس لفظ کا استعمال کیا جاتا تھا۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان۔ جلد ۱ صفحہ ۱۴۸۔

[2] تفسیر ابن عربی۔ صفحہ ۸۹۔

گوسالہ سامری

(از مولینا عبداللہ العمادی)

ای برہمن آں عذار چوں لالہ پرست رخسار نگار چار دہ سالہ پرست
گر چشم خدائے بین نداری بارے خورشید پرست شو نہ گوسالہ پرست

(۱)

ایک سامری وہ تھے جن کے آثار تمدن آج کل سندھ کے حفریات سے نمایاں ہو رہے ہیں، اصطلاحی معنی میں یہ سامی قوم اگر عرب نہ تھی تو کوئی شک نہیں کہ عربی قومیت کے خاندان سے قریب ترین تعلق رکھتی تھی، حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت سے کئی ہزار برس قبل سامریوں نے عراق سے نکل کر ہندوستان کا رخ کیا اور سندھ میں ایک ایسے تمدن کی طرح ڈالی جس کے خط و خال کی نمو داریوں نے آج ایک عالم کو محو حیرت بنا رکھا ہے۔ بلوچستان اور ملیبار میں اس قوم کی یاد اب بھی تازہ ہے۔ اور اگرچہ اس قدیم تہذیب کا نشان معدوم ہو چکا ہے مگر نام اب بھی موجود ہے۔

لیکن آج کے مضمون سے یہ سامری متعلق نہیں۔

آج کا مضمون اس سامری سے متعلق ہے جس نے ایک گوسالہ بنایا تھا۔ اور بہتیرے یہودیوں سے اس کی پوجا کرائی تھی عجب نہیں یہ بھی اسی قوم کا بقیہ ہو۔

اس گوسالہ پر ایک عجیب افسانے کا رنگ چڑھایا گیا ہے اور اس رنگ سازی میں کلام اللہ کو لایا گیا ہے، ایسی رنگینی پیدا کرنے والے دماغوں سے گوسالہ آرائی پر بحث کی ضرورت نہیں۔

ضرورت صرف اس قدر ہے کہ گوسالہ آرائی کی ذہن میں آیات کلام اللہ کے متعلق جو غلط ملط کیا گیا ہے اس کو صاف کر دیا جائے۔

اس باب میں اہل نظر کے نقل اقوال پر ہی میں نے قناعت کی ہے، خود میری کوئی رائے نہیں، اور خدا نہ کرے کہ میں کلام اللہ کے مفہوم متعین کرنے میں اپنی رائے کو دخل دوں۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ

پہچانتا ہوں گو قدم راہبر کو میں

سامری کے گوسالہ کا تذکرہ تو کئی جگہ ہے لیکن گوسالہ میں آواز پیدا ہونے کے سبب کا تذکرہ بیان کیا جاتا ہے کہ سورۂ طٰہٰ میں ہے آیات ذیل ملاحظہ ہو۔

وَمَا أَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوسٰى ۝	اور (جب موسیٰ تورات لینے آگے بڑھ آئے تو ہم نے پوچھا کہ
قَالَ هُمْ أُولَاءِ عَلٰى أَثَرِي وَعَجِلْتُ	اے موسیٰ تم جلدی کر کے اپنی قوم سے کیسے آگے آ گئے عرض کیا
إِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ۝ قَالَ فَإِنَّا قَدْ فَتَنَّا	وہ بھی یہ میرے پیچھے (ہی پیچھے چلے آ رہے ہیں۔) اور اے
قَوْمَكَ مِنْ بَعْدِكَ وَأَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ۝	میرے پروردگار میں جلدی کر کے تیری طرف اس لئے بڑھ
فَرَجَعَ مُوسٰى إِلٰى قَوْمِهِ غَضْبَانَ	آیا ہوں کہ تو (مجھ سے) خوش ہو فرمایا کہ ہم نے تمہارے
أَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ أَلَمْ يَعِدْكُمْ	پیچھے تمہاری قوم کو (ایک اور) بلا میں مبتلا کر دیا ہے
رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۚ أَفَطَالَ عَلَيْكُمُ	اور (وہ یہ ہے کہ) ان کو سامری نے گمراہ کیا۔ پھر موسیٰ
الْعَهْدُ أَمْ أَرَدْتُمْ أَنْ يَحِلَّ عَلَيْكُمْ	غصے اور افسوس کی حالت میں اپنی قوم کی طرف واپس
غَضَبٌ مِنْ رَبِّكُمْ فَأَخْلَفْتُمْ مَوْعِدِي ۝	آئے اور آ کر کہنے لگے کہ بھائیو! کیا تم سے تمہارے
قَالُوا مَا أَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا	پروردگار نے وعدہ (کتاب یعنی تورات کے دینے کا)
حُمِّلْنَا أَوْزَارًا مِنْ زِينَةِ الْقَوْمِ	وعدہ نہیں کیا تھا؟ تو کیا تم کو (اس وعدے کی) مدت

فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ۙ
فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ
فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۥ
فَنَسِيَ ۗ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ
قَوْلًا ۙ وَّلَا يَمْلِكُ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۚ
وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ
يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ
رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا
اَمْرِيْ ۝ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ
حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ۝ قَالَ يٰهٰرُوْنُ
مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ۙ اَلَّا
تَتَّبِعَنِ ۭ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ۝ قَالَ
يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ
اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ
بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ
قَوْلِيْ ۝ قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ
قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ
فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ
فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ

بڑی بلا ہی معلوم ہوئی اور اس وجہ سے تم نے اس عہد کے خلاف
کیا جو (خدائے واحد کی پرستش کا) مجھ سے کر چکے تھے (وہ)
لگے کہنے کہ ہم نے اپنے اختیار سے تمہارے ساتھ عہد شکنی
نہیں کی (ہمکو یہ معاملہ پیش آیا کہ قبطیوں کی) قوم کے
زیوروں کا بوجھ جو (مصر سے چلتے وقت) ہم پر لاد دیا
گیا تھا اب (سامری کے کہنے سے) ہم نے اس کو (آگ
میں) ڈال دیا۔ اور اسی طرح سامری نے بھی (اپنے پاس کا
زیور) ڈال دیا پھر سامری ہی نے (لوگوں کے لئے (اس کا
ایک) بچھڑا (بنا کر) نکال کھڑا کیا (یعنی بچھڑا کیا) بت
جس کی آواز (بھی) (بچھڑے کی سی) تھی۔ اس پر بعض
لوگ کہنے لگے کہ یہی تو تمہارا معبود ہے اور موسیٰ کا معبود
(بھی یہی تھا) اور وہ بھول (کر کوہ طور پر چلا) گیا ہے۔ کیا ان
لوگوں کو اتنی بات بھی نہیں سوجھ پڑتی تھی۔ کہ (بچھڑا)
ان کی بات کا نہ تو الٹ کر جواب دے سکتا ہے اور نہ
ان کے کسی نقصان کا مالک ہے اور نہ کسی نفع کا۔ اور
ہارون نے (بچھڑے کی پرستش سے) پہلے ان سے کہا
بھی کہ بھائیو! یہ تو اس (بچھڑے) کے ذریعے تمہاری
آزمائش کی جا رہی ہے۔ ورنہ تمہارا پروردگار تو (خدائے)
رحمٰن ہے تم میرے کہنے پر چلو اور میری بات مانو وہ لگے کہنے

قَالَ فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ أَنْ تَقُولَ لَا مِسَاسَ وَإِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهُ ۔ وَانْظُرْ إِلٰهِكَ الَّذِي ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۔ لَّنُحَرِّقَنَّهُ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهُ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ۔ إِنَّمَا إِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۔ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۔

(سورہ ۲۰ ۔ رکوع سوم ۔ آیت ۹۴ تا ۹۷)

کہ جب تک موسیٰ لوٹ کر ہمارے پاس (نہ) آئیں ہم تو برابر اسی (بچھڑے) کی پرستش (پر جمے بیٹھے) رہیں گے۔ (موسیٰ نے ہارون کی طرف خطاب کر کے) کہا کہ ہارون! جب تم نے ان کو دیکھا تھا (کہ یہ لوگ) گمراہ ہو گئے تو تم کو کیا وجہ مانع ہوئی کہ تم نے میری ہدایت کی پیروی نہ کی۔ کیا تم نے میری عدول حکمی کی (وہ) بولے کہ اے میرے ماں جائے (بھائی) میری ڈاڑھی اور سر کے بال (تو پکڑو) نہیں میں اس (بات) سے ڈرا کہ (تم واپس آکر کہیں یہ نہ) کہنے لگو کہ تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی اور میری بات کا پاس نہ کیا۔ (اب موسیٰ نے سامری سے) پوچھا کہ سامری! تیرا کیا حال ہے۔ اس نے کہا کہ مجھے وہ چیز دکھائی دی (جبرئیل کو دیکھا کہ وہ گھوڑے پر سوار چلے جا رہے ہیں) تو میں نے جبرئیل فرشتے (کی گھوڑی کے نقش قدم) کی مٹی (سے ایک مٹھی بھر لی پھر اس کو ڈھلے ہوئے بچھڑے میں ڈال دیا (اور وہ بھائیں بھائیں کرنے لگا) اور (اس وقت) میرے دل نے مجھکو ایسی ہی صلاح دی، موسیٰ نے کہا چل (دور ہو) اس زندگی میں تو تیری یہ سزا ہے کہ (زندگی بھر) کہتا پڑا پھر کہ (دیکھو مجھے کوئی) چھو نہ جانا (ورنہ ہم دونوں کو تپ آجائے گی) اور (اس کے علاوہ) تیرے لئے (عذاب قیامت کا) ایک وعدہ اور بھی ہے جو کسی طرح تجھ پر سے ٹلے گا نہیں اور اپنے (اس) معبود (یعنی بچھڑے) کی طرف دیکھ جس (کی پرستش) پر تو جما بیٹھا تھا اس کو ہم جلا کر (راکھ کر) دیں گے۔ پھر اس (راکھ) کو دریا میں بکھیر کر بہا دیں گے۔ لوگو تمہارا (اصل) معبود بس اللہ ہے جس کے سوا کوئی (اور) معبود نہیں (اور) اس کا علم سب چیزوں پر حاوی ہے۔

حسب معمول ان آیات کا ترجمہ بھی شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم سے ماخوذ ہے بھولیاں میں اس قصے کے متعلق بہت سی دور از کار روایتیں مشہور تھیں جو مفسرین کی عنایت سے مسلمانوں میں اب تک مشہور چلی آتی ہیں اور ہمارے شمس العلماء نے تو بطور ایک واقعہ مسلمہ کے آیات کا ترجمہ بھی اسی انداز میں کیا ہے اس ترجمہ کی بنا پر قرآن کریم کو متعدد حملے برداشت کرنا پڑتے ہیں۔

(الف) جبرئیل کی گھوڑی کے نقش قدم کی مٹی سامری کو کیونکر ملی ؟

(ب) کیا آسمانی فرشتے گھوڑوں پر سوار ہو کر زمین کی سیر کیا کرتے ہیں۔ ؟

(ج) کیا ان گھوڑوں کے نقش قدم کی مٹی کو ڈھلے ہوئے مجسمے کے جوف میں ڈالنے سے اس کا زندہ جانور ہو جانا ممکن ہے ؟

(د) سامرییّن کا فرقہ تو حضرت موسیٰ کے زمانے سے تعلق نہیں رکھتا پھر یہ سامری اس زمانہ میں کہاں سے نکل آیا ؟

(ھ) تورات تو کہتی ہے کہ حضرت ہارون نے بچھڑا بنایا تھا پھر اس واضح تصریح کے ساتھ کلام اللہ کا کھلا ہوا اختلاف کیا معنے رکھتا ہے ۔ ؟

ہمارے دوست شیخ عبد القادر مغربی نے جو طرابلس الشام کے محقق ہیں ۔ ان شبہات کی تاویل کی ہے اگر ان کو چوتھے اور پانچویں شبہہ کے متعلق غور کرنے کا موقع نہیں ملا پہلے دوسرے اور تیسرے اعتراضات میں جبرئیل کی گھوڑی کا واقعہ اور اس کے نقش قدم کی مٹی کے ذریعے ڈھلے ہوئے بچھڑے میں جان کا آجانا یہ دونوں باتیں ان کی رائے میں قرآن سے مستنبط ہو رہی ہیں ۔ لیکن اعتراضات کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ :۔

۱۔ قرآن نے سامری کے قول کو نقل کیا ہے ۔ ممکن ہے اسی نے جھوٹ کہا ہو لیکن اس سے قرآن پر حرف نہیں آسکتا۔

۲۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ بچھڑے کا مجسمہ زندہ ہو گیا تھا، وہ صرف آواز کا تذکرہ کر رہا ہے جو عجیب نہیں کہ کسی کل کے ذریعہ سے سامری نے پیدا کر لی ہو۔

سید احمد خاں کی رائے ہیں :" ایک لفظ بھی قرآن مجید کا اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ اس بچھڑے میں سچ مچ کی اور خدا کے پیدا کئے ہوئے بچھڑے کے مانند آواز تھی بلکہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سامری نے اس بچھڑے کو اس طرح بنایا تھا کہ اس میں سے آواز بھی نکلتی تھی۔ ہزاروں جانور اب بھی کاریگر اس طرح سے بناتے ہیں کہ وہ اڑتے ہیں۔ چلتے ہیں۔ حرکت کرتے ہیں بولتے ہیں۔ سامری نے بھی اس بچھڑے کو ایسی کاریگری سے بنایا تھا کہ اس میں سے آواز بھی نکلتی تھی[۱]"

یہ مضمون قابل اعتنا ہے لیکن مرحوم نے اس کے ساتھ جبرئیل کی گھوڑی کے نقش قدم کی مٹی لے کر بچھڑے کے جوف میں ڈالنے کے واقعہ سے تو بڑی سختی سے انکار کیا ہے اگرچہ وہ یہ جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ جب پہاڑ کو جا رہے تھے تو سامری نے ان کے نقش قدم کی مٹھی بھر مٹی اٹھالی تھی اور بعد کو وہی مٹی بچھڑے کے جوف میں ڈالی تھی[۲]

(۷)

کلام اللہ کے الفاظ بہت ہی واضح اور صاف صاف ہیں۔ ان میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہ اس کا ترجمہ جبریل فرشتہ۔ یا فرشتہ کی گھوڑی۔ یا مٹی کر سکتے ہوں ابو مسلم کی رائے میں حضرت موسیٰؑ نے جب سامری کو ملامت کی تو اس نے انہیں مخاطب کر کے کہا کہ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوا بِهِ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذَٰلِكَ سَوَّلَتْ لِي نَفْسِي (مجھے ایسی بات سوجھی جو کسی کو نہ سوجھی تھی اے رسول (موسیٰ) میں پہلے تمہاری پیروی کرتا تھا لیکن اب میں نے چھوڑ دی اور میرے جی میں ایسا ہی آیا) عربی محاورہ میں پیروی کے لئے قبض اثر کا استعمال عام طور پر رائج ہے ۔ اور شعرائے جاہلیت کے

[۱] تفسیر القرآن جلد ۳ صفحہ ۱۹۰ (طبع لاہور) [۲] تفسیر القرآن صفحہ ۱۹۷

کلام سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ھٰذا ما عندھم، امّا الذی عندی فاسمہ اللہ کثیرا و اذکرہ کثیرا لیطمئن قلبی الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔

ابو مسلم اصفہانی لکھتے ہیں:۔

لیس فی القرآن تصریح بھذا الذی ذکرہ المفسرون[1] فھھنا وجہٌ اٰخر وھو ان یکون المراد بالرسول موسیٰ علیہ السلام و باثرہ سنتہٗ ورسمہ الذی امر بہ فقد یقول الرجل فلان یقفوا اثر فلان ویقبض اثرہٗ اذا کان

مفسرین جو بیان کرتے ہیں قرآن میں اس کی کوئی تصریح موجود نہیں ہے۔ یہاں ایک دوسری بات ہے اور وہ یہ ہے کہ لفظ رسول سے حضرت موسیٰؑ مراد ہیں اور اثر الرسول سے ان کی سنت طریقہ مراد ہے جس کی پابندی کا انہوں نے حکم دیا تھا۔ جب کوئی کسی کے طریقے پر کاربند ہوا کرتا ہے تو کہتے ہیں "فلان یقفوا اثر فلان ویقبض اثرہٗ یا فلان یقبض اثر فلان"۔

---

[1] مفسرین یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ جب بنی اسرائیل کی تمام جماعت لے کر مصر سے شباشب نکل آئے تو فرعون نے لشکر لے کر ان کا پیچھا کیا۔ جاتے جاتے بنی اسرائیل جب دریا کے کنارے پہنچے تو حضرت موسیٰؑ کے معجزہ سے وہ پایاب ہو گیا۔ اور سب لوگ پار اتر گئے فرعون یہ دیکھ کر کچھ ٹھٹک سا گیا لیکن خدا کو اس کا غرق کرنا منظور تھا۔ حضرت جبرئیل ایک انسان کے بھیس میں گھوڑے پر سوار آ نکلے۔ فرعون کے گھوڑے کے آگے اپنی گھوڑی کر دی اور دریا میں اتر گئے فرعون کا گھوڑا یہ دیکھ کر شوخی کرنے لگا اور فرعون کو لے کر بے ساختہ گھوڑی کے پیچھے دریا میں اُتر گیا۔ مصریوں نے جب اپنے بادشاہ کو دریا میں اترتے دیکھا تو سب لوگ اس کے پیچھے ہو لیے اور بیچ دھار میں جا کر سب کے سب ڈوب گئے۔ سامری کی پرورش حضرت جبرئیل نے کی تھی لہذا وہ انہیں خوب پہچانتا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ حضرت جبرئیل گھوڑی پر سوار جا رہے ہیں تو گھوڑی کے نقش قدم کی ایک مٹھی بھر مٹی اٹھالی اور جب حضرت موسیٰؑ توریت لینے کے لئے کوہ طور پر گئے تو سونے چاندی کے زیور جو مصر سے باہر نکلنے کے قبل بنی اسرائیل کی عورتیں قبطیوں سے مستعار لے کر بھاگ آئی تھیں سامری نے ان سب کو اکٹھا کیا اور تمام زیوروں کو گلا کر ایک بچھڑا بنایا اور اس کے جوف میں وہی مٹی جو حضرت جبرئیل کی گھوڑی کے نقش قدم سے اس نے اٹھائی تھی ڈالدی جس کی وجہ سے بچھڑا زندہ ہو گیا۔ اور بولنے لگا۔ اسی طرح کی بہت سی باتیں عرب کے یہودیوں میں مشہور تھیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ افسانے اس طرح سے قرآن کریم میں کہیں بھی مذکور نہیں۔

یمتثل رسمه وا لتقدیر ان موسیٰ
علیه السلام لما اقبل علی السامری
باللوم والمسألة عن الامر الذی
دعاه الی اضلال القوم فی باب
العجل فقال بصرت بما لم یبصروا
بہ ای عرفت ان الذی انتم علیه
لیس بحق وقد کنت قبضت قبضة
من اثرک ایها الرسول ای شیئا
من سنتک ودینک فنبذتها ای
طرحتها فعند ذٰلک اعلمه موسیٰ
علیه السلام بما له من العذاب
فی الدنیا والاخرة انما اورد
بلفظ الاخبار عن غائب کما
یقول الرجل لرئیسه وهو مواجه
له ما یقول الامیر فی کذا او بماذا یأمر
الامیر واما دعاؤه موسیٰ علیه السلام
رسولا مع جحده وکفره فعلی مثل مذهب
من حکی الله تعالیٰ عنه قوله یا ایها الذی
نزل علیه الذکر انک لمجنون وان لم

یعنی اس کی روش کی پیروی کرتا ہے، مطلب یہ ہے کہ حضرت
موسیٰ جب سامری کو ملامت کرنے لگے اور پوچھا کہ کیا بات تھی
کہ گوسالہ کے ذریعے لوگوں کو گمراہ کر ڈالا تو اس نے جواب دیا
کہ مجھے وہ سوجھی جو تم میں سے کسی کو نہ سوجھی (یعنی مجھے معلوم
ہو گیا کہ جس طریقہ پر تم ہو وہ درست نہیں ہے) "اے پیغمبر پہلے میں نے
تمہارے اثر کو کچھ قبضہ میں کر لیا تھا" (یعنی تمہارے طریقہ و مذہب
کا کچھ پابند تھا) "بعد کو میں نے اسے چھوڑ دیا" یہ سن کر حضرت
موسیٰؑ نے اس کو بتایا کہ اس کا کیا نتیجہ ہونے والا ہے اور
دنیا و آخرت میں اس کو کیا کیا عذاب ہوں گے سامری نے
رسول کہکر حضرت موسیٰؑ سے اس طرح باتیں کی تھیں جیسے
کسی غائب کا تذکرہ ہو رہا ہو سو اس کی مثال ایسی ہی ہے
جیسے کسی بڑے آدمی سے کوئی اس کے روبرو کہے کہ "اس
امر میں امیر کا کیا حکم ہے" یا فلاں مسئلہ میں بادشاہ سلامت
کیا فرماتے ہیں" رہی یہ بات کہ سامری تو منکر تھا پھر اس
نے حضرت موسیٰؑ کو رسول کیوں کہا۔ تو اس کی مثال یوں
سمجھنی چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ نے پیغمبر کی نسبت کافروں
کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "اے وہ شخص کہ اس پر وحی اتری
ہے تو مجنون ہے" حالانکہ ان کافروں میں کوئی بھی
پیغمبر پر وحی اترنے کا۔

یونمتوا بالاخزال ۔ ؎ عاقل و دانا ۔ ؎

امام رازی نے اس مضمون کو حرف بحرف نقل کیا ہے ۔ اور پھر فرماتے ہیں :۔

واعلم ان ھذا القول الذی ذکرہٗ	واضح ہو کہ یہ قول جو ابو مسلم نے بیان کیا ہے اس میں مفسرین
ابو مسلم لیس فیہ الا مخالفۃ	کے اقوال کی مخالفت تو ہے لیکن یہ قول تحقیق کے بہت
المفسرین ولکنہ اقرب الی التحقیق	قریب ہے ۔ اس کی کئی وجہیں ہیں ۔
لوجوہ احدھا ان جبرئیل علیہ	پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت جبرئیل رسول کے نام سے
السلام لیس بمشھور باسم الرسول	مشہور نہ تھے اور نہ پہلے کہیں ان کا تذکرہ ہو چکا ہے کہ الف
ولم یجرلہ فیما تقدم ذکرٌ حتی یجعل	ولام تعریف ان کے نام (رسول) پر آتا اور اس سے جبرئیل
اللام التعریف اشارۃ الیہ فاطلاق	مراد ہوتے ۔ رسول کہنا اور جبرئیل مراد لینا یہ تو گویا علم
لفظ الرسول لارادۃ جبرئیل علیہ	غیب کی تکلیف دینا ہے ۔
السلام کانہ تکلیف بعلم الغیب ۔	دوسرے یہ کہ اس صورت میں ضمیر لانے کی ضرورت ہوگی ۔
وثانیھا انہ لا بدَّ فیہ من الاضمار	یعنی رسول کے گھوڑے کے سم کا نقش ۔ اور یہ ظاہر ہے
وھو قبضۃ من اثرحافر فرس	کہ ضمیر خلاف اصل ہے ؛
الرسول ۔ والاضمار خلاف الاصل ۔	تیسری مشکل یہ ہے کہ اس توجیہ میں مزید تکلف کرنا پڑے
وثالثھا انہ لا بدّ من التعسف	گا ۔ کہ تمام لوگوں میں اکیلے ایک سامری ہی نے مخصوص
فی بیان ان السامری کیف اختص	طور پر کیسے جبرئیل کو دیکھا اور انہیں پہچان بھی لیا ۔ پھر
من بین جمیع الناس برؤیۃ جبرئیل	اسے کیونکر معلوم ہوا کہ حضرت جبرئیل کی گھوڑی کے سم
علیہ السلام ومعرفتہ ثم کیف	کی مٹی میں یہ اثر ہے ۔ مفسرین یہ جو توجیہ کرتے ہیں کہ
عرف ان لتراب حافر فرسہ ھذا	حضرت جبرئیل ہی نے سامری کو پالا تھا ۔ تو یہ اور

؎ تفسیر کبیر جلد ۶ صفحہ ۲۰۵ ، ۲۰۶ طبع مصر ۱۳۰۸ھ

الاثر و ان الذی ذکروہ من ان جبرئیل علیہ السلام ھو الذی رباہ فبعید لان السامری ان عرف جبرئیل حال کمال عقلہ عرف قطعًا ان موسیٰ علیہ السلام نبیٌ صادقٌ فکیف یحاول الاضلال ـ وان کان ما عرفہ حال البلوغ فأیّ منفعة لکون جبرئیل علیہ السلام مربیًا لہ حال الطفولیة فی حصول تلک المعرفة۔

یہی دور کی بات ہے اس لئے کہ سامری کو جب پوری عقل آچکی تھی اس زمانے میں اگر جبرئیل کو پہچانتے ہوتا تو یقینًا اس کو یہ بھی معلوم ہوا ہوتا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سچے پیغمبر ہیں اس صورت میں وہ گمراہ کرنے کا کیوں کر قصد کر سکتا تھا۔ اور اگر اس نے بلوغ کے زمانے میں حضرت جبرئیل کو نہیں پہچانا تھا تو اگر جبرئیل لڑکپن میں اس کے مربی رہے بھی تو اس سے کیا فائدہ ہوا۔ اور یہ سابقہ معرفت کس طرح کام آسکتی تھی۔

ورابعها انہ لو جاز اطلاع بعض الکفرة علی تراب ھذا شانہ فلقائل ان یقول۔ فلعل موسیٰ علیہ السلام اطلع علی شیء آخر یشبہہ ذلک فلاجلہ اتی بالمعجزات" ویرجع حاصلہ الی سوال من یطعن فی المعجزات ویقول" لم لا یجوز ان یقال انھم لاختصاصھم بعض الادویة التی لھا خاصیة

چوتھی دقت یہ ہے کہ اگر یہ جائز ہے کہ ایسی تاثیر کی مٹی سے کفار واقف ہو سکتے ہیں، تو اعتراض کرنے والے کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ عجب نہیں حضرت موسیٰ نے بھی اسی تاثیر کی کوئی اور چیز پالی ہو اور اسی کے اثر سے یہ معجزات صادر ہوئے ہوں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ معجزات میں طعن کرنے کی ایک اور سبیل نکل آئے گی اور معترض کہے گا کہ یہ کہنا کیونکر ناجائز ہو سکتا ہے کہ پیغمبروں کو بعض ایسی دوائیں مل گئی ہوں جن کی خاصیت سے اس طرح کے معجزات صادر ہو سکتے ہوں۔ غرض کہ یہ وجہ صحیح

ان تقیں حصول تلك المعجزۃ اتوا بتلك المعجزۃ۔ وحینئذٍ ینسد باب المعجزات بالکلیہ

اما قولہ۔ وکذٰلك سوّلت لی نفسی۔ فالمعنی فعلت ما دعتنی الیہ نفسی۔ وسوّلت ماخوذ من السوال فالمعنی لم یدعنی الی ما فعلتہ احد غیری بل اتبعت ہوای فیہ[1]۔

کہ اس افسانہ کو اگر صحیح مانا جائے تو معجزات کا دروازہ مکمل بند ہو جاتا ہے۔

سامری کا یہ کہنا کہ وَکَذٰلِكَ سوّلت لی نفسی۔ ایسا ہی میرے جی میں آیا) اس کا یہ مطلب ہے کہ میرے نفس نے جو تحریک کی اسی پر میں کار بند ہوا۔ لفظ۔ سوّلت سوال سے ماخوذ ہے۔ اسی کے معنی یہ ہوئے کہ میں نے جو کچھ کیا ہے کسی دوسرے شخص نے مجھے اس جانب تحریک نہیں کی تھی بلکہ اس باب میں محض اپنی خواہش نفسانی کی میں نے پیروی کی[1]

―――――(۴)―――――

یہ سچ ہے کہ قوم سامرین کا زمانہ حضرت موسیٰؑ کے ہم عہد نہیں لیکن کیا ایک نام کا ایک ہی شخص ہوا کرتا ہے ؟ تورات میں سامر کا نام کئی جگہ آیا ہے[2]۔ ممکن ہے تغیّر لہجہ سے عبری کا سامر عربی میں سامری بن گیا ہو۔ لیکن اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ سامری قوم سامرہ ہی کا ایک فرد تھا جب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

سید احمد خان لکھتے ہیں۔

بنی اسرائیل کے بارہ سبط تھے اور سب ایک سلطنت کے ماتحت تھے۔ مگر جب رجعام بادشاہ ہوا تو بنی اسرائیل کے دس سبط نے اس سے بغاوت کی اور یار بعام پسر نباط کو اپنا بادشاہ بنایا۔ اس نے اپنے ملک میں بمقام بیت ایل اور دان کے سونے کے بچھڑے بنائے (دیکھو اول سلاطین باب ۱۲۔ آیت ۲۸ و ۲۹) اور

[1] تفسیر جلد ۱ صفحہ ۲۹۔

[2] اخبار الایام اول تاریخ ۱ باب ۵ آیت ۲۴ و باب ۱۵ آیت ۱۲۔

ان کی پرستش شروع کی جب کہ عمری ان لوگوں پر بادشاہ ہوا تو اس نے کوہ شومرون کو اس کے مالک سے جس کا نام شمر تھا خرید لیا۔ (سلاطین میں بجائے شمر کے سامر لکھا ہے) اور وہاں شہر بنایا جو دارالخلافہ ہو گیا دیکھو اول سلاطین باب ۱۶۔ آیت ۲۳ لغایتہ ۲۵) اور اسی سبب سے وہ لوگ سامرتن یا شامری یا سامری مشہور ہوئے۔ وہ قوم جس میں کے شخص نے بنی اسرائیل کے لئے بچھڑا بنایا تھا قرآن مجید کے بہت پہلے سے سامری کے نام سے کہلاتی تھی قرآن مجید میں السامری کہنے سے صرف یہ اشارہ ہے کہ اس کا بنانے والا اس قوم میں سے تھا جنہوں نے آخر کار یار بعام کی اطاعت کر کے سونے کے بچھڑوں کی پرستش کی تھی اور جو لوگ سامری یعنی سامرتن کے لقب سے مشہور ہیں[۵]۔

———(۵)———

اس واقعہ کے متعلق توراۃ کا بیان حسب ذیل ہے :۔

جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ پہاڑ سے اترنے میں دیر کرتا ہے تو وہ ہارون کے پاس جمع ہوئے اور اسے کہا کہ اٹھ ہمارے لئے معبود بنا کہ ہمارے آگے چلیں کیونکہ یہ مرد موسیٰ جو ہمیں مصر کے ملک سے نکال لایا ہم نہیں جانتے کہ اسے کیا ہوا۔ ہارون نے کہا کہ سونے کے زیور جو تمہاری بیویوں بیٹیوں اور بیٹوں کے کانوں میں ہیں اتار اتار کے میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ سب لوگ زیوروں کو جو ان کے پاس تھے اتار اتار کے ہارون کے پاس لائے۔ اس نے ان کو ہاتھوں سے لیا۔ اور ایک بچھڑا ڈھال کر اس کی صورت حکاکی کے اوزار سے درست کی۔ انہوں نے کہا کہ اے بنی اسرائیل یہ تمہارا معبود ہے جو تمہیں مصر سے نکال لایا جب ہارون نے یہ دیکھا تو اس کے آگے ایک قربانگاہ بنائی۔ ہارون نے یہ کہہ کر منادی کی کہ کل خداوند کے لئے عید ہے۔ وہ صبح کو اٹھے اور سوختنی قربانیاں چڑھائیں۔ سلامتی کی قربانیاں گزرانیں لوگ کھانے پینے کو بیٹھے اور کھیلنے کو اٹھے۔ تب خداوند نے موسیٰ کو کہا کہ اتر جا کیونکہ تیرے لوگ جنہیں تو مصر کے ملک سے چھڑا لایا خراب ہو گئے ہیں۔ وہ اس راہ سے جو میں نے انہیں فرمائی جلد پھر گئے ہیں انہوں نے اپنے لئے ڈھلا ہوا بچھڑا بنایا اسے پوجا اور اس کے لئے قربانی ذبح کر کے کہا اے اسرائیل یہ تمہارا معبود

ہے پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ میں اس قوم کو دیکھتا ہوں کہ ایک گردن کش قوم ہے اب تو مجھ کو چھوڑ کہ میرا غضب ان پر بھڑکے۔ اور میں ان کو بھسم کر دوں اور میں تجھ سے ایک بڑی قوم بناؤں گا موسیٰ نے اپنے خداوند کے آگے منت کر کے کہا کہ اے خداوند کیوں تیرا غضب اپنے لوگوں پر جنہیں تو شہزوری و زبردستی کے ساتھ ملک مصر سے نکال لایا بھڑکتا ہے..... تب خداوند اس بدی سے جو اس نے سوچا تھا۔ کہ اپنے لوگوں سے کرے پچھتایا۔ موسیٰ پھر کر پہاڑ سے اتر گیا۔ شہادت کی دونوں لوحیں اس کے ہاتھ میں تھیں۔ جو لکھا ہوا سو خدا کا لکھا ہوا اور ان پر کندہ کیا ہوا تھا۔ جب یشوع نے لوگوں کی آواز جو پکار رہے تھے۔ سنی تو موسیٰ سے کہا کہ لشکرگاہ میں لڑائی کی آواز ہے موسیٰ بولا۔ "یہ تو نہ فتح کے شور کی آواز نہ شکست کے شور کی آواز ہے بلکہ گانے کی آواز میں سنتا ہوں" جب وہ لشکرگاہ کے پاس آیا اور بچھڑا اور ناچ راگ دیکھا تب موسیٰ کا غضب بھڑکا اس نے لوحیں اپنے ہاتھوں سے پھینکدیں۔ پہاڑ کے نیچے توڑ ڈالیں۔ اس بچھڑے کو جسے انہوں نے بنایا تھا لیا۔ اس کو آگ سے جلایا۔ پیسکر خاک سا بنایا۔ اور اس کو پانی پر چھڑک کر بنی اسرائیل کو پلایا۔ موسیٰ نے ہارون سے کہا کہ ان لوگوں نے تجھ سے کیا کیا کہ تو ان پر ایسا بڑا گناہ لایا۔ ہارون نے کہا کہ میرے خداوند کا غضب نہ بھڑکے۔ تو اس قوم کو جانتا ہے کہ بدی کی طرف مائل ہے۔ سو انہوں نے مجھے کہا کہ ہمارے لئے ایک معبود بنا جو ہمارے آگے چلے کہ یہ مرد موسیٰ جو ہمیں مصر کے ملک سے چھڑا لایا ہم نہیں جانتے کہ اسے کیا ہوا تب میں نے انہیں کہا کہ جس کے پاس سونا ہو وہ اُتار لائے۔ انہوں نے مجھے دیا اور میں نے اُسے آگ میں ڈالا سو یہ بچھڑا نکلا جب موسیٰ نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ بے قید ہو گئے۔ کہ ہارون نے انہیں ان کے مخالفوں کے روبرو اُن کی رسوائی کے لئے بے قید کر دیا تھا۔ تب موسیٰ لشکرگاہ کے دروازے پر کھڑا ہوا اور کہا جو خداوند کی طرف ہو وہ میرے پاس آئے۔ تب سب بنی لاوی اس کے پاس جمع ہوئے۔ اس نے انہیں کہا کہ خداوند اسرائیل کے خدا نے فرمایا ہے کہ تم میں سے ہر مرد اپنی کمر پر تلوار باندھے۔ ایک دروازے سے دوسرے دروازے تک تمام لشکرگاہ میں گذرتے پھرو۔ ہر مرد تم میں سے اپنے بھائی کو اور ہر ایک آدمی اپنے دوست کو اور ہر ایک شخص

اپنے عزیز و قریب کو قتل کرے۔ بنی لاوی نے موسٰی کے کہنے کے موافق کیا۔ چنانچہ اس دن لوگوں میں سے قریب تین ہزار کے مارے پڑے ..... دوسرے دن صبح کو یوں ہوا کہ موسٰی نے لوگوں سے کہا کہ تم نے بڑا گناہ کیا۔ اب میں خداوند کے پاس اوپر جاتا ہوں۔ شاید میں تمہارے گناہ کا کفارہ کردوں۔ خداوند نے ان کے بچھڑے بنانے کے سبب سے جسے ہارون نے بنایا تھا۔ لوگوں پر طاعون بھیجا۔[لہ]

(۶)

تورات کا افسانہ اگر صحیح ہے تو اس کے لازمی نتائج یہ ہوں گے:۔

الف: بچھڑے کا بنانے والا سامری نہ تھا۔ خود حضرت ہارون اس کے بنانے والے تھے۔

(ب) ہارون کو خدا نے مقدس بنایا تھا۔ تقدس کا خلعت دیا تھا۔ روحانی نعمتیں عنایت کی تھیں نسلاً بعد نسل ان کے خاندان میں اس تقدس کو قائم رکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ حضرت موسٰی کو ان کے (یعنی ہارون کے) اور ان کی اولاد کے متعلق بہت سی وصیتیں کی تھیں[لہ]۔ بایں ہمہ نہ تو ہارون نے خدا کی رحمتوں کا خیال کیا اور نہ اپنے فرائض پر نظر کی۔ حضرت موسیٰ نے انہیں اپنا قائم مقام مقرر کیا تھا۔ مگر بجائے اس کے کہ وہ عوام کو گمراہی سے بچاتے خود ہی اس کی بنیاد قائم کر دی۔

(ج) لازم تو یہ تھا کہ بنی اسرائیل پر خدا نے جس قدر عذاب نازل کیا تھا اس سے بہت زیادہ عذاب ہارون پر نازل ہوتا۔ اس لئے کہ یہی حضرت اس گمراہی کے بانی تھے۔ لیکن بیچارے عامیوں سے تو اتنا سخت بدلا لیا گیا کہ سب لوگ اپنے عزیز ترین دوستوں اور رشتہ داروں کو قتل کرنے اور کٹ

لہ خروج باب ۳۲۔ آیت اوّل لغایۃ ۳۵!

لہ خروج باب ۲۸۔ از اوّل تا آخر۔

مرنے پر مجبور کئے گئے مگر ہارونؑ کا بال تک بیکا نہ ہوا اور مواخذہ تو درکنار خدا کی جانب سے انہیں تنبیہ بھی نہیں کی گئی؛

(ح) تورات کے بیانات قابل تسلیم نہیں ہیں اس لئے کہ جا بجا ہارونؑ کی عظمت بھی بیان کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ عظمت ہارون کے خاندان میں قائم رہے گی۔ اور پھر یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ خدائے اسرائیل نے بنی اسرائیل کی ہدایت واصلاح کے متعلق ان پر جو اعتماد کیا تھا وہ حق بجانب نہ تھا۔ کیونکہ ایک وقت میں انہوں نے حد درجہ کی شرک و گمراہی میں حصہ لیا تھا۔ خود بھی گمراہ ہوئے تھے۔ اور تمام قوم کو بھی ضلالت میں پھنسایا تھا۔

یہ وہ نتائج ہیں جن سے ممکن ہے کہ سرسری نظر والی خوش اعتقاد طبیعتوں میں کوئی تذبذب نہ پیدا ہو لیکن حقیقت شناسی کا وجود اگر دنیا میں باقی ہے تو ہارونؑ کی عزت۔ توراۃ کی سچائی خدا کی خدائی۔ ان سب میں کوئی چیز بھی الزام سے بری نہیں ہو سکتی۔ اس حالت میں دو ہی صورتیں تھیں۔

(الف) توراۃ کو سچ مانتے ہیں تو خدائے بنی اسرائیل کی کبریائی اور ہارونؑ کی عزت میں فرق آتا ہے۔

(ب) خدا کی کبریائی اور ہارون کی عزت پر نظر پڑتی ہے تو توراۃ کا بیان غلط معلوم ہوتا ہے

اسلام کا دعویٰ یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں جو اختلافات پیدا ہو گئے ہیں ان میں اکثر کا فیصلہ قرآن کریم سے ہو جاتا ہے۔ سورۂ نمل میں نہایت بلند آواز سے اس دعویٰ کی منادی کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

إِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۤءِيْلَ	بیشک یہ قرآن بنی اسرائیل کی اکثر باتوں کی حقیقت
اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ۔ وَاِنَّهٗ	واقعی کو جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ ان پر ظاہر کرتا

هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ - اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِىْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ - (جزء ۲۰ سورہ ۲۷ - آیت ۷)

ہے اور بے شک یہ (قرآن) ایمان والوں کے حق میں سراسر ہدایت و رحمت ہے۔ (اے پیغمبر) کچھ شک نہیں کہ تمہارا پروردگار (قرآن کو نازل کرکے اپنے حکم سے ان کے آپس کے اختلافات) کا فیصلہ فرماتا ہے۔ اور وہ زبردست اور سب کچھ جانتا ہے۔

یہ دعویٰ تھا اور اس کی دلیل یہی گوسالہ سامری کا واقعہ ہے، قرآن کریم نے صاف بتا دیا کہ موجودہ تورات میں یہودیوں نے اس واقعہ کو غلط پیرایہ میں درج کر دیا ہے ہارونؑ جیسے عظمت و شان کے بزرگ کا یہ شیوہ نہ تھا کہ وہ گوسالہ بنا کر پوجتے۔ اور خلق کو گمراہ کرتے یہ تو سامری کا کام تھا۔

(۷)

تورات کی اصلاح و تصحیح کرنے والوں کو ہارون کے متعلق غلط فہمی پیدا ہونے کے غالباً دو سبب ہوئے ہوں گے :-

(الف) کہ وہ طور پر جاتے وقت حضرت موسیٰ اپنے بھائی ہارون کو بنی اسرائیل کا محافظ مقرر کر گئے تھے محافظ کے لئے عبرانی زبان میں سامر یا شامر کا لفظ استعمال ہوا کرتا ہے مصلحین و مترجمین تورات نے جب "سامری" کا قصہ پڑھا ہوگا تو وہ سمجھے ہوں گے کہ یہ کسی شخص کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اس سے وہ شخص مراد ہے جو بنی اسرائیل کا محافظ تھا۔ اور ظاہر ہے کہ محافظت کی خدمت ہارونؑ ہی کو تفویض ہوئی تھی،

(ب) حضرت موسیٰ جب کوہ طور سے واپس آئے تو انہوں نے ہارونؑ کو بڑی سختی سے ملامت کی کہ تم نے اپنے فرض میں کس لئے کوتاہی جائز رکھی اور لوگوں کو گمراہ ہونے دیا ظاہر ہے کہ یہ ملامت صرف ان کے فرائض محافظت پر مبنی تھی اسی طرح جیسے کہ سرکار عالی کی جانب سے عوام کی بدعنوانیوں کی پرسش قوم کے سرگروہوں سے کی جاتی ہے لیکن یہودی مصححین یہ دیکھ کر کہ تورات میں حضرت موسیٰ کا لہجہ ہارون کی نسبت نہایت سخت اور ملامت آمیز ہے یہ سمجھے کہ ہارونؑ ہی نے وہ بچھڑا بنایا تھا۔"

یہ روداد ہے ان واقعات کی جن میں کئی ہزار برس سے اختلاف چلا آتا ہے۔ ناظرین کو اختیار ہے کہ قرآن کریم کے فیصلہ کو سچ مانیں یا توراۃ کی غلطیوں پر جمے رہیں لہ

(۸)

سامری کو حضرت موسیٰؑ نے جن الفاظ میں بد دعا دی تھی وہ یہ تھے۔

فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيَاةِ أَن تَقُولَ لَا مِسَاسَ۔ چل دور ہو اس زندگی میں تیری یہ سزا ہے کہ زندگی بھر) کہتا پھرے کہ دیکھو مجھے کوئی) چھو نہ جانا ورنہ ہم دونوں کو تپ آجائے گی)۔

یہ ترجمہ مفسرین کی عام روایت کے مطابق ہے اور لامساس کے لفظ نے اس کی بنیاد ڈالی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ لامساس کے معنی ملنے جلنے سے ممانعت کے ہیں۔ سامری کی ضلالت دیکھ کر حضرت موسیٰ نے اس کو منع کر دیا تھا کہ خبردار! اب زندگی بھر کسی سے نہ ملنا جلنا سلہ کیونکہ ظاہر ہے کہ گمراہی کا مرض اسی صورت میں متعدی ہوا کرتا ہے۔ تپ کے آنے نہ آنے سے نہ اس کو کوئی تعلق ہے نہ قرآن کریم اس قصہ کا موید ہے۔ اور نہ صحیح تاریخی روائتیں اس کی حامی ہیں۔ ذَٰلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ۔

سلہ۔ تفسیر کبیر۔ جلد ۶ صفحہ ۶۹ (درجہ ثانی)

کلام القرآن

(از مولانا الحاج ابوالخیر محمد خیر اللہ صاحب سنوسی القادری ورنگل)

قرآن کریم کو بہر نوع مسلمانوں کے دلوں میں اتار دینا جب ہمارا مقصود ہے تو اپنے اردو لٹریچر سے بھی اس سلسلہ میں کام لینا ضروری ہے لٹریچر کو دل و دماغ کی تربیت اور جذبات کی آفرینش میں جو خصوصیت حاصل ہے وہ محتاج تصریح نہیں۔ آج اردو تحریرات اور بول چال میں کتنے انگریزی الفاظ ہیں جو دخیل ہو کر اپنی قوت نفوذ سے نہ صرف انگریزی دان بلکہ عام جہلا کی زبانوں پر بھی چڑھ گئے ہیں ان جاہل زبانوں سے ان کا استعمال یہ بتاتا ہے کہ وہ ان کے معنی و مطلب کو سمجھ کر ہی موزون و مناسب مواقع پر ان کو برت رہے ہیں حالانکہ انگریزی کی ہوا بھی ان کو نہیں لگی۔ غرض کہ زبان کے الفاظ کا زبان زد عوام ہو جانا بھی ناواقفوں کو اس کے معنی و مطلب سے خواہ مخواہ واقف بنا دیتا ہے۔

اس لحاظ سے میری رائے یہ ہے کہ قرآن مجید کے بعض مرکب الفاظ اور چھوٹے چھوٹے فقروں کو ہم اُردو میں استعمال کرنا شروع کر دیں اور روزمرہ کی موزونیت و مناسبت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسے فقرے کلام پاک سے چن کر "پیغام حق" میں شائع کرتے رہیں۔ اس طریقہ کو سلف نے بھی اپنی فارسی تحریرات و تصنیفات میں ملحوظ رکھا ہے۔ آج بھی کلام پاک کے بعض فقرے جو اردو میں مستعمل ہو گئے ہیں یہ انہیں کا فیضان ہے۔

مولانا ابوالکلام نے بھی الہلال و البلاغ میں اس موزون مقصد اشاعت قرآن کو نہایت تزک و احتشام و شاندار اہتمام کے ساتھ جاری رکھا تھا جس سے اُردو کا اثر و نفوذ بھی اپنے دم خم دکھانے لگا اور شوکت کلام نے مولانا کو سارے ہندوستان میں فی الواقع اسم با مسمیٰ تسلیم کرا دیا۔ غرض ہماری

اس سعی عمل سے قرآن اور اُردو دونوں کی خدمت ہو جائے گی اسی فکر و تردد میں خیال کا اس طرف منتقل ہو جانا تھا کہ آج صبح کی تلاوت میں میں نے مختلف مقامات سے بعض ایسے الفاظ اور فقروں کو منتخب کر لیا ہے اور ناظرین "پیغام حق" کے ملاحظہ میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں سامع ذوق سخن سے وہ لوگ بہت زیادہ محفوظ ہوں گے جنہوں نے اہل حرمین شریفین کو اپنی گفتگو و محاورہ میں اس طرح سے قرآن پاک کو استعمال کرتے دیکھا اور سنا ہے۔

بازار مکہ میں ایک عرب سائل نے کچھ مانگا، اس کو جو کچھ اُس وقت دیا جا سکتا تھا دیا گیا۔ مگر اس نے کچھ زیادہ حاصل کرنا چاہا اور کہا اُدْخُلْ یَدَكَ فِی جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَاءَ یعنی جیب (گریبان نہیں کیسہ) میں ہاتھ ڈالو تو سفید (روپے) نکل آئیں گے۔ میں نے بھی قرآن حکیم ہی سے فوراً جو اس وقت یاد آگیا یہ جواب دیا۔ خُذْ مَا اٰتَیْتُكَ وَكُنْ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ لے کو جو کچھ دیا گیا ہے اور خدا کا شکر ادا کرو۔ اس سے وہ بہت محفوظ ہو کر میرا پتہ پوچھتا ہوا روانہ ہو گیا۔ (یہ دونوں فقرے موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں مذکور ہیں)، ایک روایت جناب رابعہ بصریہؒ کے کلام القرآن کی نسبت بھی اسی طرح مشہور ہے۔

۱۔ اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰی	کہیں انسان کو من مانی مراد بھی ملی ہے۔
۲۔ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ	یہ لوگ تو بس گمان پر چلتے ہیں۔
۳۔ اِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ	وہ تو نری اٹکلیں دوڑاتے ہیں۔
۴۔ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ	کیا تم بہروں کو سنا سکتے ہو۔
۵۔ مَا لَكُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ	تم کو کچھ اس کا علم نہیں ہے
۶۔ زُیِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ	اُس کو اپنے بُرے کام اچھے معلوم ہونے لگے ہیں۔
۷۔ یَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ	جانوروں کی طرح یہ بھی کھاتے پیتے ہیں۔

۸۔ تَعْسًا لَّهُمْ	ان کا برا ہو (ان کا ستیاناس ہو)
۹۔ مَاذَا قَالَ آنِفًا	اس نے ابھی ابھی کیا کہا۔
۱۰۔ آتِنَا غَدَاءَنَا	ہمارا ناشتہ لاؤ۔
۱۱۔ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ	ایسے ہی تو ہم چاہتے ہیں۔
۱۲۔ لَا رَيْبَ فِيهِ	اس میں کوئی شک نہیں ہے۔
۱۳۔ شَيْءٌ عُجَابٌ۔	بڑی عجیب بات ہے۔
۱۴۔ شَيْءٌ يُّرَادُ	غرض و مطلب کی بات ہے۔
۱۵۔ إِنْ هٰذَا إِلَّا اخْتِلَاقٌ۔	یہ تو ان کی من گھڑت ہے۔
۱۶۔ عَزَّنِي فِي الْخِطَابِ۔	مجھ کو اس نے باتوں میں دبا لیا۔
۱۷۔ حَسْبِيَ اللّٰهُ	میرے لئے خدا کافی ہے۔
۱۸۔ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ	میں نے خدا پر بھروسہ کر لیا ہے۔
۱۹۔ فَأَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ۔	وہ اپنے دونوں ہاتھ ملتا رہ گیا۔
۲۰۔ تَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُودٌ	تم سمجھتے ہو کہ وہ جاگ رہے ہیں حالانکہ وہ سو رہے ہیں۔
۲۱۔ لَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ	تم ان کو ان کے طرز کلام سے ضرور پہچان لوگے۔
۲۲۔ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ	ان کو تو تم ان کی صورت ہی سے پہچان لوگے
۲۳۔ أَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ	کیا خدا اپنے بندے کے لئے کافی نہیں ہے؟
۲۴۔ أُفَوِّضُ أَمْرِي إِلَى اللّٰهِ۔	میں اپنے معاملہ کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔
۲۵۔ بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ۔	صبح اور شام۔